رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

۹۴

جولائی سنہ ۱۹۶۲ء

مدیر

محمد طفیل

سالانہ چندہ بیس روپے
بیرونِ ملک پچیس روپے

قیمت
تین روپے

ادارہ فروغِ اردو ○ لاہور

ترتیب

مضامین

نظمیں، غزلیں

---

[1] ابھی لاہور پر اور بھی قابلِ قدر مضامین پیش کیے جائیں گے — ہر شمارہ میں کم از کم ایک مضمون!

افسانے

ادارۂ نقوش پرچے کو مزید خوبصورت اور مزید معیاری بنانے کی تگ و دو میں ہے ـــــ ممکن ہے آیندہ شمارہ ہی سے ہم اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جائیں ـــــ آرائش کیلیے ہماری آٹومیٹک اور آفسٹ مشینیں ساتھ دیں گی ـــــ اور اس کے معیار میں مزید نکھار کے لیے پاک و ہند کے نامور ادیب حصہ لیں گے۔

(ادارہ)

محمد طفیل پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

طلوع

دو چار شعر سنیئے گا؟ ـــــ مگر ذرا ٹھہریے۔ پہلے یہ "سماں" تو باندھ لوں۔

ایسے بھی ادیب گزرے، جو اچھے شعروں کو، اپنی نثر میں سجا لینے کے لیے ہی نثر لکھا کرتے تھے۔ ان کا یہ حربہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج کچھ کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ جب کہ اسی شمارہ کے چند اچھے شعروں کی خاطر یہ صفحہ کالا کروں گا۔ شعر کہنا اور شعروں کو اظہار کا ذریعہ بنانا، دونوں باتیں معصوم سہی، مگر غیر صحت مندانہ نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب شاعری صرف ذہنی تعیش ہی کا سامان تھی۔ مگر وہ دور گزر چکا۔ آج تو شعر تلوار کا کام دیتے ہیں۔

حق بات کہوں گا مگر اے جرأتِ اظہار

جو بات نہ کہنی ہو وہی بات نہ کہہ دوں

یہ شمارہ آزاد فضا میں پیدا ہو رہا ہے۔ مارشل لا جو ختم ہوا۔ گو مارشل لا نے ادیبوں اور ادب پر بظاہر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ مگر ہم لوگ سہمے ہوئے ضرور تھے۔ ڈرتے تھے کہ اگر ہمارے قلم سے کوئی نادانستہ بھی ایسی بات نکل گئی جو سرکار کو پسند نہ آئی تو کیا ہوگا؟ ایک بھیانک نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ دیکھا جائے تو (بعض حیثیتوں میں) ملک اور ادیبوں کو جتنا فائدہ اس مارشل لا نے پہنچایا۔ اس سے پہلے کے "جمہوری" دیوتاؤں نے نہیں پہنچایا تھا۔ مگر مارشل لا، مارشل لا ہی ہے ـــــ ایک خطرناک کھیل ـــــ عوام کے لیے بھی، سربراہوں کے لیے بھی!

اک چال وہی لیکن اس کے بازیٔ جہاں میں نام ہیں دو

ہارے تو بغاوت کہلاتی ہے، جیتے تو ثبوت ہوتی ہے

ادیب اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتے کہ اچھا ہوا تھا کہ برا، بہر حال موجودہ فضا ادب کے لیے پہلے سے زیادہ سازگار ہے۔ ہم لوگ اب آزادی سے سوچ سکتے ہیں۔ آزادی سے لکھ سکتے ہیں۔ گو پہلے بھی ہماری گردنوں پر کوئی تلوار نہیں لٹک رہی تھی۔ مگر ہمیں اس کا احساس تو تھا کہ تلوار کا وجود ہے۔ احساس ہی تو ادیب کی کل کائنات ہوتی ہے۔ سرمایۂ فن بھی سرمایۂ حیات بھی، بہر حال وہ دور خوش اسلوبی سے گزر گیا۔ جس کا آج ماتم فضول ہوگا۔ جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب ؎

ہاں آنکھ نہ جھپکے کہ ہے بہزاد کی زد پر

یہ کارگہِ شیشہ گراں، جاگتے رہنا

ادیب بھوکا پیاسا جیتا چلا آیا ہے۔ وہ اب بھی جی لے گا۔ مگر وہ آزادیٔ رائے کو اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ یہ حاصل نہیں تو جیتے جی مرتا رہے گا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے قلم پہ پہرے بٹھائے جائیں۔ خواہ وہ دور کوئی بھی ہو۔ جمہوری شاطروں کا ہو یا صدارتی ناخداؤں کا، ہماری تو سرشت یہ ہے۔

ہم نے خود اپنے آپ زمانے کی سیر کی

ہم نے قبول کی نہ کسی رہنما کی شرط

یہ صفحہ میں نے صرف شعروں کی خاطر ہی کالا کیا ہے۔ ورنہ آپ کو تو علم ہے کہ میں مصرع طرح کا قائل ہی نہیں۔

محمد طفیل

عبدالماجد دریابادی

"تیری چتون کے شہیدوں میں یہ ناشاد بھی ہے"

طفیل صاحب! آپ کو اندازہ نہیں، کہ ایک معصوم سا عنوان "لاہور" دے کر آپ نے ایک دُور افتادہ کے دل میں کتنی حسرتوں کو زندہ، اور دماغ میں کتنی پژمردہ یادوں کو تازہ کر دیا! ——— کیا حرج تھا اگر آپ یہ فرمائش نہ کرتے ؎

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا رہگزر یاد آیا!

موجودہ مسیحی صدی کا بالکل ابتدائی زمانہ ہے۔ سنہ کوئی ۱۹۰۱ ہوگا۔ اودھ کے ایک قصبہ کا چھوٹا سا لڑکا، کوئی ۸، ۹ سال کے سن کا، اودھ ہی کے ایک دوسرے ضلع (سیتاپور) میں اپنے سے ایک بہت بڑے، اور پڑھے لکھے چچازاد بھائی عبدالحلیم اثر دریابادی کے پاس بیٹھا ہوا، ان کے ہاتھ میں ایک انگریزی اخبار دیکھتا ہے۔ نام پنجاب آبزرور[1]۔ اثر مرحوم بتاتے ہیں کہ یہ پنجاب کے شہر لاہور سے نکلتا ہے۔ اس کے مالک ہیں خواجہ احمد شاہ اور اس کو نکالتے ہیں شیخ عبدالقادر۔ بچپن کا سن۔ دل پر شیخ صاحب کی قابلیت اور لاہور کی اہمیت دونوں کا سکہ دل پر بیٹھ گیا ——— اپنی یاد میں لاہور کا سب سے پہلا تعارف یوں ہوا۔ پھر اپنے انھیں بھائی کی زبان سے سرسیّد کا چلایا ہوا لفظ "زندہ دلان پنجاب" سُنا اور اس کے ضمن میں نام سردار محمد حیات اور برکت علی خان وغیرہ کے، کان میں پڑے۔ اور پنجاب، خصوصاً لاہور کی جگہ دل میں اور گہری ہوتی گئی۔

کچھ روز اور گزرے۔ اور اب چرچے انجمن حمایت اسلام، لاہور، اور اس کے سالانہ جلسوں کے سننے میں آنے لگے۔ پیسہ اخبار ہفتہ وار کی شہرت بھی اسی زمانے میں کان میں پڑی۔ اور اس کے دو ایک پرچے بھی بڑے شوق سے پڑھے۔ اُس کے لطیفوں اور دلچسپ معلومات والے کالم اب تک دُھندلے سے یاد ہیں اور ایک کالم شاید سوال و جواب کا بھی ہوتا تھا۔ اُس وقت کوئی مجھ سے پوچھتا، تو لاہور میرے ذہن میں عبارت بس ان تین چیزوں سے تھا۔ شیخ عبدالقادر، پیسہ اخبار اور

---

[1] آگے چل کر اس کا نام محض "آبزرور" ہو گیا تھا۔

انجمن حمایت اسلام - اور لاہور سے متعلق ایک عام تاثر قلب و ذہن میں یہ تھا کہ یہاں والے بڑے فعال و کارگزار ہوتے ہیں، اور دین و ملت کے باب میں بڑے جوشیلے ۔۔۔ محرم علی چشتی کا نام بھی اسی دور میں سُننا یاد پڑتا ہے، غالباً رفیق ہند کے ایڈیٹر کی حیثیت سے۔ دفتر پیسہ اخبار کے انتخاب لاجواب کی یاد کی بھی عمر یہی ہے۔

سن دو ایک سال اور بڑھا، اور میں چھٹے درجہ میں تھا، کہ پنجاب کے ایک مسلمان گریجویٹ کے مُرتد ہو جانے اور عبدالغفور سے دھرم پال بن جانے کا شور مچا - اور سیتا پور ہائی اسکول میں ایک آریہ سماجی ہم سبق کے پاس ایک بڑی بیہودہ تکلیف دہ کتاب "ترک اسلام" نظر پڑ گئی جس میں قرآن مجید سے متعلق پوری بدزبانی موجود تھی - اسکول سے واپسی میں غصہ سے بھرا ہوا سیدھا اپنے انھیں بھائی صاحب کے پاس گیا، انھوں نے قصہ سُن سُنا، تسلی دی، کہ انشاءاللہ پنجاب سے اس کا جواب ضرور نکلے گا ——— گویا پنجاب اس وقت اسلامی ہند کا میگزین یا اسلحہ خانہ تھا اور لاہور سارے پنجاب کا نمائندہ تھا ——— تسلی ٹھیک نکلی - تھوڑے ہی دن میں جواب اور بہترین جواب "ترک اسلام" کے نام سے امرتسر کے مولانا ثناءاللہ کے قلم سے نکلا، اور پھر ایک جواب "برق اسلام" مولوی کریم بخش سیالکوٹی کے قلم سے اور ایک اور جواب حکیم نورالدین احمدی کے قلم سے اور دو ایک جواب اور بھی - اب نام تو سب کے یاد نہیں - اتنا یاد ہے کہ لاہور اور اس کے قریب قریب کے شہروں کا نام بار بار اس سلسلے میں سننے میں آتا رہا - وہ بھائی صاحب تو اُسی زمانے میں اللہ کو پیارے ہو گئے - لیکن ان کا بٹھایا ہوا نقش لاہور اور لاہوریوں سے عقیدت، محبت و عظمت کا دل میں برابر قائم رہا۔

ابھی کم سن تھا - لیکن کم سنی کے باوجود اُردو اخباروں کا چسکا پڑ گیا تھا - "پیسہ اخبار" اور "انتخاب لاجواب" سے دلچسپی قائم تھی - لیکن اب اس سے بھی بڑھ کر کشش مولوی انشاءاللہ خاں کے اخبار "وطن" سے پیدا ہو گئی - یہ بھی لاہور ہی سے نکلتا تھا اور وقت کے خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان ثانی کا خاص مدح خواں و نقیب تھا، اور مسلمان اس وقت تک اپنے خلیفہ کے نام پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے - (اور آہ ! اب کیونکر بتایا جائے کہ "اتاترک" دور سے پہلے خلیفہ کے کیا معنی اُمت کے دل میں تھے) - حجاز ریلوے کا چرچا نیا نیا شروع ہوا تھا، اور وطن اسے خوب پھیلا رہا تھا - اخبار عام، ہندوستان، دیش، لاہور کے یہ پرچے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے، اور اُن کے شہرے بھی لکھنؤ و نواح لکھنؤ تک پہنچ چکے تھے - جاسوسی ناول بھی لاہور تابڑ توڑ شائع کر رہا تھا خفیہ پولس کے کارنامے لڑکپن کے اس سن میں بڑا مزہ دیتے - اور عالم خیال میں اپنے ہی کو انسپکٹر فلاں اور سپرنٹنڈنٹ فلاں سمجھ لینے کا جی چاہنے لگتا ——— لاہور ہی کے ایک طبیب زبدۃ الحکماء حکیم فلانی نے اشتہاری علاج میں خوب نام پیدا کیا تھا - ان کے طبی رسالے، کتابچے وغیرہ خوب دیکھنے میں آئے، گو ہوتے وہ زیادہ تر عشقی و شہوانی موضوعوں ہی سے متعلق - تاہم عموماً اصلاحی ہی ہوتے - اخلاق کو بگاڑنے والے نہیں، سنوارنے والے - مغویانہ نہیں مصلحانہ ——— "مخزن" کی چاٹ بھی اسی زمانے میں پڑ گئی، اور شیخ عبدالقادر کی جو عظمت "پنجاب آبزرور" کے وقت سے قائم ہو گئی تھی، وہ اب کئی درجہ اور بڑھ گئی اور صرف عظمت ہی نہیں، محبت بھی۔

دو چار سال اور گزرے، اب میں لکھنؤ میں کالج کا طالب علم ہوں - سنہ بھی کوئی ۹ یا ۱۰ سمجھیے - لاہوریوں میں اقبال "

ظفر علی خاں کے ناموں سے کان آشنا ہو چکے ہیں۔ خود اس وقت ریشنلزم (عقلیت) یا الحاد کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ اس لیے اقبال کی اسلامی نظمیں کچھ دل پر نہیں بیٹھتیں، اور ان کی طرف سے کچھ اُکھڑا اُکھڑا ہی رہا۔ لکھنؤ اور اس کے اودھ پنچی اسکول کے اثر سے زبان بھی اقبال کی سیٹھی پھیکی ہی معلوم ہوتی رہی۔ ظفر علی خاں کے جوش عمل اور نثر میں ان کی قادر الکلامی کا البتہ قائل ہو گیا۔ ان کی ترجمہ کی ہوئی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" شوق سے پڑھ چکا تھا، اور ان کے "دکن ریویو" کا شہرہ بھی کان میں پڑ چکا تھا۔— ۱۱ء میں اُردو پر کوئی خاص افتاد ہمارے صوبہ میں پڑی (تفصیل اب حافظہ میں نہیں) معاً وہ اپنے حبیب مجسم سید محفوظ علی بدایونی (علیگ)، کو ساتھ لیے لکھنؤ میں کام کرنے اور اس وقتی فتنہ کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کو وارد ہو گئے۔ احترام عقیدت کے جذبہ کے ساتھ بڑھ کر اُن سے ملا، اور لوگوں سے کہتا پھرا کہ "ہم لوگ تو محض باتیں بنانا جانتے ہیں، کام کرنا کوئی پنجاب سے سیکھے"۔ اور پنجاب سے مُراد ایسے سیاق میں 'لاہور' ہی سے ہوتی تھی۔

تحریک خلافت تو برسوں بعد کو شروع ہوئی، اس وقت مسلمانوں میں غلغلہ تحریک مسلم یونیورسٹی کا برپا تھا۔ اس کا وفد ہز ہائنس آغا خان کی قیادت میں جب لاہور پہنچا، تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور بڑے جوش و خروش سے اس کی پذیرائی ہوئی۔ اخباروں میں یہ خبریں پڑھ پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا اور لاہوریوں کو ہر ہر قدم پر آفریں کہنے کو جی چاہتا تھا۔ مولانا محمد علیؒ کے انگریزی ہفتہ دار "کامریڈ" کے واسطہ سے واقفیت اب میاں (سر) محمد شفیع اور جسٹس شاہ دین وغیرہ سے بھی ہو گئی تھی۔ "پیسہ اخبار" اب روزنامہ بن چکا تھا کہ اس کی اور "زمیندار" کی جنگ چھڑ گئی۔ پبلک کو سیر کے لیے تو بس جنگ چاہیئے، اب چاہے وہ تیغ و تفنگ کی ہو، اس قوم سے اُس قوم کی۔ اور چاہے محض زبان و قلم سے ہو، اس لیڈر کی اُس لیڈر سے، یا اس اخبار کی اُس اخبار سے۔ جس میں سر و گردن کٹنے کٹانے کے بجائے، یہ اُس کی پگڑی اچھالے، اور وہ اِس کی عزت کا خون خرابہ کر ڈالے۔ لاہوری اُستادوں کے اکھاڑے کے داؤ پیچ کی داد دینے میں اور چت ہونے ہوئے پٹھے پر تالی پیٹ دینے میں ہمارے لکھنؤ کا قدم بھی کسی سے کیوں پیچھے رہنے لگا تھا——— دسمبر ۱۹۱۲ء کا اخیر ہفتہ تھا، کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کمیٹی کا بھی ایک پُر زور اور پُر زور سے بھی بڑھ کر پُر شور جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اور اس میں پنجاب کے نمائندے کئی ایک آئے۔ اقبال کی زیارت سب سے پہلی بار اسی میں ہوئی۔ خاموش الگ تھلگ بیٹھے ہوئے تھے، گویا اپنے ہی شعر کے عملی پیکر ؎

ہے رسم عاشقی میں الگ سب سے بیٹھنا
بُت خانہ بھی حرم بھی کلیسا بھی چھوڑ دے

لکھنؤ اس وقت 'اقبال' و ادبار کے لفظی و شعری چکر میں پڑا ہوا تھا۔ کاہے کو جا کر اس روٹھے ہوئے مہمان کو مناتا۔ پنجابیوں میں جوان رعنا احسان الحق کی شکل اب تک نظر کے سامنے پھر رہی ہے۔ اس وقت سیشن جج نہیں ہوئے تھے، محض بیرسٹر تھے، اور چھوٹے موٹے لیڈر بھی——— مارچ ۱۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ لکھنؤ میں ہوا، سر محمد شفیع اس کے صدر کی حیثیت سے آئے۔ جلسہ میں انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر ایک بار ایک لمبے سفر میں بریلی سے شملہ تک ساتھ رئیس لاہور فتح علی خاں قزلباش کا رہا——— ابھی تک لاہور و پنجاب سے جتنے سابقے اس قسم کے ہوتے رہے، عموماً خوشگوار ہی رہے۔

"آقائے اُردو" محمد حسین آزاد کی عظمت کا شروع ہی سے دل قائل تھا۔ مولانا شبلی کی زبان سے، ان کی مدح و تحسین

سن کر عقیدت اور بھی جم گئی تھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں ان کی وفات لاہور ہی میں ہوئی۔ گویا اُردو کے اُستادوں کے استاد کو مٹی لاہور کی نصیب ہوئی۔ آزاد کی عظمت کا اعتراف، بالواسطہ لاہور کی عظمت کا اعتراف تھا۔ مولوی ظفر علی خان کے پنجاب ریویو نے بھی اسی زمانہ میں جلوہ دکھایا، اور سنجیدہ رسالوی ادب میں خوب زور باندھا۔ "زمیندار" کے جوڑ پر مولانا عبداللہ عمادی کا روزنامہ "کسان" بھی غالباً اسی کے کچھ بعد برآمد ہوا۔ اور کچھ دن دونوں میں خوب دو دو چونچیں رہیں! انگریزی اخباروں میں پنشلسٹ ٹریبیون اور نیم سرکاری "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کی دھاک دل پر بیٹھی رہی، گو باقاعدہ خریدار ان پرچوں کا کبھی نہ رہا۔ ظفر علی خان کے صاحبزادہ بلند اختر، اختر علی خان سے ملاقات ایک بار لکھنؤ میں ۱۹۳۰ء میں ہو چکی تھی، کسی چندے کے سلسلے میں آئے تھے، دوبارہ ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ وہاں اب میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سررشتہ تالیف و ترجمہ میں شامل تھا، مولوی ظفر علی خان اب غالباً "ستارہ صبح" نکال رہے تھے، کہ ۱۹۱۸ء میں وہ بھی اسی سررشتہ میں وہاں آگئے۔ اور ان سے خوب گاڑھی چھنی، گو وہ مرحوم سن میں مجھ سے بہت بڑے تھے، اور جو بے تکلفی ہم سنی کی بنا پر ہو جاتی ہے، اس کا کوئی ٹنک نہ تھا —— اسی سررشتہ میں دونوں ساتھ قاضی محمد حسین لاہوری کا رہا۔ شرافت کے پتلے نظر آئے۔ ریاضیات کے ماہر تھے، اور کیمبرج کے سینئر رینگلر۔

برسوں بعد طبیعت نے پلٹا کھایا۔ اور الحاد و ارتداد سے بازگشت پر اسلام کی دولت از سرِ نو نصیب ہوئی۔ اب دل اقبال کی طرف از خود کھنچا۔ اور جس سحر آگیں کشش و تاثیر کے نمونے عارف رومیؒ کی مثنوی میں ملے تھے، اس کی کچھ جھلکیاں اقبال کے ہاں بھی نظر آنے لگیں۔ ان سے مراسلت بھی شروع ہو گئی۔ اور "جواب شکوہ"، "اسرار خودی"، "رموز بیخودی"، "ضرب کلیم" "جاوید نامہ"، "بال جبریل" وغیرہ کی نظموں نے بار بار رُلایا، اور کبھی ان پر وجد و حال آ آ کر رہا —— علامہ سے شخصی نیاز بھی اس کے کئی سال بعد، شروع ۱۹۲۹ء میں، حیدرآباد میں دو تین بار حاصل ہوا، لیکن جو دلکشی اور جاذبیت ان کی اُردو فارسی نظم میں پائی وہ نہ ان کی اُردو و انگریزی نثر میں مل سکی، اور نہ ان کی شخصیت میں۔ یہ قصور یقیناً اپنی فہم اور اپنے ظرف ہی کا ہوگا۔ لیکن بہرحال ان کے کلام سے تو درجہ عشق کا پیدا ہو گیا، اور وہ بحمداللہ آج تک قائم ہے۔ اور جس نسبت سے ان کی محبوبیت بڑھی، ان کا شہر (لاہور) بھی اپنی نظر میں عزیز تر و محبوب تر ٹھہرتا گیا۔ ع

اے خنک شہرے کہ آنجا دلبرست!

اسی دور میں جامعہ اسلامیہ والے، خواجہ عبدالحیٔ فاروقی اور نذیر نیازی سے ربط رہا۔ اور دونوں کو اپنے اپنے رنگ میں خدمت اسلام میں پختہ پایا۔ یہ دونوں لاہور میں اصلاً ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن عملاً تو بہرحال تھے۔

بات میں بات جس طرح نکلتی آتی ہے، اسی طرح رہ رہ بھی جاتی ہے، ابھی میں دَورِ بے دینی سے پوری طرح نکلنے نہ پایا تھا، یعنی دل اگرچہ فرنگی عقلیت، مادیت، لاادریت سے سیر ہو چکا تھا اور ہندو روحانیت و فلسفہ میں اٹکا ہوا تھا، پھر بھی اسلام کی منزل ابھی دور ہی تھی۔ سنہ غالباً ۲۰ء تھا کہ امیر جماعت احمدیہ لاہور، مولوی محمد علی ایم۔ اے کا انگریزی ترجمۂ قرآن، تفسیری حاشیوں سے لیس، ایک عزیز کے ہاں نظر سے گزرا، اور اس کا اثر جادو کا سا ہوا۔ شکوک کے بادل چھٹتے گئے، اور شبہات کی تاریکیاں مٹتی گئیں۔ مولاناؒ کی شہور عالم مثنوی کے بعد ہی اگر شبلیؒ کی "سیرۃ النبی" اور محمد علی کی اس انگریزی تفسیر نے عین وقت پر

دستگیری نہ کی ہوتی، تو خدا معلوم کب تک اور میں وادیٔ ضلالت میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔ بعد کو ان کی اور کتابیں بھی شوق سے لیکر پڑھیں۔ "سیرت خیر البشر"، "مقام حدیث" وغیرہ اور آخر میں "ریلیجن آف اسلام" جا بجا اُن کے لابعنی عقیدوں کی خامیاں، کمزوریاں بھی ملیں۔ (اور یہ کس کے ہاں نہیں ملتیں) پھر بھی بہ حیثیت مجموعی جتنی خدمت دین کی اس لاہوری نے کی ہے، خصوصاً باہر والوں کو اسلام کی طرف کھینچ لانے میں، وہ کمتر ہی کسی کے حصہ میں آئی ہے۔

لاہور اور اہل لاہور سے متعلق ذہن میں جو خوشنما مرقع اس دَور میں قائم تھا، اس چوکھٹے میں علاوہ اقبال و محمد علی لاہوری کے اور بھی کئی تصویریں بزرگوں کی بھی اور دوستوں کی بھی موجود تھیں۔ مثلاً مولانا احمد علی[1] (خدام الدین والے) خواجہ کمال الدین (اسلامک ریویو والے) جو اب لاہوری سے لندنی ہو چکے تھے، مولوی ممتاز علی (تہذیب نسواں اور مفاعد القرآن والے) خواجہ عبد الوحید (جو تقسیم ملک کے بعد کراچوی ہو چکے ہیں اور انگریزی پندرہ روزہ "الاسلام" شان و اہتمام سے نکال رہے ہیں) مولانا عبد القادر قصوری، اور ان کے صاحبزادے محمد علی (کینٹب) ڈاکٹر شیخ محمد عنایت اللہ (پروفیسر گورنمنٹ کالج) حسن محمد حیات (علیگ) چودھری محمد حسین ایم۔ اے (پریس برانچ والے) اور شاید ان سب سے بھی بڑھ کر مہر و سالک (پہلے "زمیندار" اور پھر "انقلاب" والے)

سالک صاحب سے شخصی نیاز تو سالہا سال بعد حاصل ہوا، مہر صاحب البتہ خلافت کمیٹی کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے رہتے۔ یہ ذکر ۲۴ء تا ۲۹ء کا چل رہا ہے —— اور ان سے نیاز اکثر دہلی میں حاصل ہوتا، اور ایک بار لکھنؤ میں۔ لکھنؤ اور لاہور کے درمیان ایک تیز رَو گاڑی پنجاب میل کے نام سے تو پہلے ہی چلی آرہی تھی، اب ایک اور نئی گاڑی پشاور ایکسپریس کے نام سے کلکتہ اور لاہور کے درمیان چلنے لگی تھی۔ یہ لکھنؤ کیا معنی، خاص دریاباد سے گزرتی تھی (دریاباد اتفاق سے عین وسط میں واقع ہے) مولانا محمد علیؒ اور بقول ان کے اس "پنجابی ٹولی" کے درمیان سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ کبھی کبھی مسلمانوں کے یہ آپس کے جلسے، بزم سے کہیں بڑھ کر رزم کی شان اختیار کر لیتے۔ اور ہاتھا پائی شروع ہو جانے میں بس کچھ ہی کسر باقی رہ جاتی۔ میرا ووٹ تو مولانا محمد علی کے ساتھ رہا۔ لیکن بحمد اللہ مولانا ظفر علی خاں، بلکہ خود مہر صاحب کے ساتھ بھی ان کی تکریم و بزرگ داشت میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ بلکہ ایک بڑے نازک موقع پر تو مہر صاحب کے آگے ہاتھ جوڑنے میں بھی تامل نہ ہوا —— سالک صاحب سے غائبانہ محبت شروع سے رہی، شخصی ملاقات جب مدت دراز کے بعد لاہور میں ہوئی، تو انھیں اپنے اندازے سے بھی بہتر پایا۔ شوخ طبعی حکیمانہ رنگ کے ساتھ حضرت اکبر سے ملتی ہوئی اور جامعیت اس غضب کی کہ ان سے مل لیے، تو گویا سارے لاہور سے مل لیے! عوام سے بھی اور خواص سے بھی، لیڈروں سے بھی اور حکام سے بھی، شاعروں سے بھی اور صحافیوں سے بھی، نرم سے بھی اور گرم سے بھی۔

ملک ابھی تقسیم نہ ہوا تھا کہ لاہور سے ایک نیا روزنامہ "نوائے وقت" نکلنے لگا، اور پُرمغز و سنجیدہ ہونے کے اعتبار سے اپنے سارے ہمعصروں سے بازی لے گیا۔ اصولی اور شریفانہ صحافت کا ایک نمونہ اس نے قائم کر دیا۔ اور قال سے نہیں

---

[1] جن کی رحلت عین ان سطور کی تحریر کے وقت واقع ہوئی۔

حال سے بتا دیا کہ صحافت پگڑی اُچھالنے کے مترادف نہیں۔ اور جس طرح ماہناموں میں اپنے وقت میں "مخزن" سب کا سرتاج تھا، وہی مرتبہ روزناموں میں "نوائے وقت" نے اپنے مدیر حمید نظامی ایم۔ اے کے ہاتھوں حاصل کر لیا۔[1] انگریزی روزناموں میں "سی، ایم گزٹ" انگریزوں کے دورِ عروج میں "پانیر" اور "انگلش مین" کی ٹکر کا تھا، اور لاہور کا بھرم قائم کیے ہوئے تھا۔ "انگلشمین" تو مدت ہوئی سرے سے رخصت ہی ہو گیا، اور "پانیر" بھی رفتہ رفتہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ سی، ایم گزٹ اب بھی بہت غنیمت ہے، اور ایسا نہیں کہ لاہور اس سے شرمائے۔ کچھ روز "ایسٹرن ٹائمز" بھی ایک مسلمان کی ملکیت میں نکلتا رہا۔ اور "مسلم آؤٹ لک" بھی ایک نومسلم انگریز، جان اپسن (JOHN UPSON) کی ادارت میں۔ یہ صاحب حسِ سماعت سے مطلق بے بہرہ تھے، مگر بڑے پر جوش اور تیز زبان۔ ایک بار کوئی بات ان کے قلم سے ایسی نکلی، کہ سارا ہندو پریس ان پر ٹوٹ پڑا۔ بات غالباً ۲۵ء کی ہے "کامریڈ" زندہ تھا۔ اس کے اس کے سلک میں بُعد المشرقین تھا۔ اس پر بھی مولانا محمد علیؒ کو ہمدردی اس مظلوم کے ساتھ ہوئی اپنے پرچہ میں لکھا کہ مسلمانوں کے پاس لے دے کے ایک MUSLIM OUT LOOK ہے اس ایک کے مقابلے میں کتنے HINDU OUT BURST نکل رہے ہیں۔

خواجہ کمال الدین سے ملاقات ایک بار لکھنؤ میں جلسۂ ندوہ میں ہوئی تھی، غالباً ۲۵ء میں۔ میں نے پوچھا کہ "یہ صحیح ہے کہ آپ ہم لوگوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔" بولے کہ "صرف ان لوگوں کے پیچھے نہیں، جو ہمیں کافر کہتے ہیں، باقی جو ہمیں کافر نہیں کہتے، ان کے پیچھے پڑھنے میں کوئی عذر نہیں۔" اس کے دو تین سال بعد لکھنؤ اپنے لڑکے کی بارات میں لائے۔ بطور خطبہ نکاح جو تقریر کی، اُس میں عین مغرب زدوں کے مجمع میں اور ایک بڑے مغرب زدہ جج ہائیکورٹ کے منہ پر، فرنگی تہذیب اور اس کی بے حیائیوں کو بے نقاب کر ڈالا اور اس کا مقابلہ و موازنہ کر کے اسلام کے نظامِ ازدواج و معاشرہ کو بڑے دھڑلّے سے سراہتے رہے۔

شیخ عبدالقادر کو ایک بار تو لکھنؤ میں اپنے لڑکپن میں دیکھا تھا۔ اپنے دوست شیخ مشیر حسین قدوائی بیرسٹر اور اور اہلِ قلم کے مہمان تھے۔ ان کے بھانجے اور میرے ایک ہم سبق کے میٹریکولیشن پاس ہونے کی دعوت فرنگی محل میں ہوئی، تو وہاں قدوائی صاحب اپنے ان دوست کو بھی لیتے آئے تھے۔ میں فرسٹ ایر کا طالب علم شیخ صاحب سے ملنے، بات چیت کرنے کی ہمت تو خیر کیا کرتا، اسی کو بہت سمجھا کہ قریب سے ان کی زیارت کر لی۔ اس کے سالہا سال بعد، جب شیخ صاحب "سر" ہو چکے تھے اور یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے، ملاقات علی گڑھ میں ہوئی۔ اب شیخ صاحب جوان سے بوڑھے ہو چکے تھے اور شبلیؔ نے جو سرسید کی شان میں کہا تھا، بس اس کے مصداق ؎

پیری سے کمر میں اک ذرا خم   توقیر کی صورتِ مجسم

---

[1] مسودہ ابھی صاف نہیں ہونے پایا تھا کہ ملت کے اس خادم اور ممتاز صحافی کا بلاوا اللہ کے ہاں سے آ گیا۔ ماہ رمضان نصیب ہوا اور اس کا بھی تیسرا عشرہ

بات چیت، چہرے مہرے، ہر زاویہ سے ایک پیکر شرافت ——— لاہور کے ہندوؤں میں بڑے پڑھے لکھے ایک لفٹنٹ کرنل بھولا ناتھ تھے، آئی، ایم، ایس۔ اور فوج میں ڈاکٹری کے ایک اعلیٰ عہدہ پر۔ اُردو کتاب "قلم و عمل طب" کے مصنف اردو فارسی دونوں زبانوں میں برق۔ سال غالباً ۱۹۲۰ء تھا، جب لکھنؤ تعینات ہو کر آئے۔ ایک بار حیدر آباد میں مسز نائیڈو کے ہاں تعارف ہو چکا تھا۔ لکھنؤ میں مَیں ملا، تو خوب گھُل مل کر ملے۔ اقبال کے سخت نکتہ چینوں میں تھے۔ ملاقات کا خاصہ حصّہ بحث و مباحثہ میں گزرا۔ اُدھر سے اقبال پر اعتراضات، اِدھر سے اپنی سمجھ کے لائق جوابات ——— لاہوریوں کے ساتھ اگر نیم لاہوریوں کو بھی ملا لیا جائے تو ایک قابل ذکر بزرگ مولوی خلیل الرحمٰن، ماہر تاریخ اندلس تھے، اخیر عمر میں اپنے صاحبزادہ پروفیسر نعیم الرحمٰن کے ہاں الٰہ آباد آ گئے تھے، اور لکھنؤ بھی آتے رہتے تھے، کئی ملاقاتیں رہیں، اور بڑے پُر جوش اور با عمل مسلمان نظر آئے ——— لاہور کے باکمالوں میں ایک نام رستم دوراں گاما پہلوان کا رہا جاتا ہے، ان کا شہرہ سُن سُن کر دل کو عقیدت پیدا ہو گئی، کہ کم سے کم ایک شخص تو ہے، جو گانے بجانے، ناچنے اور مٹکنے میں نہیں، بلکہ ایک مردانہ اور شریفانہ فن میں، مسلمانوں کی لاج ساری دنیا میں رکھے ہوئے ہے۔ افسوس کہ اس پُر فخر ہستی کی زیارت کی حسرت ہی دل میں رہی، اور وہ ہستی دنیا سے اُٹھ گئی۔

عمر کی منزل ۵۰ سال کے قریب آ گئی۔ اور دیدِ لاہور کا بس شوق ہی شوق رہا۔ آخر جنوری ۴۲ء میں جب پشاور اسلامیہ کالج کی دعوت پر پشاور جانا ہوا، تو راستہ میں لاہور کی منزل خدا داد ہاتھ آ گئی۔ اِدھر سے جانے میں تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کا وقفہ اسٹیشن کے ویٹنگ روم ہی میں، اور کچھ پلیٹ فارم پر شیخ عنایت اللہ صاحب کے ساتھ ٹہل کر گزرا۔ باقی واپسی میں ۱۳، ۱۴ گھنٹے کا وقت نکال لیا۔ میزبانی اپنے انھیں پبلشر شیخ عنایت اللہ (تاج کمپنی) کے سر رہی۔ مخلص قدیم خواجہ عبد الوحید اسٹیشن ہی سے ساتھ ہو گئے، اور اپنا ہرج کار کر کے آخر تک برابر ساتھ رہے۔ انھیں کے ہمراہ ایک مسجد میں مولانا احمد علی کی زیارت کی، اور انھیں ایک پیکر فقر و تواضع پایا[1]۔ زنانہ مسلم کالج گیا، ہوسٹل کے اندر سے گزرا، لڑکیاں سب پردہ میں تھیں۔ اور پھر لڑکیوں کے اصرار سے، پردہ کی آڑ سے کالج ہال میں دو چار لفظ لڑکیوں سے کہے، کہے کیا یوں کہیے کہ جوں توں کسی طرح رُندھے ہوئے گلے سے ادا کیے بولا کم، رویا زیادہ۔ اقبال کے رفیق خصوصی چودھری محمد حسین ایم، اے سے مخلصانہ ملاقات رہی۔ پھر دوپہر کی دعوت ڈاکٹر برکت علی قریشی پرنسپل اسلامیہ کالج کے ہاں کھائی۔ چودھری محمد حسین یہاں بھی شریک طعام و کلام رہے۔ اور مولانا داؤد غزنوی اور مولانا مودودی سے بھی یہیں مدت دراز کے بعد ملاقات ہوئی۔ سہ پہر کی چائے مولانا محمد علی ایم، اے کے ہاں پی۔ جاتے وقت گو شوق کے قدم بھی بڑھ رہے تھے، تاہم دوسری طرف اپنے ہاں کے مولوی صاحبان کا خوف بھی دامنگیر تھا، خواجہ عبد الوحید جیسے خوش عقیدہ رفیق کی رفاقت بڑے کام آئی، گویا منظر یہ سامنے تھا ؎

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

بہر حال ملا، تو ان کے چہرے پر عبادت و دینداری کے آثار بلکہ انوار جھلکتے ہوئے پائے۔ عمر بھر میں ان سے پہلی

---

[1] عین اس مضمون کی تحریر کے وقت مولانا کے انتقال کی خبر ملی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

اور آخری ملاقات بس یہی رہی۔

شام کو تاج کمپنی کے پھیلے ہوئے کاروبار کو تفصیل سے دیکھا۔ اور شیخ محمد اشرف کے کاروبار کو صبح ہی دیکھ ڈالا تھا۔ مزار شیخ ہجویریؒ (صاحبِ کشف المحجوب) پر حاضری دی۔ نمازیں مختلف مسجدوں میں پڑھیں۔ شام کو پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سے مل کر جی خوش ہوا، اسی صحبت میں اور بھی دو چار صاحبوں سے ملنا ہوا۔ نام اب حافظہ میں نہیں، مگر ایک ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ ضرور ہوں گے۔ خواجہ عبدالوحید کے علاوہ مولوی محمد حنیف ندوی نے بھی حق مسافر نوازی ادا کیا۔ اور اپنا کام کاج چھوڑ کے کئی گھنٹے برابر ساتھ رہے۔ ریڈیو گھر کے ملک حبیب احمد لطف و محبت کی تصویر نکلے، خود ملنے آئے، اور اپنے ساتھ حفیظ ہوشیارپوری کو بھی لائے۔

۱۴ سال کی لمبی مدت اور گزر گئی۔ لاہور اب ہندوستان کا لختِ جگر نہ رہا۔ ایک دوسرے ہی ملک کا نورِ نظر بن گیا۔ اب وہاں تک پہنچنا مجھ سے بدہمت کے لیے ایک پہاڑ بن گیا۔ پاسپورٹ بنوائیے، ویزا کی درخواست دیجئے، اپنے فوٹو پر فوٹو کھنچوائیے۔ اور خادم کی خانہ پُری ہیں، دیانت کو بُری طرح روندتے چلے جائیے۔ کتنے مرحلے اور کتنے جھمیلے حائل راہ۔ اور لکھنؤ سے لاہور تک پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہ رہا۔ اپریل ۵۵ء تھا کہ ملک غلام محمد لاہوری گورنر جنرل پاکستان نے ازراہ کرم کراچی آنے کی دعوت دی۔ یہ لاہوری بزرگ ۲۵، ۳۰ سال قبل یو۔ پی میں ریلوے فنانس کے اعلیٰ افسر تھے اور لکھنؤ میں چودھری خلیق الزماں کے ہاں رہتے تھے اور جب چودھری صاحب کے ہاں جانا ہوتا نو ان سے بھی علیک سلیک ہوجاتی۔ بس اتنے سے تعلق کو اس شرافت پناہ نے اتنے بڑے منصب پر پہنچ جانے کے بعد بھی خوب نباہا، بہت مانا۔ بہرحال لاہور، اب کے بھی راستہ ہی پڑا اور اُتر کر ہ، ۵ دن قیام کا موقع مل گیا۔ —— لاہور اب کچھ سے کچھ ہو چکا تھا۔ اور علاوہ پیدائشی و پشتینی لاہوریوں کے خدا معلوم کتنے دہلوی اور کتنے لکھنوی اور کتنے اپنے جوار ادھر ادھر والے اب خام نہیں پختہ لاہوری بن چکے تھے۔ مہر صاحب تو خیر، قدیم کرم فرماتے ہی ہیں۔ سالک صاحب کی زیارت اب پہلی بار ہوئی، عجب موہنی مورت نکلے، کیا مہر و اخلاص، کیا واقفیت و معلومات اور کیا لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی، ایک ایک ادا دل کھینچنے والی ثابت ہوئی۔ ان کے صاحبزادے عبدالسلام خورشید کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تو اب جاکر ملی ہے، اُس وقت اپنی کم سنی ہی میں ذہین، ہونہار، اور جاذب توجہ نظر آئے۔ مشہور ناول نویس میاں محمد اسلم اور ان کے ناشر خواجہ بدالاسلام فرو غی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا شاہ جعفر ندوی، شوکت تھانوی، محمود نظامی صاحب (ریڈیو ڈائرکٹر)، عبدالوحید خان ایڈوکیٹ، ایڈوکیٹ جنرل فیاض علی، مہر صاحب، شورش صاحب، امیرالدین قدوائی، اختر علی خاں، اشرف صبوحی، محب قدیم سید ہاشمی فرید آبادی اور محب جدید خواجہ محمد شفیع دہلوی، مولوی محمد اسحاق صاحب ایڈیٹر "الاعتصام" مولوی فضل قدیر صاحب ندوی، سید نذیر نیازی، اکبر مرزا ایم۔ اے دریابادی، مولوی ابوالخیر صاحب مودودی، کن کن کی مہمان نوازیوں اور خاطر داریوں کا تذکرہ کیا جائے۔ دعوت کا چکر جو صبح ناشتہ کے وقت چلتا تھا، تو کہیں رات کے کھانے پر ختم ہوتا تھا۔ اور میرے عزیز و میزبان میجر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن منہ دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے، کہ کبھی دو وقت بھی مسلسل تو اپنے ہاں کھلا پلا سکیں! —— صاحب نوائے وقت حمید نظامی اپنی خصوصیات میں سب سے منفرد رہے۔ جس

صبح کو لاہور سے کوچ ہونا تھا، اس کی رات میں اختر علی خاں کے ہاں کے شاندار ڈنر سے جب سب لوگ چلے، تو سب کی نظر بچا، نظامی صاحب نے ایک بند لفافہ میرے عزیز اور سفری سکریٹری کے ہاتھ میں چپکے سے تھما دیا۔ رات گئے گھر پہنچ کر جب لفافہ مجھے ملا، اور اسے کھولا، تو اس میں سے بے شان و گمان اعانت "صدق" کے لیے کئی سو کی رقم برآمد ہوئی، اور عزیزوں سے بڑھ کر عزیز سید رئیس احمد جعفری ندوی نے تو گویا دن رات ایک کر دیا۔ اپنے کام کاج چھوڑ چھاڑ، صبح، دوپہر، شام جب دیکھیے میرے ہمراہ۔ غازی عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ ایک زمانہ میں تحریک خلافت کے لیڈروں میں تھے، تقسیم ملک کے بعد امرتسر سے لاہور منتقل ہو آئے۔ اور اب لیڈر کے بجائے وکیل تھے، ڈھونڈتا ڈھونڈتا ان کے گھر پر حاضری دی۔ اور تجدید نیاز کی نوبت ۲۵، ۳۰ سال بعد آئی ——— ۱۲-۱۳ء میں میں علی گڑھ میں ایم۔ اے (فلسفہ) کا طالب علم تھا، یونین کے وائس پریذیڈنٹ بحث و تقریر میں طرار یا علی گڈھ ہی کے روزمرہ میں "تقار" اس وقت شیخ عبدالرحیم تھے، ایل ایل بی کے طالب علم۔ بعد کو فیروزپور یا کہیں اور بطور ایڈوکیٹ نام پیدا کیا، اب لاہور میں پریکٹس کر رہے تھے۔ اور صدق نوازی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ان سے ملنا ہوا تو چالیس اور دو بیالیس سال قبل کے علی گڑھ کا زمانہ نظروں کے سامنے پھر گیا اور اپنی اور ان کی دونوں کی جوانیاں یاد پڑ گئیں ——— مولانا مفتی محمد حسن کو حضرت تھانویؒ کا خلیفہ ہی نہیں، خلیفۂ اعظم کہنا چاہیے، ان کے ہاں حاضری کی سعادت دوبار حاصل ہوئی۔ ان کی روحانی عظمت کا تو خیر کہنا ہی کیا، پاس بیٹھ کر یہ بھی کھلا کہ زاہد کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ زاہد خشک بھی ہو، شگفتگی، انبساط خاطری اور جی بھر کر مہمان نوازی، زہد و تقویٰ کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں ——— عمارتوں میں رسائی مقبرۂ جہانگیر، مزار اقبال، بادشاہی مسجد، مسجد نیلا گنبد تک محدود رہی۔ اور ہر جگہ کے الگ الگ اثرات دل کے گوشوں میں محسوس ہوئے۔

پُرتکلف مہمانداری پر لکھنؤ بلکہ اودھ والوں کو ناز ہے اور لکھنؤ میں ٹھیکے سننے میں یہی آیا تھا کہ پنجابی اُجڈ اکھڑ، کھلانا پلانا کیا جانیں۔ اس کہاوت کا دروغ یا فروغ اب جا کر کھلا۔ اور آپ بیتی نے بتا دیا کہ جہاں تک دسترخوانی چوچلوں اور زبان کے چٹخاروں کا تعلق ہے، اب لاہور کا قدم لکھنؤ سے ہرگز پیچھے نہیں۔ میں جس طرح ہاتھوں ہاتھ یہاں لیا گیا، اس نے لکھنوی تکلفات کی یاد تازہ کر دی، چار پانچ دن کی مسلسل خاطرداریوں اور دعوت بازیوں کی بھرمار نے یہ پتا بھی نہ چلنے دیا کہ میں دیس میں نہیں، پردیس میں اور اپنوں میں نہیں، بیگانوں میں ہوں! ——— اخلاص کے مظاہرے ہر طرف سے اور ہر طرح کے!۔ وطن جب واپس آیا ہوں، تو لاہور کی کشش دل میں بجائے کچھ گھٹنے کے، کچھ بڑھی ہی ہوئی پائی۔

طبیعت سفر لاہور کے جیسے بہانے ڈھونڈھتی رہتی ہے، اور دل میں ایک چھپی چھپی سی آرزو رہا کرتی کہ کوئی سا بھی موقع ہاتھ آئے، تو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ اور اس "غیر ملکی" سفر کی خاطر زحمتوں، صعوبتوں کا پہاڑ اور اس سے بھی بڑھ کر ہرج کا رہنسی خوشی گوارا کرتے رہیے ——— آخر ۱۹۵۷ء کے بالکل اخیر، اور ۱۹۵۸ء کے شروع کے لیے ایک دعوت نامہ موصول ہو گیا، پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک مذاکرہ (کلوکیم) اسلامیات، پر منعقد ہو رہا تھا، دعوت نامہ اسی کے لیے تھا، کھٹ سے منظور کر لیا، اور اس پر بھی کچھ زیادہ غور نہ کیا، کہ اپنے میں اس کی شرکت اور پھر خدمت کی صلاحیت بھی کچھ ہے؟ ۳۰ دسمبر کو پہنچا، یونیورسٹی کے مہمان کی حیثیت سے

نیڈوز ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ قیام اب کی تقریباً ایک عشرہ رہا — پرانی ملاقاتوں کی تجدید نے نیا لطف دیا۔ نئے کرمفرماؤں نے دامن دل اپنی طرف کھینچا۔ جلسہ گاہ میں جب پہنچا، تو اس اجنبی مجمع میں نظر اتفاق سے سب سے پہلے سالک صاحب پر پڑی، اور اسی لمحہ مقام کی اجنبیت اُنس میں تبدیل ہوگئی۔ خواجہ محمد شفیع، سالک صاحب سید ہاشمی فرید آبادی، حمید نظامی، شورش کاشمیری، ڈاکٹر احمد عابد علی، شیخ عبدالرحیم، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، میاں محمد اسلم، بدرالسلام فروغی، عبدالوحید خان کے لطف و اخلاص کے تازہ نقش دل پر بیٹھے۔ امین احسن اصلاحی تو مثل اپنے عزیز کے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا مودودی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد شفیع دیوبندی کی زیارت سالہا سال کے بعد نصیب ہوئی۔ جسٹس محمد شریف، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، کوثر نیازی، پرویز صاحب، مولوی ظفر احمد انصاری ایم۔ اے، مولانا ظفر اقبال، مولانا علاء الدین صدیقی، وائس چانسلر میاں افضل حسین، میاں بشیر احمد (صاحب ہمایوں)، فاضل مشرقیات ڈاکٹر محمد شفیع، مولانا نذر احمد، احسان دانش، وارث کامل اور طفیل صاحب کی پہلی ہی ملاقات نے موہ لیا اور ایک ہی دعوت نے اپنا لیا۔ "نقوش" کے ایک سے بڑھ کر ایک بھاری بھرکم خصوصی نمبروں کو دیکھ کر، چشم تصور میں کچھ ایسا سما گیا تھا کہ طفیل صاحب آدمی بڑے طمطراق کے ہوں گے اور بولیں گے تو گفتگو بڑے تخلخہ کی کریں گے۔ لیکن ملے تو بڑے نستعلیق اور رکھ رکھاؤ والے نکلے۔ اور بڑے متین کیا، بلکہ کچھ شرمیلے سے دکھائی دیے۔ ثاقب زیروی (صاحب لاہور) سے نوبت صرف علیک سلیک کی آئی، لیکن وہ بھی کچھ کم نہ نکلی۔ مولوی رئیس احمد جعفری ندوی سلمہ اللہ حسب توقع اب کی بھی کہنا چاہیے کہ اپنا سارا وقت اسی نامہ سیاہ کی نذر کیے رہے اور اب کی ان کے شریک و سہیم، ایک اور مخلص قدیم شفقت جیلانی خان جالندھری ثم لاہوری ثابت ہوئے۔

حاضری مولانا محمد حسن کی خدمت میں اب کی بھی دی، اور ان کی نئی اور زیر تعمیر جامعہ اشرفیہ، اور مسجد کی وسعت و رفعت دیکھی، تو کچھ دیر تو اپنی آنکھوں کی شہادت پر یقین نہ آیا۔ ماشاءاللہ۔ بارک اللہ!

آخری شب میں ہم سب مہمانوں کی جو رخصتی دعوت فلیٹی ہوٹل میں ہوئی، اس کی دھوم دھام، ٹیم ٹام کا کہنا ہی کیا۔

— اور اب کی جو وطن واپس ہوا تو محسوس کچھ ایسا ہوا، کہ جیسے سفر سے نہیں، وطن ہی سے وطن کو واپس ہوا ہوں۔

———

اُردو کے اصوات اور صوتیے

ڈاکٹر گیان چند

صوتیات کے مطالعے سے یہ حیرت خیز انکشاف ہوتا ہے کہ کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف یعنی آواز کو دنیا کے کوئی بھی دو آدمی یکساں طور پر ادا نہیں کرتے۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن یہ دعویٰ ہے کہ ایک شخص کوئی لفظ یا مفرد آواز کو ایک بار جس طرح ادا کرتا ہے آئندہ کبھی بالکل اسی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ ایک ذکی الحس آلے کائموگراف کے سامنے جب کوئی لفظ یا آواز بولی جاتی ہے تو اس میں لگے کاغذ پر ہوا کی لہر کا ایک گراف بن جاتا ہے۔ اب ہم اگر سو بار ک ک کہیں تو ہر دفعہ یہ گراف کچھ نہ کچھ بدلا ہوا ہوگا۔

اصوات کا یہ تنوع اور فراوانی سائنسی مطالعہ کے لیے بڑا دردِ سر ہے۔ مثال کے طور پر 'آیا' اور 'دنیا' میں [ی] کی آواز مختلف سُنائی دیتی ہے۔ انھیں ایک آواز قرار دیا جائے یا دو۔ اس کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ اس طرح کے نازک اختلافات والی مماثل آوازوں کو مجموعی طور پر ایک صوتیہ (PHONEME) قرار دیا گیا۔ روزانہ کے کام کاج میں ہم صوتیوں سے غرض رکھتے ہیں نہ کہ صوتوں سے۔ صوتیہ میں شامل مختلف آوازوں کو ہم صوت (ALLO PHONE) کہتے ہیں۔

دو صوتیے کم و بیش ایک ماحول میں واقع ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں جب کہ ہم صوت کبھی ایک ماحول میں نہیں پائے جاتے۔

ماحول سے مراد لفظ کی ابتدا، وسط یا آخر ہے۔ نیز کسی مخصوص آواز کے ماقبل یا مابعد آنے والی آوازیں بھی ماحول کا جزو ہیں۔ بشرطیکہ وہ زیرِ بحث آواز میں کسی حد تک ترمیم کا باعث ہوں۔ اگر دو آوازیں دو لفظوں میں اس طرح واقع ہوں کہ سوا ان آوازوں کے باقی تمام آوازیں یکساں ہوں اور صرف ایک ایک آواز کے اختلاف کی وجہ سے ان الفاظ کے معنی مختلف ہو گئے ہوں تو ان آوازوں کو صوتیہ قرار دیا جائے گا اور ان الفاظ کو اقلی جوڑا (MINIMAL PAIR) مثلاً مال اور حال۔ مال اور میل۔ مال اور مار۔ ہم صورت مختلف ماحول میں واقع ہوتے ہیں اور کبھی ایک ماحول میں واقع بھی ہو جائیں تو معنی میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتے۔ ہر زبان کے حروفِ تہجی عام طور سے صوتیے ہوتے ہیں۔ صرف ایک دو حروف ایسے ہو سکتے ہیں جنھیں صوتیہ کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اور صرف دو چار صوتیے ایسے ہوتے ہیں جو حروفِ تہجی میں آزاد حیثیت پانے سے رہ گئے ہوں۔ ماہرِ صوتیات کا کمال ہے کہ ایک زبان کی اصوات کا تجزیہ کرتے وقت آوازوں کے زیادہ سے زیادہ نازک اختلافات کی نشاں دہی کر سکے۔ لیکن صوتیوں کے تعین میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک زبان کی آوازوں کو کم سے کم صوتیوں میں اسیر کیا جا سکے۔ اصوات کے معاملے میں موشگافی تو صوتیوں کے باب میں کفایت مستحسن سمجھی جاتی ہے۔ صوت اور صوتیہ کا صحیح تصور اور تعین ایک پیچیدہ امر ہے جس کیلئے لسانیات کی دو اہم

شاخیں صوتیات (PHONETICS) اور تجصوتیات (PHONEMICS و تجزیاتی صوتیات کا مختصر) ۔ وجود میں آئی ہیں۔ گزشتہ سطور میں موٹے طور پر صوتیہ کے بارے میں کچھ لکھ دیا گیا ہے تاکہ آئندہ اوراق عام قارئین کے لیے بالکل مجذوب کی بڑ ہو کر نہ رہ جائیں۔

آج کل اُردو املا اور رسم الخط کی اصلاح کے موضوع پر مضامین کا تواتر لگا ہوا ہے۔ رسم الخط کے موضوع پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ نوٹ ہو جائے کہ اُردو میں کتنے صوتیے ہیں تاکہ اُن کے لیے علیحدہ واضح علامات مقرر کی جاسکیں۔ اگر کسی صوتیے میں کچھ ایسے ہم صوت ہوں جن کا اختلاف صریحاً سنائی دے تو ان کے لیے بھی رسم الخط میں اہتمام کرنا ہوگا۔ جو آوازیں مخرج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوں مثلاً م اور ک ۔ وہ عموماً الگ صوتیے ہوتی ہیں۔ ان کے لیے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ علیحدہ صوتیے ہیں۔ ہاں جو آوازیں مخرج اور نوعیت کے اعتبار سے ملتی جلتی ہیں۔ ان کے بارے میں ٹھوک بجا کر دیکھنا ہوگا کہ وہ ہم صوت ہیں یا کسی موقع و محل میں ایک دوسرے سے متضاد بھی ہو جاتی ہیں۔ جن اصوات کے اقلی جوڑے مل جاتے ہیں ان کے بارے میں قطعی طور سے طے ہو جاتا ہے کہ وہ صوتیہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ذیل میں اوّل اُردو کے بیشتر صوتیوں کے اقلی جوڑوں کا ایک سلسلہ درج کیا جاتا ہے :-

پ	پال	م	مال
ب	بال	ن	نال
ت	تال	ل	لال
ٹ	ٹال	ر	رال
ڈ	ڈال	ف	فال
ک	کال	س	سال
گ	گال	ز	زال
ق	قال	ش	شال
چ	چال	خ	خال
ج	جال	ہ (یا ح)	حال

صوتیوں کے سلسلے میں بعض امور وضاحت طلب ہیں۔ ذیل میں ایسے مسائل پر غور کیا جاتا ہے۔

(۱) ڑ ۔ ہندی اور اُردو میں بعض حضرات کا خیال تھا کہ ڈ اور ڑ ایک ہی صوتیے کے دو ہم صوت ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے مضمون "اُردو کے کوزی صوتیے" شائع شدہ ہماری زبان بابت یکم اگست ۶۱ء میں شافی طور پر ثابت کر دیا کہ یہ علیحدہ علیحدہ صوتیے ہیں۔ اجڈ اور اجڑ کے اقلی جوڑوں اور گڈمڈ اور گڑبڑ کے مماثل جوڑوں سے ان آوازوں کی آزاد حیثیت طے ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ گڈریا۔ سڈول۔ لاڈلا۔ ڈگڈگی۔ بڑا۔ لڑکا۔ ربڑی وغیرہ جس میں ڈ اور ڑ ایک ہی ماحول میں واقع ہوتے ہیں جس کے معنی ہیں کہ ڑ اور ڈ دونوں صوتیے ہیں۔

(۲) ایک صوتیہ کئی اصوات پر مشتمل ہو سکتا ہے لیکن ایک صوت کئی صوتیوں پر مشتمل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے۔

جس کے اِدّعا کی ضرورت نہ تھی لیکن اُردو میں یہ مضحکہ خیز صورتِ حال بھی موجود ہے کہ ایک صوت سے کئی صوتیوں کا کام لینے کی سعی بے جا کی جاتی ہے۔ ص۔ث۔ط۔ظ وغیرہ عربی میں واضح آوازیں بھی ہیں اور صوتیے بھی لیکن ہندو پاک میں جب یہ ایک ہی آواز کی تکرار سے زیادہ نہیں تو انھیں صوتیہ تو درکنار صوت کا مرتبہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ پھر ان کے لیے علیحدہ تحریری علامات برقرار رکھنا کیا معنی۔ زبان کی اصلی اور بنیادی شکل تقریر ہے نہ کہ تحریر۔ تحریر کا کام تقریر کو صحت کے ساتھ قلم بند کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

عَلَم (جھنڈا) کو اگر اَلَم لکھا جائے تو اس سے زیادہ فرق نہ ہوگا جو بار بمعنی بوجھ اور بار بمعنی پھل میں ہوتا ہے۔ نئی کتابت میں اَلَم بمعنی جھنڈا اور اَلَم بمعنی رنج اسی حد تک ایک یا دو لفظ رہیں گے جس طرح انگریزی میں PULSE بمعنی نبض اور PULSE بمعنی دال۔ نذیر اور نظیر کو صرف نذیر لکھنے سے صرف اسی قدر التباس ممکن ہے جس قدر گفتگو میں ہوتا ہے کیونکہ بولنے میں ہم ان دونوں الفاظ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح تقریر میں موقع و محل۔ سیاق و سباق ہمیں گمراہی سے روکتا ہے۔ اسی طرح تحریر میں بھی خلطِ مبحث کا کوئی اندیشہ نہیں۔ تکلّم کو زبان کی بنیاد قرار دینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُردو میں

ذ۔ض۔ظ ’ز‘ کے مختلف نام ہیں

ص۔ث ’س‘ کے دو روپ ہیں

ط ’ت‘ کی اور ح ’ہ‘ کی ایک کتابی شکل ہے۔

ع اُردو کے ۱۳ مصوتوں میں سے حسبِ موقع کسی مصوتہ کی آواز دیتا ہے۔ ذیل میں ہر مصوتہ کی ایک ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

عید۔ عنایت۔ فائع۔ عوض۔ عیش۔ عہد۔ عمل۔ عار۔ عورت۔ عہدہ۔ شعلہ۔ عُمر۔ عود

ذ۔ض۔ظ۔ص۔ث۔ط۔ح۔ع اُردو میں نہ صوت ہیں نہ صوتیہ بلکہ رسم الخط کی ایک بے اصولی ہیں جسے روایت پرستی باقی رکھنے پر مُصر ہے۔ صوتیات کے نقطۂ نظر سے یہ موہوم و معدوم آوازیں قابلِ اعتنا نہیں۔

اب ہمیں سا اور شا کی آواز کا ایک مماثل جوڑا مل جاتا ہے۔ ظرف (صوتی تحریر میں زرف) اور ژرف۔ ژالہ کے مقابلے میں زال اور ںال سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ شں سں اور ش سے علیحدہ صوتیہ ہے۔

(۳) اُردو میں دس منفوس (ASPIRATED) آوازوں کو مفرد آواز کا درجہ دیا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں ہ اس طرح شیر و شکر ہو گئی ہے کہ پوری آواز ایک ہی کوشش اور ایک ہی جھٹکے میں ادا ہوتی ہے۔ وہ دس آوازیں یہ ہیں:-

پھ۔ بھ۔ دھ۔ ٹھ۔ ڈھ۔ کھ۔ گھ۔ چھ۔ جھ۔ تھ۔

ان کے علاوہ دوسری آوازوں کے بارے میں ایسا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ذیل کی آوازیں دراصل مرکب اور مخلوط آوازیں ہیں۔ مھ (کمھار)۔ نھ (انھیں)۔ لھ (کولھو)۔ رھ (سرھانے)۔ ڑھ (چڑھائی)۔ ان میں ڑھ تو بہت سے الفاظ میں ملتی ہے لیکن بقیہ چار آوازیں دو دو تین تین الفاظ ہی میں ملتی ہیں۔ یہ سب دو دو آوازوں کا مجموعہ ہیں۔ چونکہ یہ مفرد نہیں۔ اس لیے

انھیں صوتیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جہاں تک ڑھ کا تعلق ہے وہ بھی میرے نزدیک دوہری آواز ہونے کی وجہ سے صوتیے کے زمرے سے خارج ہے لیکن اگر بعض اصحاب اسے مفرد آواز مانیں تو ذیل کے الفاظ میں ڈھ اور ڑھ ایک ہی ماحول میں واقع ہوتے ہیں۔

مڈھ (بمعنی سرغنہ) ۔ بڑھ

مڈھ بھیڑ ۔ بڑھیا

کڈھیرا (کھڑی بولی کے علاقے میں بعض شخصوں کا نام) ۔ بڑھے

اس طرح ڈھ اور ڑھ علیحدہ صوتیے قرار پاتے ہیں لیکن مرکب آواز ہونے کی وجہ سے ڑھ کو ہمارے جائزے سے خارج ہونا پڑے گا۔ دس مفرد منفوس آوازیں صوتیہ ہیں۔ ذیل میں ان کے اور ان کے ساتھ کی مقلول آوازوں کے اقلی جوڑے درج کیے جاتے ہیں :۔

پ	پھ	پلا	پھلا
ب	بھ	بولا	بھولا
ت	تھ	تال	تھال
د	دھ	دار	دھار
ٹ	ٹھ	ٹوکنا	ٹھوکنا
ڈ	ڈھ	ڈالنا	ڈھالنا
ک	کھ	کال	کھال
گ	گھ	گڑا	گھڑا
چ	چھ	چال	چھال
ج	جھ	جاگ	جھاگ

(۴) ہ ۔ اس صوتیے کے دو ہم صوت ہیں۔

ا۔ مخلوط ھ۔ یہ مصمتی خوشے کا جزوِ ثانی ہوتی ہے یعنی کسی مصمتے کے فوراً بعد آتی ہے۔ اس قسم کی ھ صرف م۔ ن۔ ل۔ ر۔ ڑ کے بعد ملتی ہے۔ بولی میں بعض اوقات ز (مذھب)۔ ی (یھاں)۔ و (وھاں) بھی مخلوط کر دیے جاتے ہیں۔ منفوس آوازوں اور مخلوط ھ کے مصمتی خوشوں (CONSONANTAL CLUSTERS) میں دو فرق ہیں۔ اوّل الذکر مفرد آوازیں ہیں آخر الذکر مرکب۔ دوسرے یہ کہ منفوس آوازوں (بھ۔ پھ وغیرہ) میں دراصل ہ نہیں بلکہ تنفس کی شدّت ہے۔ منہ کے سامنے ہتھیلی لاکر بھ، پھ کہنے ہوا کا ایک جھونکا محسوس ہوگا۔ لیکن "سرھانے۔ چرھا" کہتے وقت کوئی غیر معمولی ہوا ہاتھ سے نہیں ٹکراتی۔

(۵) اب اردو کی غنائی اصوات کا جائزہ لیا جائے گا۔

ہندی میں پانچ غنائی مصمتے ہیں ङ ञ ण न म ۔ ان میں سے ङ کے بیسے عام طور سے

مان لیا گیا ہے کہ یہ ن سے مختلف آواز نہیں اس لیے ہم اسے نظر انداز کر سکتے ہیں ण کا اردو میں وجود نہیں۔ ہندی کے جن الفاظ میں نؑ (ण) ہوتا ہے۔ اردو میں اس کو [ن] سے بدل کر بولا اور لکھا جاتا ہے اس لیے یہ بھی ہماری فہرست سے خارج ہوا۔ ہندی میں ان سب کی وصلی (HOMORGANIC) صورت کو انوسوار کہتے ہیں۔ انوسوار کے پہلے مصوتہ اور بعد میں مصمتہ ہوتا ہے۔ مثلاً ہنس۔ بند۔ سانڈ۔ رنگ۔

ماہرینِ صوتیات بتاتے ہیں کہ ٹ اور ڈ سے پہلے وصلی ن دراصل نؑ کی خفیف شکل ہے۔ ن کی نہیں یعنی گھنٹا۔ انڈا میں ہم نؑ بولتے ہیں اور غلطی سے اسے ن سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مخرج کے اعتبار سے ٹ اور ڈ سے ماقبل "ن" ٹ اور ڈ کی طرح خفیف سی معکوسی (RETROFLEX) ہو جاتی ہے۔ لیکن نوعیت کے اعتبار سے یہ ن ہی رہتی ہے ن ہی کی آواز دیتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹ اور ڈ اپنے ماقبل ن کو غیر محسوس حد تک تبدیل کر دیتے ہیں۔

بجی (ڻ گ وصوتیاتی تحریر میں ŋ) ک۔ کھ۔ گ۔ گھ سے پہلے محض وصلی صورت میں آتا ہے۔ سنسکرت کے ایک لفظ 'واننگ مے' کے علاوہ یہ کسی اور لفظ میں سالم حیثیت سے نہیں آتا۔ اردو میں انگ۔ انک سے گ اور ک کی آواز نکال لی جائے تو خالص بجی کی آواز رہ جاتی ہے۔ یہ آواز وصلی ن سے مختلف ہے۔ سنت۔ سنج میں جو اعلانِ نون ہے وہ سنگ میں نہیں۔ ن کے تلفظ میں نوکِ زبان بالائی مسوڑھے یا اس سے کچھ اوپر کے علاقے کو چھوتی ہے۔ ڻ گ کے تلفظ میں زبان کا پچھلا حصہ نرم تالو کو چھوتا ہے۔ اس طرح وصلی ن اور ڻ گ کے مخرج میں بہت فاصلہ ہے۔ ک گ سے پہلے بھی ساکن ن آ سکتا ہے لیکن وصل ہو کر نہیں۔ ذیل کے الفاظ ملاحظہ ہوں

(ا) ڈنکا۔ منکا

(ب) پھنکی۔ سنکی

(ج) گنگا۔ بھنگا (کیڑا۔ پروانہ)

ان مماثل جوڑوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ن اور ڻ گ مختلف صوتیے ہیں۔

وصلی ن اور منفصل ن علیحدہ صوتیے نہیں۔ وصلی یا متحد المخرج (HOMORGANIC) ن اس نون کو کہتے ہیں جو اپنے بعد آنے والے مصمتے کے ساتھ ایک ہی مخرج سے ادا ہو۔ قرب اور مماثلت کی وجہ سے ن اپنے مخرج میں خفیف سی تبدیلی کر کے محض دنتی۔ لثوی (اوپر کے مسوڑھے سے متعلق) معکوسی اور تالوئی آوازوں کے ساتھ واصل ہو سکتا ہے۔ ان میں سے بھی ل د۔ ڑ کے ساتھ اس کا اتصال نہیں ہو پاتا۔

لبی آوازوں پ پھ ، ب۔ بھ کے ساتھ م واصل ہو سکتا ہے ن نہیں۔ انبوہ۔ انبار۔ عنبر۔ سنبل وغیرہ میں ن کی آواز نہیں م کی ہے گو ہم غلطی سے ن لکھتے ہیں اور غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ن بول رہے ہیں۔

ک۔ کھ۔ گ۔ گھ سے پہلے ڻ گ کا اتصال ہوتا ہے ن کا نہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وصلی ن محض ذیل کی آوازوں کے پیشتر آتا ہے۔

(ا) ت۔ تھ ، د۔ دھ ، ٹ۔ ٹھ ، ڈ۔ ڈھ

(ب) ژ - چھ - ج - جھ

(ج) س - ز - ش

(ج) کے ذیل کی آوازیں GROOVED FRICATIVES یا SIBILANTS ہیں۔ ژ سے پہلے ن نہ واصل آتا ہے نہ فصلی۔ فصلی نون بقیہ سب آوازوں کے پہلے آتا ہے یعنی

(ا) پ - پھ - ب - بھ - ق

(ب) م - ن (مثلاً جاننا)

(ج) ر - ڑ

(د) ف - خ - ہ

(ہ) و - ی (مثلاً انور - دنیا)

ل اور غ کے پہلے ن کی کوئی مثال نہ مل سکی۔

مصوتہ سے پہلے نیز لفظ کے آخر میں ن کی آواز کمل اعلان لیے ہوتی ہے جو ن فاصل کی خصوصیت ہے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ وصلی ن اور فصلی ن کا وقوع مختلف ہے یعنی یہ دونوں ایک صوتیہ ن کے دو ہم صوت ہیں۔

(۶) غنائی مصوتوں کے علاوہ مصوتی غنائیت (NASALISATION OF VOWEL) بھی ایک واضح آواز ہے۔ غنائی مصمتے کو ادا کرنے وقت آواز پیدا کرنے والی ہوا محض ناک سے خارج ہوتی ہے جبکہ منہ کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ مصوتی غنائیت میں سانس بیک وقت منہ اور ناک دونوں سے خارج ہوتا ہے۔ اردو میں مصوتی غنائیت کی دو قسمیں ملتی ہیں پہلی خالص مصوتی غنائیت ہے مثلاً

سانپ - دانت - گنوار - چھنٹا ہوا - اینٹ - سچائی - لڑکوں

دوسری مخلوط مصوتی غنائیت ہے۔ یہ محض VOICED STOPS[1] & VOICED AFFRICATES یعنی ب - بھ - د - دھ - ڈ - ڈھ - گ - گھ - ج - جھ کے قبل ملتی ہے جبکہ خالص مصوتی غنائیت بقیہ سب آوازوں کے قبل اور لفظ کے آخر میں آتی ہے۔ ب - بھ کے پہلے خفیف سی م کی آواز۔ د - دھ - ڈ - ڈھ - ج - جھ کے قبل خفیف سی ن کی جھلک اور گ - گھ کے پہلے خفیف ن گ کا شائبہ آجاتا ہے ملاحظہ ہو۔

سنبھال - تانبا - سندلیا - سوندھا - ڈھنڈھورا - مینڈک - منجیرا - گونجا - انگرکھا - آنگن۔ اگر ہم خالص مصوتی غنائیت کو [illegible] اور مخلوط مصوتی غنائیت کو [illegible] ، [illegible] ، [illegible] کے صوتی نشانات سے ظاہر کریں تو اردو الفاظ میں مصوتی

---

[1] میرے نزدیک VOICED کے لیے [illegible] VOICELESS کے لیے خفی - STOP کے لیے مسدود FRICATIVE کے لیے [illegible] AFFRICATE کے لیے لمس جہدی (ہندی اسپرش سنگھرشی یا اسپرش گھرشی) موزوں ترین اُردو اصطلاحیں ہیں۔

غنائیت کی مختلف اقسام کا بٹوارہ یوں ظاہر کیا جائے گا

	ب - بھ سے پہلے	د - دھ - ڈ - ڈھ - ج - جھ سے پہلے	ک - کھ سے پہلے	بقیہ صورتوں میں
ں̃ m	✓			
ں̃ n		✓		
ں̃ ŋ			✓	
ں̃				✓

اس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ مصوتی غنائیت ایک صوتیہ ہے لیکن اب یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس سے مماثل دوسری آوازوں سے اس کا کیا رشتہ ہے۔

(ا) ساس - سانس

(ب) ہنس (فعل امر) - ہنس (پرندہ)

(ج) سنبھل (فعل - تلفظ کے لحاظ سے سمبھل) - سمبھل (کھڑی بولی کے علاقے میں ایک قصبہ)

(د) مُنڈی (منڈی داڑھی) - منڈی (ایک بوٹی کا نام)

(ہ) رنگا - گنگا

ا سے ثابت ہوتا ہے کہ سادہ مصوتہ کے مقابلے میں خالص مصوتی غنائیت صوتیے کا حکم رکھتی ہے۔ ب میں خالص مصوتی غنائیت اور وصلی ن کا فرق دکھایا گیا ہے۔ ج، د اور ہ میں مخلوط مصوتی غنائیت اور م - ن - ں گ کا تضاد پیش کیا گیا ہے۔ پہلے ۴ اقلی جوڑے ہیں اور پانچواں مماثل جوڑا (ANALOGOUS PAIR)

غنائیت کی تمام بحث کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو میں ذیل کے غنائی صوتیے ہیں۔

مصوتی غنائیت - م - ن - ں گ

(۷) اُردو میں ۱۲ مصوتے ہیں جن میں سے دس صوتیے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل کے اقلی جوڑوں کے دو سلسلے ملاحظہ ہوں۔

(۱) یائے معروف — کھیل — میل

(۲) زیر — کھِل — مِل

(۳) یائے مجہول — کھیل — میل

(۴) یائے لین — — مَیل

(۵) زبر — کھَل — مَل

(۶) الف ممدودہ — کھال — مال

(۷) واو لین | کھَول (ابلنا)
(۸) واو مجہول | کھول | مول
(۹) پیش | کھُل | تُل
(۱۰) واو معروف | | مُول

واوٴ معروف کا تضاد واوٴ لین سے دُور - دَور

بقیہ تین مصوتے خفیف اِ ے - خفیف اُ ے - اور خفیف اُو ہیں - اگر ہم سادہ زیر - زبر - پیش کو زیر معروف - زبر معروف اور پیش معروف کہیں تو تین نئے مصوتوں کو زیر مجہول - زبر مجہول اور پیش مجہول کہہ سکتے ہیں -

زبر کے دو ہم صوت ہیں - زبر مجہول (۱) ساکن ہ یا ح) سے پہلے آتا ہے مثلاً کہنا یا (۲) جب کہ ہ فقتین کے درمیان ہو تو دونوں فتح زبر مجہول کی شکل اختیار کر لیتے ہیں مثلاً محل - مہک بقیہ تمام صورتوں میں سادہ زبر بولا جاتا ہے - اس طرح یہ دونوں ایک صوتیہ زبر کے دو روپ ہیں -

زیر کے بھی دو ہم صوت ہیں - زیر مجہول ساکن ہ یا ح سے پہلے بولا جاتا ہے - مثلاً سہرا - محنت - ان موقعوں پر زیر معروف نہیں آسکتا - بقیہ تمام صورتوں میں جہاں زیر مجہول بولتے ہیں - وہ زیر معروف کے ساتھ آزادانہ تغیر میں ہوتا ہے یعنی دونوں آوازوں میں سے کوئی بھی بول دی جائے - لغوی اعتبار سے غلط نہ ہوگا مثلاً واقعہ - سانحہ

پیش کے دو ہم صوت پیش معروف اور پیش مجہول ہیں - پیش مجہول ساکن ہ یا ح سے پہلے آتا ہے مثلاً کہرام - تحفہ - یہاں پیش معروف نہیں آسکتا - بقیہ تمام صورتوں میں جہاں پیش مجہول بولتے ہیں وہ لغوی اعتبار سے پیش معروف کے ساتھ آزادانہ تغیر میں ہوتا ہے - مثلاً محرم - معتی -

جو آوازیں تکملی بٹوارے یا آزادانہ تغیر کا رشتہ رکھتی ہوں - وہ ایک صوتیے کی ہم صوت ہوتی ہیں - یہ معنی میں تبدیلی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں - اس طرح زبر مجہول - زیر مجہول اور پیش مجہول صوتیے کا مرتبہ نہیں رکھتے -

(۸) تشدید بھی اردو میں صوتیہ ہے - عام خیال کے برعکس یہ ایک طویل مصمتہ ہے دوہرا مصمتہ نہیں - یعنی اس کے ادا کرنے میں زبان اس کے مخرج پر خفیف سا توقف کر جاتی ہے - اس طرح یہ اکہرے مصمتے سے طویل اور دوہرے مصمتے سے خفیف تر ہوتا ہے - مصوتوں میں تشدید ممکن ہی نہیں -

ی بھی مشدد نہیں آتی - کیفیت اور فیاض میں پہلی آواز [ی] نہیں بلکہ بالترتیب اِ ی اور اَ ئی ہے - واوٴ مشدد کی بھی یہی کیفیت ہے - قوت میں پہلی آواز اُو ہے اور کوّا میں اُو - قوال میں بھی ہم عموماً اُو ہی بولتے ہیں لیکن اِس میں اور جوّ فلک جیسے الفاظ میں واوٴ مشدد بولنا ممکن ہے - پھر بھی عام تلفظ میں واوٴ مشدد نہیں بولا جاتا -

ی - ڑ - اور ٹ کی تشدید کی کوئی مثال نہیں ملتی - بقیہ تمام مصمتے مشدد بھی مستعمل ہیں - بعض حروف کی جو تشدید کی حالت میں شاذ ہیں ایک ایک مثال درج کی جاتی ہے - کحاّل - ذخاّر - عزت - ہشاش بشاش - مرغن - غفار - سقہ - ہندی کے برخلاف اردو میں طویل مصوتے کے بعد بھی تشدید آسکتی ہے - مثلاً شامہ - عامہ - خامہ -

اکہرے مصمتے سے مشدد مصمتے کے تضاد کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں مثلاً پکا اور پکّا خاصہ اور خاصّہ۔ ہندوستان کے مشہور ماہر صوتیات گولوک بہاری دھل اپنی ہندی کتاب دھونی وگیان (ص ۲۲۶) میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ابھی تک روئے زمین پر کوئی ایسی زبان نہیں ملی جس میں دوہرے مصمتے کی جگہ تشدید (انشدہ) کی جگہ دوہرا مصمتہ رکھ دینے سے معنی بدل جائیں۔ اگر یہ دعوے سچ ہوتا تو تشدید صوتیہ نہ رہتا۔ اسے دوہرے مصمتے کے مترادف قرار دے دیا جاتا۔ لیکن ہماری زبان اس اصول کی تردید کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ چُنِنی۔ مجھے موتیے کی کلیاں چُننی ہیں۔
چُنّی۔ چھوٹا سا لال کا ٹکڑا ؎ پیالے میں وہ چُنّی سی جڑی ہے (میر حسن مثنوی گلزار ارم)

۲۔ بَنِنے (فعل) اور بَنّے۔ بھائی (اسم)

۳۔ گھُنَنا (کیڑا لگنا) اور گھُنّا (مکار)

اس طرح تشدید اکہرے مصمتے اور دوہرے مصمتے دونوں سے مختلف اور متضاد آواز ہے اور اردو ہندی میں ایک آزاد صوتیہ ہے۔

(۹) بعض اوقات مسلسل آنے والے دو لفظوں کو کچھ ٹھہر کر ادا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں الفاظ کو ملا دینے سے ایک دوسرا لفظ بن جاتا ہے۔ دو الفاظ کے درمیان اس توقف کو جوڑ (JUNCTURE) کہتے ہیں اور یہ بھی ایک صوتیہ ہے۔ ہاکٹ[1] نے انگریزی میں اس کی یہ مثال دی ہے۔

THE NIGHT RATES ARE LOWER.

THE NITRATES ARE BETTER.

اردو میں ایسی مثالیں ملاحظہ ہوں

۱۔ تیرا جلوہ میرے من کا موتی ہے۔

۲۔ تیرا جلوہ میرے منکا موتی ہے۔

۱۔ اب جی بھر کر رو دے

۲۔ اس نے موتی رودے

ان میں پہلی سطور میں جوڑ کا صوتیہ پایا جاتا ہے۔

(۱۰) کلام میں مخصوص لفظوں پر زور دینے سے بھی معنی بدل جاتے ہیں مثلاً

کیا آپ یہ چیز لینے بازار گئے تھے۔

کیا آپ یہ چیز لینے بازار گئے تھے۔

کیا آپ یہ چیز لینے بازار گئے تھے۔

کیا آپ یہ چیز لینے بازار گئے تھے۔

کیا آپ یہ چیز لینے بازار گئے تھے۔

---

[1] HOCKETT: A COURSE IN MODERN LINGUISTICS 1959 EDITION, P.55.

اسے سُر لہر (INTONATION) کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کی بنا پر کئی صوتیے قرار دیے گئے ہیں۔ جو بقیہ صوتیوں کے مقابل میں SUPRA_SEGMENTAL PHONEMES کہلاتے ہیں۔ ہندی میں اس موضوع پر کچھ لکھا گیا ہے لیکن میں اس سے متفق نہیں۔ یہ طے ہے کہ اُردو میں سُر لہر کے کچھ صوتیے ہیں لیکن ابھی ان کی صحیح تحقیق نہیں ہوئی ہے اس لیے ان کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

اردو کے SEGMENTAL PHONEMES اور ان کی ذیلی اصوات کا شمار یہ ہے۔

۱۔ پ ۲۔ پھ ۳۔ ب ۴۔ بھ

۵۔ ت ۶۔ تھ ۷۔ د ۸۔ دھ

۹۔ ٹ ۱۰۔ ٹھ ۱۱۔ ڈ ۱۲۔ ڈھ

۱۳۔ ک ۱۴۔ کھ ۱۵۔ گ ۱۶۔ گھ

۱۷۔ ق ۱۸۔ چ ۱۹۔ چھ ۲۰۔ ج

۲۱۔ جھ ۲۲۔ م ۲۳۔ ن۔ اس کے دو ہم صوت ہیں۔ [وصلی ن] اور [منفصل ن]

۲۴۔ ڻ گ ۲۵۔ ل ۲۶۔ ر ۲۷۔ ڑ

۲۸۔ ف ۲۹۔ س ۳۰۔ ز ۳۱۔ ش

۳۲۔ ژ ۳۳۔ خ ۳۴۔ غ

۳۵۔ ہ۔ اس کے دو ہم صوت ہیں [ملفوظی ہ] اور [مخلوط ھ]

۳۶۔ و ۳۷۔ ی ۳۸۔ تشدید ۳۹۔ یائے معروف یعنی اِی

۴۰۔ زیر۔ اس کے دو ہم صوت ہیں [زیر معروف یعنی اِ] اور [زیر مجہول یعنی خفیف اِے]

۴۱۔ یائے مجہول یعنی اِے ۴۲۔ یائے لین یعنی اَے

۴۳۔ زبر۔ اس کے دو ہم صوت ہیں [زبر معروف یعنی اَ] اور [زبر مجہول یعنی خفیف اَے]

۴۴۔ الف ممدودہ یعنی آ ۴۵۔ واو لین یعنی اَو

۴۶۔ واوِ مجہول یعنی اُو

۴۷۔ پیش۔ اس کے دو ہم صوت ہیں [پیش معروف یعنی اُ] اور [پیش مجہول یعنی اُو]

۴۸۔ واوِ معروف یعنی اُو

۴۹۔ مصوتی غنائیت۔ اس کے چار ہم صوت ہیں [سادہ مصوتی غنائیت] [م سے مخلوط مصوتی غنائیت] [ن سے مخلوط مصوتی غنائیت] [ڻ گ سے مخلوط مصوتی غنائیت] ۵۰۔ جوڑ (JUNCTURE)

ان کے علاوہ سُر لہر کے دو تین صوتیے اور ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اُردو میں ۵۲ یا ۵۳ صوتیے ہیں۔ ہندی میں اُردو کے مقابلے میں ایک صوتیہ نُ (ण) زیادہ ہے۔ اُردو میں ۳۷ مصمتے اور ۱۳ مصوتے ہیں۔ اگر انھیں اُردو حروف کی ترتیب کے مطابق

لکھا جائے تو اُردو کے حروفِ تہجی کا نقشہ یوں ہوگا۔

مصمتے :۔ ب ۔ بھ ۔ پ ۔ پھ ۔ ت ۔ تھ ۔ ٹ ۔ ٹھ ۔ ج ۔ جھ ۔ چ ۔ چھ ۔ خ ۔ د ۔ دھ ۔ ڈ ۔ ڈھ ۔ ر ۔ ڑ ۔ ز ۔ ژ ۔ س ۔ ش ۔ غ ۔ ف ۔ ق ۔ ک ۔ کھ ۔ گ ۔ گھ ۔ ل ۔ م ۔ ن ۔ ں گ ۔ و ۔ ہ ۔ ی

کلُ ۳۷

مصوتے :۔ اِی ۔ اِ ۔ اِے ۔ زیر مجہول ۔ اَے ۔ زبر مجہول ۔ اَ ۔ آ ۔ اُو ۔ پیش مجہول ۔ اُو ۔ اُ ۔ اَو

کل ۱۲ ، میزان ۵۰

ان سب کے لیے علیحدہ اور واضح علامات وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ (۱) سادہ مصوتی غنائیت (۲) مخلوط مصوتی غنائیت (۳) تشدید ، کے لیے بھی علامات کی ضرورت ہے۔ دو لفظوں کے درمیان کے جوڑ کے لیے کسی علیحدہ علامت کی ضرورت نہیں۔ ان لفظوں کے درمیان حسبِ معمول فاصلہ چھوڑنا کافی ہے لیکن ایک لفظ کے دو اجزا میں جوڑ ہو تو اس کے لیے علامت [—] استعمال کرنی چاہیے۔ مثلاً انعام ۔ قرآن ۔ انعکاس جیسے الفاظ کو صوتی انداز سے لکھا جائے تو اِنام ۔ قران ۔ اِنکاس پڑھا جا سکتا ہے۔ ان سے ممیز رکھنے کے لیے جوڑ کی علامت ضروری ہے۔ اس طرح اُردو رسم الخط میں کل ۴۵ علامات چاہئیں۔ ان میں سے ہم دس منفوس آوازوں کو ھ کے شمول ہی سے ظاہر کریں تو ہمیں صرف ۴۴ واضح علامتیں درکار ہیں جن کی مدد سے اُردو رسم الخط کا ملاً صوتی رسم الخط ہو جائے گا۔

حادثۂ اسیری اور غالبؔ

ایک غزل کا زمانۂ تصنیف

نثار احمد فاروقی

منشی نبی بخش حقیر آگرے کے رہنے والے تھے اور غالب کے اور ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ غالب ان کی سخن سنجی اور سخن فہمی کے بھی بہت معترف تھے۔ ان کے نام غالب کے (۲۷) خطوط ہیں جو "نادراتِ غالب" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں[1]۔ ایک فارسی خط پنج آہنگ میں بھی شامل ہے[2]۔

حقیر فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مشورۂ سخن پہلے نظیر اکبر آبادی کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر سے تھا۔ بعد میں غالبؔ کے شاگرد ہو گئے۔ اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۰ء میں ان کا انتقال ہوا[3]

پنج آہنگ میں جو فارسی خط ہے، وہ کلیاتِ نثر میں بھی شامل ہے۔ یہ حادثۂ اسیری کے بعد لکھا گیا ہے، چناں چہ یہ جملہ "دریں روزگار کہ از بندِ ستم رستگار و بہ بندِ غم گرفتار بودم"[4] اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے آخر میں غالب نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ کل تیموری شہزادوں میں سے ایک نے بزمِ مشاعرہ منعقد کی تھی اور شاعروں کو غزل خوانی کی دعوت دی تھی۔ مجھے اب شعر کہنے کا دماغ تو رہا نہیں، نہ طبیعت اس طرف مائل تھی مگر بندگی بے چارگی چناں چہ خاص اسی روز، جب اس جلسے میں جانا تھا بلکہ عین اس وقت جب پالکی میں بیٹھا ہوا مشاعرے میں شرکت کے لیے جا رہا تھا، چند اشعار بے طلب ذہن میں وارد ہوئے، وہ تمھیں بھی بھیج رہا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ تم بھی اس زمین میں غزل لکھ کر مجھے بھیجو۔

مگر نادراتِ غالب یا پنج آہنگ میں صرف یہ فارسی خط نقل ہوا ہے۔ غزل کا پتا نہیں چلتا کہ غالب نے کون سی غزل بھیجی تھی۔ بہ ظاہر اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ غزل علیحدہ کاغذ پر لکھ کر بھیجی ہوگی اور وہ محفوظ نہ رہا، دوسرا زیادہ قوی قرینہ یہ ہے کہ پنج آہنگ فارسی نثر اور انشا کی کتاب تھی اس میں اردو غزل کا درج کرنا غیر ضروری سمجھا گیا ہوگا۔ نادراتِ غالب کے مرتب نے یہ

---

[1] مرتبہ آفاق حسین آفاق دہلوی، شائع کردہ مشہور پریس کراچی ۱۹۴۹ء اس پر مخدومی قاضی عبدالودود صاحب کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔ معاصر حصہ ۱

[2] کلیاتِ نثر غالب، طبع اول جنوری ۱۸۶۵ء/ ۱۰۲ — [3] تلامذۂ غالب/ ۹۴-۹۵ نیز نادراتِ غالب/ ۳۳

[4] کریم الدین طبقاتِ شعرائے ہند میں لکھتا ہے "ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ ان پر جانب سرکار سے بڑا پڑا جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق حال ہوا (ص ۳۷۸) (تذکرہ کریم الدین سے کچھ یادداشتیں میں نے قلم بند کی تھیں اور یہ نسخہ مجھے مخدومی مالک رام صاحب کے کتب خانے میں ملا تھا۔ ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔)

فارسی خط شاید اسی بیاض سے نقل کیا ہے جس میں غالب کے دوسرے غیر مطبوعہ خطوط تھے، کیوں کہ اس میں انھوں نے تاریخ کے ساتھ خط کا سنہ کتابت بھی لکھا ہے جو پنج آہنگ میں نہیں ہے (مگر انھوں نے خود اپنے ماخذ کی صراحت نہیں کی) پنج آہنگ میں اس خط کے خاتمے پر صرف تاریخ درج ہے۔

از اسد اللہ نگاشتہ ۱۶ ربیع الاول و ۲۲ فروری ہنگام نیم روز[1]

نادراتِ غالب میں اس کے ساتھ ہی توسین میں سنہ ہجری [۱۲۶۴ھ] بھی لکھا ہوا ہے اور سنہ عیسوی مشکوک ہے[2]۔
تقویم کے حساب سے ۱۸۴۸ء میں ۱۶ ربیع ۲۱ فروری کے مطابق تھی اور دن دوشنبہ کا تھا۔ مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ اس تقویم کے حساب میں ایک دن کا فرق رہ جاتا ہے۔ اس لیے ہجری و عیسوی تاریخوں کا جو تطابق غالب نے لکھا ہے اسی کو صحیح ماننا چاہیے۔ گویا یہ خط ۱۶ ربیع الاول ۱۲۶۴ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۴۸ء روز سہ شنبہ کا لکھا ہوا ہے۔

مجھے ایک قدیم قلمی بیاض میں غالب کا یہی خط ملا ہے[3]۔ اس میں نہ صرف یہ کہ بعض اہم لفظی اختلافات ہیں جو پنج آہنگ میں شمول کے وقت غالب نے کئے ہوں گے[4]، بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ریختہ کی جس غزل کا اس خط میں حوالہ ہے یہ وہ مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

اس کی داخلی فضا بھی یہ غمازی کر رہی ہے کہ حادثۂ اسیری سے غالب کو جو ذہنی تکلیف پہنچی تھی اس کا ان کی شاعری پر کتنا اثر پڑا۔ غالب اس زمانے میں شعر و سخن سے دل برداشتہ سے ہو رہے تھے مگر قلعۂ معلیٰ کا معاملہ تھا اور قلعہ لاکھ بے رونق سہی پھر غالب کا امید گاہ تھا۔ انھوں نے طوعاً و کرہاً غزل لکھی اور عین اس وقت موزوں کی جب وہ سواری میں بیٹھے ہوئے گھر سے قلعے کو جا رہے تھے

چناں چہ غزل کا یہ شعر اسی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

---

[1] کلیات نثر غالب / ۱۰۳ [2] نادرات غالب (متن) / ۱۰۲ [3] بیاض قلمی مملوکہ راقم الحروف۔ اس میں کچھ اور بھی اہم خطوط ہیں اس کا تعارف تفصیل کے ساتھ علیحدہ پیش کیا جائے گا۔ نظر بظاہر یہ ۱۸۵۷ء سے کئی برس پہلے لکھی گئی ہے اور اس میں مختلف انشاء پردازوں کے مکاتیب جمع کیے گئے ہیں۔ جامع کا نام، سال کتابت وغیرہ کچھ معلوم نہیں ہوتا

[4] آگے جس خط کا متن کلیات نثر / ۱۰۳ سے نقل کیا گیا ہے اس کی ابتدا ایک فارسی شعر "گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام الخ" سے ہوتی ہے مگر بیاض میں یہ شعر نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء سے دو تین دن پہلے لکھا گیا تھا۔ پھر یہ اس خط میں کیسے آ گیا جو ۲۲ فروری ۱۸۴۷ء کا مرقومہ ہے یہ معمّا دوسرے موقع پر حل کروں گا۔ فی الحال صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ کلیات میں شمول کے وقت اضافہ کیا گیا ہوگا۔

جیسا کہ سیاق و سباق اور اس کے زمانہ تصنیف سے ظاہر ہے، یہ حادثہ اسیری کے بعد لکھا گیا ہے۔ قمار خانہ قائم کرنے کے الزام میں غالب دو بار ماخوذ ہوئے تھے۔ پہلی بار تو ۱۸۴۱ء میں اس وقت سو روپیہ جرمانہ ہوا تھا[۱]۔ اگر ادا نہ کریں تو چار مہینے کی قید — یہ جرمانہ دے کر چھوٹ گئے۔ دوبارہ ۱۸۴۷ء میں پکڑے گئے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی مجرم پہلے کسی جرم میں ماخوذ ہو کر تاوان ادا کر چکا ہو اور پھر اسی جرم کا ارتکاب کرے تو اب کی قید اور جرمانہ دونوں بھگتے گا۔ غالب نے بہتیرے ہاتھ پیر مارے کہ کسی طرح قید کی ذلت سے چھوٹ جائیں، قلعے سے بھی سفارش آئی، شہر کے عمائد نے بھی سعی کی مگر کسی کی پیش نہ گئی اور اس بار انھیں جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ وہ ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو پکڑے گئے تھے[۲]۔ ۲ جولائی ۱۸۴۷ء کو عدالت فوجداری سے اس مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا جس میں چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا تجویز کی گئی تھی[۳]۔ اگر جرمانہ ادا نہ کریں تو قید میں چھ ماہ کا اور اضافہ ہو جائے گا۔ غالب نے اپنی برأت کے لیے صدر میں اپیل کیا مگر عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا صرف اتنی رعایت ہو گئی کہ اگر اصل جرمانے کے علاوہ پچاس روپے اور ادا کر دیں تو مشقت مقرری معاف کر دی جائے۔ اندازہ یہ ہے کہ غالب نے یہ پچاس روپے زائد تاوان دے دیا ہو گا۔ مگر وہ پورے چھ ماہ جیل میں نہیں رہے، تین مہینے گذرے تھے کہ ایک دن ڈاکٹر راس سول سرجن قیدیوں کا معائنہ کرنے آئے اور انھوں نے غالب سے بھی تحقیق احوال کیا تو انھوں نے یہ شعر پڑھا[۴]:

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیہ کے ٹانکوں سے سوا ہیں

سول سرجن اتنا متاثر ہوا کہ اس نے غالب کی سفارش کر کے اختتام میعاد سے پہلے ہی رہا کروا دیا۔

اس موقع پر یہ اعادہ ضروری ہے کہ غالب کی گرفتاری ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو عمل میں آئی تھی اور ۲ جولائی ۱۸۴۷ء کو عدالت فوجداری کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا پھر غالب نے اپیل کیا۔ اس میں بھی کم سے کم دو تین ماہ ضرور گذر گئے ہوں گے اور تین مہینے غالب جیل میں رہے گویا وہ ۱۸۴۷ء کے اواخر میں یا ۱۸۴۸ء کے اوائل میں قید سے رہا ہوئے اور یہ خط انھوں نے فروری ۱۸۴۸ء میں (گویا رہائی سے ایک یا ڈیڑھ ماہ کے بعد ہی) لکھا ہے۔ اس پس منظر میں مذکورہ غزل کے یہ شعر خاص طور سے غور طلب ہیں:

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

---

[۱] دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء مخزونہ نیشنل آرکائوز آف انڈیا نئی دہلی۔

[۲] ذکر غالب (طبع سوم) / ۸۳ [۳] امتیاز علی عرشی: قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں، مشمولہ سہ ماہی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۸ء (اس کی خبر ۱۳ مئی ۱۸۴۷ء کے "فوائد الناظرین" میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ماسٹر رامچندر کا اخبار تھا)

[۴] حسن نظامی: دہلی کا آخری سانس / ۱۷۴ — ۱۷۵ [۵] کلام عاصی (طبع دہلی) / ۲۶۳

یہ غزل ۱۸۴۱ء والے پہلے ایڈیشن اور ۱۸۴۷ء والے دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں ہے[1] لیکن دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۶۲ء کا جو نسخہ کتاب خانہ رام رام پور میں ہے اس کے آخر میں غالب کا وہ کلام نقل ہوا ہے جو اس دیوان کی اشاعت کے بعد غالب نے کہا تھا[2]۔ اس میں یہ غزل بھی شامل ہے۔ اس زمانے میں غالب نے اور جو غزلیں کہی تھیں ان میں یہ اشعار بھی اسی ذہنی فضا کو پیش کرتے ہیں[3]:

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں　　جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

تنگیٔ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے　　کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ　　اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں　　کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد　　ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے　　یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے　　آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں[4]

کوئی دن زندگانی اور ہے　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے[5]
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

---

[1] دوسرا ایڈیشن مطبع دار السلام، حوض قاضی دہلی سے مئی ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ دہلی یونیورسٹی میں تھا، لیکن اب وہاں سے غائب ہو چکا ہے۔ مگر اس کی ایک نقل رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اشاعت کے لیے دیوان کا مسودہ غالب بہت پہلے تیار کر چکے تھے ورنہ ذکر اس پری وش کا الخ اس میں ضرور شامل ہونی چاہیے تھی۔ [2] امتیاز علی عرشی: دیوانِ غالب نسخۂ عرشی / ۹۶ – ۹۷

[3] مولانا عرشی نے حادثہ اسیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "غرض اس کانٹے کے چبھنے سے بھی ان کا بہت سا خونِ دل کاغذ کے صفحوں پر بہا اور ہمارے لیے متعدد شاہکار نقش باقی رہ گئے (نسخۂ عرشی / ۶۱)

[4] اس شعر کے بارے میں ۲۴ راگست ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں قاضی عبد الجمیل جنون کو غالب نے لکھا تھا "اس میں کوئی اشکال نہیں، جو لفظ ہیں، وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا۔ خدا جانے شہر میں یا نواح شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس چلا جائے" (خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد ص ۱۲۷) [5] اس غزل کے بارے میں غالب نے نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کو لکھا تھا۔ جب بادشاہ دہلی نے مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی" (مکاتیب غالب /) اس لحاظ سے یہ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کے بعد لکھی گئی۔

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے[لہ]

پڑ ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھیریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سر رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے
غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

یہ سب غزلیں ۱۸۴۷ء کے بعد کی لکھی ہوئی ہیں اور اگر غالب کے حادثۂ اسیری کا پورا واقعہ کسی کے ذہن میں ہو تو وہ

[لہ] ملاحظہ ہو نادرات غالب / ۱۲ نیز نسخہ عرشی / ۳۶۳ یہ غزل ۱۱ رمئی ۱۸۵۱ء کے دہلی اردو اخبار میں چھپی تھی اور اسے حقیر کے پاس بھیجتے ہوئے غالب نے لکھا تھا: داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور؟"

ان کے بین السطور میں غالب کے ان جذبات و احساسات کا اندازہ کر سکتا ہے جنھوں نے غالب کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا تھا:

"میں ہر اک کام خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گذرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں، روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ، آستانہ رحمۃ للعالمین، دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے، اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذرا، اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں[1]۔"

یہاں غالب کا وہ فارسی خط نقل کیا جاتا ہے۔ اس کا مقابلہ کلیات نثر کی پہلی اشاعت (۱۸۶۸ء) سے کیا گیا ہے اور جو اختلافات نظر آئے ان کی نشان دہی حواشی میں کر دی ہے۔

بنام منشی نبی بخش اکبرآبادی سررشتہ دار فوجداری کول

اندیشہ[2] گواہ است و مشاہدہ شاہد کہ کاستن[3] بہر آراستن است و زدودن از برائے نمودن۔ سبو را چوں بیارایند بہ پیرایند، و بادہ را تا بہ پیمایند بپالایند[4]۔ نے پارہ را تا بہ بریدن پارہ ازاں بہ خوردگی نہ رود صورتِ قلم نتواں داد، آرے در کارگاہِ کون و فساد، ہیچ فسادے بے کون و ہیچ کون بے فساد نیست۔ بپندارم[5] برہ دند و چنارے ہم براں پایہ[6] نگذاشتند[7] و سپس بر زمین زدند تا پیکرم چناں بخاک نقش بست کہ آں نقش بہ ہیچ گذارک[8] از خاک نتواں سترد، گوئی دریں کون و فساد کہ ناگاہ روے داد، مرا برآوردند[9] و اختر را بجائے من آوردند کہ مرگ از زیستن و خندہ از گریستن نشناسد، یارب ایں پیکر کہ بخاک نقش بستہ[10] و ایں نقش کہ ازاں پیکر بخاک نشستہ[11] زود باشد کہ از روئے خاک تہ خاک سپرند۔ دریں روزگار کہ زبندِ ستم رستگار و بہ بندِ غم گرفتار[12] بودم سخن ور جادو بیان از خود رفتہ لالہ ہرگوپال تفتہ را بسرم گذار افتاد شنیدم کہ آں لطف گستر بوطن رفتہ بودند[13] و اینک آمدہ اند، عجب آمد کہ بنامہ نہ نواختند۔ ہمانا ہم نشینی و ہم زبانی من[14] با تفتہ ہم زبانی و ہم نشینی با خویش[15] شناختند و حقا کہ چنیں است۔ دوش یکے از شاہزادگان تیمور خانیہ بزم سخن آراستہ بود و سخن سنجاں را بغزل خوانی خواندہ، مرا کہ بگفتن ریختہ سرے نماندہ اگرچہ [بگفتن غزل مامور شدم و دل بداں نہ بستہ بودم[16]] اما روزے کہ شب بداں انجمن باید رفت[17]، خاصہ دمے[18] کہ سوارہ رہ می بریدم[19]، بیتے چند بے خواست از دلِ غم زدہ سر بر زد، چناں کہ بشما [نیز][20] می فرستم و می خواہم کہ ہم دریں زمین غزلے گفتہ بمن فرستند

[1] حالی: یادگار غالب/۲۷-۲۸ (طبع ۱۹۳۰ء) نیز "باغ دو در" مرتبہ سید وزیر حسن عابدی، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین سنہ ۱۹۶۱

[2] کلیات نثر/۱۰۳ میں اس خط کا سرنامہ یہ فارسی شعر ہے: گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت ۔۔۔ می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

[3] کلیات: از بہر [4] کلیات میں یوں ہی ہے۔ مگر بیاض منقول عنہ میں بپالایند [5] کلیات: زخاکم آفریدند و بسپہر بردند (بیاض میں بسپہر بردند جو ظاہرا کتابت کا سہو ہے) [6] کلیات: بداں [7] کلیات: نگاہ داشتند [8] کلیات: کزاکک [9] کلیات: مرا بردند [10] کلیات: نشستہ [11] کلیات: بستہ [12] کلیات: گرفتارم [13] کلیات: بودند اینک [14] بیاض منقول عنہ میں بس [15] ہم نشینی خویش با من [16] کلیات: گرچہ دل بگفتنش نشستہ بودم (؟ بستہ؟) [17] کلیات: بایست [18] کلیات: ہنگامی [19] کلیات: رہ می بردم [20] کلیات میں "نیز" ندارد

[غزل ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا[1]
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا]

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا یہ خط قید سے رہائی کے بعد لکھا ہے۔ اس میں تفتہ کے دہلی آنے کا بھی ذکر ہے۔ وہ غالب کو رہائی کی مبارک باد دینے آئے ہوں گے۔ خط کے آخر میں غالب نے حقیر سے فرمایش کی ہے کہ مشاعرے کی غزل تمھیں بھیج رہا ہوں تم بھی اس زمین میں غزل لکھ کر مجھے بھیجو۔ چناں چہ نبی بخش حقیر نے غالب کی یہ فرمایش پوری کی ہے۔ مگر افسوس ان کی پوری غزل نہیں ملی صرف ایک مطلع دستیاب ہوتا ہے[1]۔

دیر میں ہے ذکر اپنا کعبے میں بیاں اپنا
ایک ہم ہیں اور چرچا ہے کہاں کہاں اپنا

---

[1] مالک رام: تلامذہ غالب/ ۹۶ نیز آفاق حسین: نادرات غالب/ ۳۶

سوداؔ کی مرثیہ نگاری

ڈاکٹر خلیق انجم

مرثیہ اردو شاعری کا بیش بہا خزانہ ہے۔ اس میں غزل کی سادگی و سوز و گداز قصیدے کی شان و شوکت، مثنوی کا اندازِ بیان، رزم و بزم کی مرقع کشی، فطرت نگاری، انسانی رشتوں اور تعلقات کی ترجمانی اور حق اور باطل کی جنگ۔ وغیرہ سب ہی کچھ ملتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا مرثیہ تمام اصنافِ سخن کا مجموعہ ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

اردو میں مرثیہ نگاری کی ابتدا قلی قطب شاہ کے عہد میں ہوئی۔ اور دکنی شاعروں نے اس صنفِ سخن پر کافی توجہ دی۔ دکن کے مرثیہ گو شاعروں کی فہرست اچھی خاصی طویل ہے۔ البتہ شمالی ہند میں سوداؔ سے قبل مرثیہ کہنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ ان میں غلام مصطفےٰ یکرنگ[1]، میر امانی[2]، خواجہ برہان الدین عاصمی[3]، اعلیٰ علی[4]، سید محمد تقی[5]، نذر علی خاں گماں[6]، میرزا علی قلی ندیم[7]،

---

(۱) میرؔ نے ان کے مرثیے کے تین اشعار نقل کیے ہیں۔ نکات الشعرا ص ۱۹

(۲) میر امانی ولد میر آگہی (خواجہ برہان الدین عاصمی) .... با فقیر آشنا بود .... بیشتر فکر مرثیہ می نمود۔
تذکرہ شعرائے اردو ص ۵

(۳) خواجہ برہان الدین عاصمی (آگہی) ...... متوطن شاہجہان آباد .... مرثیہ ہم خوب می گوید۔
نکات الشعرا ص ۱۱۸

(۴) ...... میر اعلیٰ علی از سادات عالی شان ...... ابن میر ولایت اللہ خاں ... مرثیہ نیز می گوید۔ تذکرہ شعرائے اردو ص ۲

(۵) سید محمد تقی۔ سید نجیب الطرفین از مرثیہ گویان حضرت ابا عبداللہ الحسین ..... مولدش شاہجہان آباد، الحال بطرفِ فرخ آباد استقامت دارد۔ تذکرہ شعرائے اردو ص ۳۷۔ سوداؔ نے "سبیل ہدایت" میں انھیں کے مرثیے پر اعتراضات کیے ہیں۔

(۶) مردے است سپاہی پیشہ، از یاران کوکہ خاں فغاں۔ اصلش از شاہجہاں آباد است، مرثیہ و منقبت و غزل ہمہ می گوید۔ تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۴۰-۱۴۱

(۷) شعر فارسی و مرثیہ در ریختہ بہ خوبی می گفت۔ چنانچہ اکثر مرثیہ ہائے او مشہور اند۔ تذکرہ شعرائے اردو۔ ص ۱۷۷

میر عبداللہ مسکین[1]، حزیں[2] و غمگین[3] وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ شمالی ہند کے یہ شعرا مرثیہ گوئی کو مغفرت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے بعض مرثیے فن شاعری کے عام اصولوں سے آزاد ہوتے تھے۔ سودا نے سید محمد تقی کے ایک مرثیے پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

آپ کے مرثیے کا ہوں قائل — خون جس سے عوام کا ہے دل

سن کے جماے جس پہ بدھو تک — شام سے کوٹیں سینہ صبح تک

لیکن افسوس صد ہزار افسوس — یہی آتا ہے بار بار افسوس

بدھ جما سمجھ جسے رو ویں

معنی اس کے نہ مجھ سے حل ہو ویں

سودا کو بنیادی اعتراض یہ تھا کہ مرثیہ گو شاعر فن شاعری کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتا۔ انھیں سید محمد تقی پر اعتراض کرتے ہوئے سودا نے اردو نثر میں یہ بھی لکھا تھا۔

"..... پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔ نادر مقالہ ہے کہ عقلا جو نہ سمجھیں اور ضبط تقطیع و قصد بکا میں رہیں اس کا سیاق و سباق جہلا دریافت کریں اور پھوٹ بہیں۔

معنی لفظوں سے ہوتے ہیں روپوش

یاں تلک رتبہ سخن پہنچا[4]"

یہ حال صرف سید محمد تقی کا نہیں اکثر مرثیہ گو شعرا کا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ادب اور احترام کی وجہ سے کسی میں اعتراض کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ لیکن سودا کب چوکنے والے تھے۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سودا نے مرثیہ نگاری کی ابتدا کب کی۔ میر، خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی اور قیام الدین قائم نے سودا کے مرثیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ غالباً لچھمی نرائن شفیق پہلے تذکرہ نگار ہیں۔ جنھوں نے کلیاتِ سودا پر تبصرہ کرتے

---

[1] سودا نے ایک شہر آشوب میں مسکین کا ذکر کیا ہے ؎

اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا — پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں

غلیق صدیقی نے ان کا اٹھ بندوں کا ایک مرثیہ نقل کیا ہے۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ص ۲۴۱-۲۶۱

[2]، [3] حزیں اور غمگین دونوں مسکین کے بھائی تھے۔ درگاہ قلی خاں ان تینوں کے بارے میں لکھتے ہیں "ہر سہ در (مرثیہ) بزبانِ ریختہ گفتن مہارت تمام دارند۔ در ہمہ شہر کلام اینہا شہرت دارد...... و در واقع ہر سہ کس بسیار خوب می گویند" مرقع دہلی ص ۵۸

[4] کلیاتِ سودا ص ۴۳۴

ہوئے لکھا ہے :۔

"کلیاتش متضمن بر قصائد و مثنوی و .... مخمس و ترجیع بند و قطعہ و رباعی و مرثیہ قریب دو ہزار بیت بہ نظر امعان رسیدہ"[۱]

چمنستانِ شعرا کا سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ ہے گویا اس سنہ سے قبل جو کلیات مرتب ہوا تھا۔ اور جو شفیق کے پیشِ نظر تھا۔ اس میں مرثیے بھی تھے۔ لیکن شفیق کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت تک سودا نے مرثیہ نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ رواج زمانہ سے متاثر ہو کر چند مرثیے کہہ لیے ہوں گے۔ شیخ چاند لکھتے ہیں "سنہ ۱۱۷۵ھ سے قبل سودا کے مراثی کا ذکر سننے میں نہیں آیا۔ سب سے پہلی مرتبہ اُس کے مرثیوں کا ذکر شفیق نے اس کے کلیات کے بیان کے سلسلے میں کیا ہے۔ یہ ابھی تک نہیں معلوم ہوا کہ سودا نے دہلی میں مرثیہ کہنا شروع کیا تھا یا وہاں سے جانے کے بعد ۱۱۷۵ھ تک کے مرتبہ کلیات میں اس کے کسی مرثیے کا پتہ نہیں چلتا۔ معلوم نہیں کہ شفیق کے پیشِ نظر کس سنہ کا کلیات تھا[۲] ہمارا خیال ہے کہ سودا نے دہلی میں مرثیے کہنے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن فرخ آباد میں مہربان خاں رند کے مذاق نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ سنجیدگی سے اس صنفِ سخن کی طرف متوجہ ہوں۔

اردو مرثیہ نگاری کے ارتقا میں سودا کی حیثیت اس سنگِ میل کی ہے۔ جو ایک واضح اور صاف راستے کے تعین میں مددگار ہوتا ہے[۳] سودا نے مرثیہ نگاری کی ابتدا کی اور نہ انھیں انتہا پر پہنچایا۔ لیکن اس صنفِ سخن کے مواد اور ہیئت میں ان کے تجربات بہت اہم اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضمیر، خلیق اور بعد کے عظیم مرثیہ گو شعرا انیس اور دبیر نے سودا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے[۴] معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے ابتدائی مرثیے فن کے کچھ اچھے نمونے نہیں تھے۔ اس لیے بعض لوگ سودا کے مرثیوں پر اعتراض کرتے تھے۔ اور بعض تو انھیں مرثیہ گوئی کا اہل ہی نہیں سمجھتے تھے[۵] خود سودا نے "سبیل ہدایت" میں اُس کا ذکر کیا ہے کہ

---

[۱] چمنستانِ شعرا ص ۳۲۷ [۲] سودا ص ۲۸۸

[۳] اظہر علی فاروقی لکھتے ہیں: "مرزا سودا کے مرثیے ایک سنگِ میل کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں" اردو مرثیہ ص ۲۱۵

[۴] دبیر نے سودا کی زمین میں مرثیہ کہا۔ جس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

بس اے دبیر سینہ ہے بریاں جگر کباب | سودا کے مرثیے کا تو ممکن نہیں جواب
پر فضلِ حق سے مرثیہ یہ بھی ہے انتخاب | کافی ہے تجھ کو بخششِ محشر کے واسطے

[۵] سودا کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :۔

"مرثیے اور سلام بھی بہت کہے ہیں۔ اس زمانہ میں مسدس کی رسم کم تھی۔ اکثر مرثیے چو مصرع ہیں۔ مگر مرثیہ گوئی کی آج کی ترقی دیکھ کر ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شاید انھی مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوئی تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔"

آبِ حیات ص ۱۵۶

سید محمد تقی اُن کے مرثیوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شعر کے قاعدے کے موجب ہم کہنے لاگے تھے مرثیہ کم کم
سوز بانی تمہاری اے مخدوم ہوا اپنے تئیں کہہ یہ معلوم
مرثیہ وہ جسے عوام الناس روئیں سُن سُن پڑھیں جب اُن کے پاس
اللہ سودا کا مرثیہ سُنکر چُپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دھنکر
کیسی ہی طرح کوئی اس کی بنائے لیکن اس پر کبھو نہ رونا آئے
بارہا یہ سخن ہوا خاصہ حق میں بندے کے غائب و حاضر

سچ ہے یہ مجکو مرثیے کا ڈھب
نہیں آتا وہ جس سے روویں سب

اور بعض لوگ سودا سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ مرثیے کے علاوہ کچھ اور سنائیں۔ سودا ان کو جواب دیتے ہیں۔

جو مجھ سے کہتے ہیں کہ مرثیے سوا کچھ اور
وہ چاہتے ہیں زباں سے مری سُنا کچھ اور
کبھو نہیں تو کہوں اس کے ماورا کچھ اور
الم سے آلِ محمد کے ہے بھلا کچھ اور

لیکن کچھ ہی عرصے میں سودا نے اس فن پر کمال حاصل کر لیا۔ اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گئے۔ سودا سے قبل مرثیے غزل کے انداز پر، مربع یا چو مصرعے۔ کہے جاتے تھے۔ سودا نے مرثیے کی تکنیک میں گوناگوں تجربات کیے۔ ان تجربات کی وجہ غالباً یہ تھی کہ سودا کو علم موسیقی پر مہارت تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنے مرثیوں کی خود طرح بناتے تھے[1]

ان کے ہاں مرثیوں کی حسب ذیل صورتیں ملتی ہیں :۔

(۱) منفرد	(۲) مستزاد منفردہ
(۳) مثلث	(۴) مثلث مستزاد
(۵) مربع	(۶) مربع مستزاد
(۷) مخمس ترکیب بند	(۸) مخمس ترجیع بند
(۹) مسدس	(۱۰) مسدس ترکیب بند
(۱۱) دہرہ بند	(۱۲) مرثیہ دو ور زدہ مصرع معہ دوہرہ۔

---

[1] دستور الفصاحت ص ۷

بعض حضرات کا خیال ہے کہ سوداؔ نے پہلی بار مرثیے کو مسدس کی شکل دی۔ اور بعد میں مرثیے کی یہی فارم سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ شبلی کا بیان ہے کہ "اُس وقت تک مرثیے عموماً چو مصرعے ہوتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے سوداؔ نے مسدس لکھا۔"[1] سوداؔ کے معاصرین میں سکندرؔ[2] ایک مرثیہ گو شاعر تھے۔ چونکہ وہ صرف مرثیہ کہتے تھے۔ اس لیے انھیں مرثیہ گوئی کے میدان میں بہت شہرت اور مقبولیت تھی۔ اُن کے متعلق سید افضل حسین ثابت رضوی نے لکھا ہے "سب سے پہلے جن بزرگوار نے مرثیہ مسدس کیا۔ وہ سکندر پنجابی مرثیہ گو شاعر ہیں۔ اور سب سے پہلا اس طرز کا یہ مشہور و مقبول مرثیہ ہے۔
ع ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول[3]۔ یہ بھی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انھیں کا تخلص ڈال کر مرزا سوداؔ نے میر ضاحک مرحوم

---

[1] (ا) موازنۂ انیس و دبیر ص ۱۹ (ب) اثر لکھنوی لکھتے ہیں "جہاں تک تحقیق ہو سکا ہے۔ سوداؔ ہی پہلا شاعر تھا۔ جس نے صنفِ مسدس میں مرثیہ کہا۔" انیس کی مرثیہ نگاری" ص ۶

[2] پورا نام خلیفہ محمد علی تخلص سکندرؔ (مجموعہ نغز۔ جلد ۱، ص ۲۹۹) اور عرف میاں گھسیا تھا (تذکرہ شعرائے اردو ص ۹۳، دو تذکرے "عشقی" ص ۳۸۴)۔ شورش نے ان کا نام شیخ سکندر لکھا ہے (دو تذکرے "شورش" ص ۴۳۷) جو غلط ہے۔ سکندر پنجابی الاصل تھے۔ لیکن اُن کی نشو ونما دہلی میں ہوئی تھی (مجموعہ نغز) محمد شاکر ناجی کے شاگرد تھے (مجمع الانتخاب ورق ۶۲ ب) تذکرہ شعرائے اردو، مجموعہ نغز) ادبی زندگی کے آغاز میں قصہ خوانی کرتے تھے۔ بعد میں مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے (تذکرہ ہندی ص ۱۱۷) شاہ کمال نے فیض آباد کے جن شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں سوداؔ کے ساتھ سکندر کا بھی نام ہے۔ (مجموعہ الانتخاب۔ دیباچہ) جس کا مطلب ہے سکندر فیض آباد بھی گئے تھے۔ کمال مدعی ہیں کہ لکھنؤ میں ان کی سکندر سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اور سکندر لکھنؤ ہی سے حیدر آباد آئے (مجموعہ الانتخاب) سکندر ہر وقت شراب پیے رہتے تھے (تذکرہ سرور ص ۳۵۰، مجموعہ نغز) مصحفی نے تذکرہ ہندی گویان (تالیف ۱۲۰۰ھ ــ ۱۲۱۰ھ) میں لکھا ہے کہ ان کی عمر پچاس سے متجاوز ہو گی (تذکرہ ہندی گویان) حیدر آباد میں انتقال کیا۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ حیدر آباد میں ان کی قبر زیارت گاہ عوام ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس شہر کے لوگوں نے ان کی لاش کربلائے معلیٰ بھیج دی (مجموعہ نغز) سرورؔ نے بھی لکھا ہے کہ ان کی لاش کربلائے معلیٰ بھیج دی گئی تھی (تذکرہ سرور) انھوں نے ایک قصہ ملاح و ماہی و بادشاہ دل خوار بھی لکھا تھا۔ اکثر پنجابی، پوربی، بنگالی اور مارواڑی میں مرثیے کہتے تھے (تذکرہ شعرائے اردو)

[3] امیر احمد علوی نے دس بندوں کا یہ مرثیہ یادگارِ انیس میں نقل کیا ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے ؎

ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول — اک جگہ شہر مدینہ میں ہوا اس کا نزول
جس محلے میں کہ رہتے تھے حسین ابن بتول — ایک لڑکی کھڑی دروازے پہ بیاره ملول
خط لیے کہتی تھی پڑنے سے لگی زار و نزار
ادھر آ تجھکو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

(یادگار انیس ص ۱۹)

کی ہجو کہی تھی۔ جس کا مفصل ذکر آبِ حیات میں ہے ...... ایک مسدس مختصر سوداؔ مرحوم کے کلیات میں بھی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ع "کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی" مگر وہ کتاب میں مفید ہے۔ اور سکندرؔ کا مرثیہ تمام ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے۔ فقیر تک گلیوں میں پڑھتے پھرتے ہیں[1] سوداؔ سکندرؔ کے معاصر ضرور تھے۔ مگر عام شاعر تھے۔ اور سکندرؔ خاص مرثیہ گو مشہور ہیں۔ ان وجوہ سے مرثیہ کو بطور مسدس کہنے کا سہرا میرے نزدیک سکندرؔ کے سر ہے یا کم سے کم جب یہ بات مشتبہ ہے کہ دو معاصروں میں سے اول کس نے کہا تو سکندرؔ و سوداؔ دونوں کو موجد ماننا چاہیے[2]

مطبوعہ کلیاتِ سوداؔ میں مرثیوں کی تفصیل یہ ہے۔ مربع ۶۱، مربع مستزاد ۱، منفردہ ۸، منفردہ مستزاد ۱، مسدس ۱، مسدس ترکیب بند ۲، مسدس ترجیع بند ۱، مثلث ۱، مثلث مستزاد ۱، مخمس ۱، مخمس ترجیع بند ۴، مخمس ترکیب بند ۲، مسدس دہرہ بند ۲، مسدس مع دوہرہ پنجابی ۱، مسدس مع دوہرہ پوربی ۲، منفردہ بزبانِ دکنی ۱، دوازدہ مصرع مع دوہرا ۱، کل مرثیے : ۹۱

ان میں تیرہ مرثیوں میں "مہربان" یا "مہربان خان" نام آیا ہے۔ جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ مہربان خاں رندؔ کے مرثیے ہیں۔ اور غلطی سے کلیاتِ سوداؔ میں شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن گمانِ غالب ہے کہ یہ مہربانؔ کے مرثیے نہیں۔ کسی اور نے ان کے نام سے لکھے تھے۔ مہربان خود شاعر نہیں تھے۔ کلکتہ میں ان کی کلیات موجود ہے۔ جس میں تمام غزلیں میر سوزؔ کی ہیں۔ میں نے کلیاتِ مہربان کا وہ نسخہ خود نہیں دیکھا۔ مخدومی قاضی عبدالودود نے اس کلیات کے متعلق اطلاعات فراہم کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "دیوانِ رندؔ..... کا یہ حال ہے کہ غالباً اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سوزؔ کے کسی نسخے میں نہ ہو"[3] قاضی صاحب مراثیِ سوداؔ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "دیوانِ ہفتم (کلیاتِ سوداؔ مطبوعہ مطبع مصطفائی) دیوانِ مرثیہ ہے۔ جس کا آغاز ایک فارسی دیباچے سے ہوتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اصلح الدین کا لکھا ہوا ہو۔ اس کے بعد سوداؔ کی مثنوی "سبیلِ ہدایت" ہے۔ جس میں سید محمد تقی (اکبرآبادی، میرؔ نہیں) کے ایک سلام پر اعتراضات ہیں۔ مثنوی کے بعد اسی شاعر کے ایک مرثیے کی تنقید مربعات کی شکل میں ہے۔ جس سے پیشتر سوداؔ کی اردو نثر بطور تمہید ہے۔ خود سوداؔ کے مرثیے اور سلام اس کے بعد آتے ہیں۔ کلیاتِ سوداؔ کے بہت کم مخطوطات میں مراثی اور سلام شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک الگ مجموعہ تھا جس کا ایک نسخہ بقول دتاسی سراج الدولہ (حیدرآباد) کے کتب خانے

---

[1] اثر لکھنوی بھی اس مرثیہ کی مقبولیت تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"قدیم مرثیہ نگاروں میں ایک میاں سکندر تھے۔ اُن کا ایک مرثیہ ؎

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول

بیکس سوز و گداز ہے اور کچھ برس اُدھر تک اتنا مقبول تھا کہ فقیر اسے پڑھتے ہوئے پھیری لگاتے تھے۔" (انیس کی مرثیہ نگاری ص/ ۶)

[2] حیاتِ دبیر ص/ ۱۱۷

[3] معیار- ۲۹-۱۹۶۱ء ص/ ۵۵

میں تھا۔ (تاریخ جلد ۲ ص ۷) ۔۔۔۔۔۔ وہ مراثی جن میں "مہربان" یا "مہربان خان" بطور قافیہ آیا ہے یقیناً جس نے بھی لکھے ان (مہرباں خاں رند) کی طرف سے لکھے۔ وہ بھی جن میں نام بطور قافیہ نہیں۔ ممکن ہے کہ انھیں کے نام سے کہے گئے تھے۔ شواہد اس پر دال ہیں کہ مہربان خاں خود شعر نہیں کہتے تھے۔ دوسروں کے اشعار اپنی طرف منسوب کر لیا کرتے تھے۔ یہ مراثی سودا کے ہیں یا کسی اور شاعر کے؟ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات اس وقت نہیں کہی جا سکتی"۔[1]

سودا کو مرثیہ نگاری سے اظہار فن مقصود نہیں تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ فن کے تمام اصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ وہ بعض مرثیہ گو شعرا کی طرح مرثیہ گوئی کو آمدنی کا ذریعہ بھی نہیں بنانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے خود ایک شعر میں کہا ہے ؎

یہ روسیاہ تو ایسا نہیں جسے ہووے
تلاش مرثیہ گوئی سے دام و درہم کا

ان کا عقیدہ تھا کہ اگر کربلا کے درد انگیز اور غمناک واقعات کی یاد دلا کر وہ اپنے سامعین کو رلا سکیں تو یہ کار ثواب ہے۔ اس کا اجر قیامت کے دن انھیں ملے گا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

زیادہ اس سے نہ کر اب تو سودا طول کلام
درود بھیج شہیدوں پہ کر سخن کو تمام
جزا بر دو جہاں اس کی تجھکو دیں گے امام
سخن تو تیرا رلاتا ہے شکل ابر مطیر

ایک اور مرثیے کا آخری بند ہے ؎

سودا اب چشم محباں کو ہے یہ نقشہ جلا
پاوے گا اس کا محمد سے تو محشر میں صلا
تجھکو جنت میں ہر اک بیت پہ گھر دیں گے ملا
سننے سے جس کے یہ اشک آنکھوں سے آتا ہے چلا
سن کے اس مرثیے کو بزم میں جو رووے گا
آب چشم اس کا گناہوں کو ترے دھووے گا

سودا کو شہدائے کربلا سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ انھوں نے واقعات کربلا کے بیان میں غمناکی اور درد انگیزی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مگر وہ ایک دردمند دل نہیں رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کی بنیاد دل سوزی اور خستگی پر نہیں، ہنرمندی پر ہے۔ وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ اس لیے ہر طرح کے مضامین کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن کلام میں پر انگیزی کے لیے کچھ اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ اگرچہ میر نے سودا کے مقابلے میں بہت کم مرثیے کہے ہیں (غالباً مراثی کی تعداد اکتالیس سے زیادہ نہیں) لیکن میر کے مرثیوں میں وہ نشتریت ضرور ہے جو عقیدت مندوں کو رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

شیخ چاند سودا کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس میں شبہ نہیں کہ سودا کے مرثیوں میں مرثیت بڑی حد تک مفقود ہے۔ مرثیے کی بڑی غرض و غایت غم انگیز مضامین کو رقت خیز پیرائے میں بیان کر کے رلانا ہے۔ سودا کے مراثی میں یہ جوہر نہیں"[2]

---

[1] سویرا - ۲۹ - ۱۹۶۱ء ص ۵۷-۵۸ [2] سودا ص ۲۸۹

سید صفدر حسین میر اور سودا کے مرثیوں کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں "سودا کے برخلاف میر کا مرثیہ سوز و گداز سے لبریز ہے۔ میر کی دل برشتگی وہ میدان ہے۔ جہاں سودا گرد ہو جاتے ہیں" [۱] سودا کے مرثیوں پر مزید بحث کرنے سے قبل بہتر ہے کہ مرثیے کے اجزائے ترکیبی بیان کر دیے جائیں، تاکہ ان کی روشنی میں مراثی سودا کا جائزہ لیا جا سکے۔

مرثیے کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ چہرہ:۔ صبح کا منظر، رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے کے تعلقات، سفر کی دشواریاں، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت، مناجات وغیرہ تمہید کے طور پر۔

۲۔ سراپا:۔ مرثیے کے ہیرو کے قد و قامت، خط و خال وغیرہ کا بیان۔

۳۔ رخصت:۔ ہیرو کا امام حسین سے جنگ کی اجازت لینا۔ اور میدان جنگ میں جانے کے لیے عزیزوں سے رخصت ہونا۔

۴۔ آمد:۔ ہیرو کا گھوڑے پر سوار ہو کر شان و شوکت کے ساتھ رزم گاہ میں آنا۔ آمد کے سلسلے میں ہیرو کے گھوڑے کی تعریف بھی لکھی جاتی ہے۔

۵۔ رجز:۔ ہیرو کی زبان سے اپنے نسب کی تعریف، اپنے اسلاف کے کارناموں کا بیان اور فن جنگ میں اپنی مہارت کا اظہار۔

۶۔ جنگ:۔ ہیرو کا کسی نامی پہلوان سے یا دشمن کی فوج سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑنا، جنگ کے ضمن میں ہیرو کے گھوڑے اور تلوار کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔

۷۔ شہادت:۔ ہیرو کا دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شہید ہونا۔

۸۔ بین:۔ ہیرو کی لاش پر اس کے عزیزوں، بالخصوص عزیز عورتوں کا رونا [۲]

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اردو میں بہت کم ایسے مرثیے ہوں گے۔ جو ان اجزائے ترکیبی کی جملہ شرائط پوری کرتے ہوں۔ عام طور پر مرثیوں میں یہ اجزا پائے جاتے ہیں۔ لیکن بعض مرثیوں میں ان میں سے کچھ اجزا نہیں ہوتے۔ اور بعض میں ترتیب مختلف ہوتی ہے۔ اردو میں اور خاص طور پر سودا کے ہاں ایسے مرثیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جن میں صرف حضرت امام حسین کی شہادت پر اظہارِ غم کیا گیا ہے۔

چہرہ:۔ سودا سے قبل عام طور پر چہرے یا تمہید کا رواج نہیں تھا۔ مرثیہ گو براہِ راست واقعاتِ کربلا بیان کرنا شروع کر دیتا تھا۔ مگر سودا نے اکثر مرثیوں کی ابتدا تمہید سے کی۔ مثلاً ایک مربع مرثیے کے ابتدائی چار بند بطور تمہید کہے

---

[۱] نگار:۔ (جنوری فروری ۱۹۵۷ء) ص/۱۰۵

[۲] ۱۔ یہ تفصیل روحِ انیس (ص/۲۰-۲۱) سے لی گئی۔

ب۔ مزید مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو۔ اردو مرثیہ ص/۲۱-۷۶

گئے ہیں۔ پہلا بند ملاحظہ ہو ؎

نہیں ہلال، فلک پر مہِ محرم کا　　چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا
دل اس طرح سے یہ گھائل کریگا عالم کا　　کہ واں نہ لگ سکے ٹانکا نہ پھاہا مرہم کا

ایک اور مرثیے کا صرف پہلا بند تمہید کا ہے ؎

احوال روزگار مورخ لکھا کیا　　کوئی پڑھا کیا اُسے کوئی سُنا کیا
تحریر جب سے واقعہ کربلا کیا　　ملحد کہیں ہیں پڑھ کے ملاعین نے کیا کیا

سودا نے ایک مرثیے کی جو تمہید باندھی ہے۔ وہ "چہرے" کی جملہ شرائط پوری کرتی ہے۔ انھوں نے موسم گرما کا حال، حضرت حسین کے سفر کی دشواریاں، چھ بندوں میں بیان کی ہیں۔ تین بند ملاحظہ ہوں ؎

کہا اساڑھ نے یوں جیٹھ کے مہینے سے　　طپش یہ پوچھ نبی کے سرور سینے سے
کیا ہے بادیہ پیما فلک نے کینے سے　　جسے نکال کے اس دھوپ میں مدینے سے

———

جو چار پایہ ہے جنگل میں ہپ ہپاتا ہے　　پکھیرو پاتوں میں روکھوں کے منہ چھپاتا ہے
گھر ان دنوں کوئی چیونٹی سے کبھی چھڑاتا ہے　　ہوا ہے کیا یہ عمل سرزد اس کمینے سے

———

غرض میں کیا کہوں اس شکل سے شہِ مظلوم　　کرے تھا قطع منازل کٹانے کو حلقوم
وہ رو رو واں گیا آخر جہاں رہا محروم　　تن اس غریب کا چالیس دن پسینے سے

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سودا کے "چہرے" ان کے تمام معاصرین سے بہتر ہیں۔ شبلی نے نہ جانے یہ کیوں لکھا ہے کہ مرثیوں میں "چہرے" کی جدت ضمیر کی ہے۔ حالانکہ سودا سے قبل کے مرثیہ گو شعرا کے ہاں بھی چہروں کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور سودا نے تو مکمل چہرے لکھے ہیں۔

سراپا:۔ سودا نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ ایک مرثیے میں حضرت امام حسین کا سراپا صرف ایک شعر میں لکھا ہے ؎

بڑا کیا تھا محمدؐ نے جس کو گود میں پال
پھرے تھا ساقی کوثر کے دوش پر مہ و سال

ایک اور مرثیے میں حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد اُن کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے ؎

راکب دوش کا محمد کے　　آج نوکِ سناں پہ سر ہے سوار
دھوتے تھے جن گیسوؤں کو پیغمبر　　سو وہ آلودہ گرد و غبار

———

آج فرزندِ ساقیِ کوثر تشنہ دریا کے جا موے بکنار
آہ افسوس آج صیدِ حرم ہو گئے رن میں شامیوں کے شکار

جن کی خاطر بنا ہے ارض و سما دو جہاں چشم میں ہے انکی تار
خاک و خوں میں پڑا ہے میرا لال کہیں ہیں فاطمہ پکار پکار

بدن نازنیں پہ اُس کے تاج لگے تیغ ستم کے وار پہ وار
ہے وہ گیسو بر چھی کے جھتا جن کو دھوتی تھی میں سنوار سنوار

رخصت :۔ بعض مرثیوں میں سودا نے درد انگیز اور غمناک الفاظ میں رخصت کا منظر پیش کیا ہے۔ دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ شدید گرمی کا موسم ہے۔ حرم کے تمام افراد کا پیاس سے بُرا حال ہے مقام کوششوں کے باوجود جب پانی فراہم نہیں ہو سکتا تو حضرت عباس حضرت حسین سے رخصت طلب کرتے ہیں تاکہ پیاسے مرتے ہوئے بچوں اور عورتوں کے لیے پانی لا سکیں۔ اس واقعہ کو سودا کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے ؎

طلب کی رخصت آ بھائی سے کر میدان کی تیاری
کیا عرض اب جسے چاہو اُسے سونپو علمداری
بہی آتی ہے دل میں لہر سن عورات کی زاری
دیا سر یا تو میں دریا پہ جا یا مشک بھر لایا

سُنا عباس سے جب اس کو شاہ دین و دنیا نے
کروروں در کروروں اشک آنکھوں سے لگے آنے
کہا جانِ برادر اپنے جیتے جی نہ دوں جانے
کہے گی خلق سر بھائی کا آگے دے کے کٹوایا

غرض رخصت پہ یکدیگر میں یہ الحاح و زاری تھی
کبھو جوں ابر کے باہم منہ پہ منہ رکھ اشکباری تھی
کبھو مانند برق آپس میں ان کو بے قراری تھی
مرخص اس طرح سالار دیں نے اس کو فرمایا

آمد۔ اگرچہ یہ بہت اہم موضوع ہے۔ لیکن سوداؔ کے آمد کے مضامین بہت کم ملتے ہیں۔ حضرتِ عباس گھوڑے پر سوار ہو کر دریا کا رخ کرتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی دشمن کی فوج صف آرا ہو جاتی ہے۔ سوداؔ لکھتے ہیں ؎

چلا عباس جب قربوس زین پر مشک کو دھر کر
تو لائے روبہ میداں کا فر اس کے قصد پر اکثر
رکھا جن نے قدم تک آگے اپنا چھوڑ کر لشکر
جہنم کو اُسے دو ہیں اجل کے ہاتھ بھجوایا
جگہ سے اپنی کوئی خوف کے مارے نہ ہلتا تھا
چلے تھا نیزہ اس حِلے سے جہاں سے تیر چلتا تھا

اگرچہ یہ بند آمد کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔ لیکن مراثی سوداؔ میں اس سے بہتر اور کوئی مثال نہیں ملتی۔

رجز:۔ رجز کے مضامین سوداؔ کے ہاں بالکل نہیں ملتے۔

جنگ:۔ سوداؔ کو رزمیہ لکھنے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ جس کا ثبوت وہ قصیدہ ہے جو نواب شجاع الدولہ بہادر کی شان میں کہا گیا ہے۔ اس قصیدے میں سوداؔ نے جنگ کا مکمل نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں اور نواب شجاع الدولہ میں جنگ ہوئی۔ جس میں حافظ رحمت خاں مارے گئے تھے۔ سوداؔ نے ایک قصیدے میں اس جنگ کے حالات اس طرح بیان کئے ہیں کہ یہ قصیدہ اردو کا بہترین رزمیہ ہو گیا ہے۔ شکست خوردہ فوج کا ایک سپاہی جنگ کے حالات سنا رہا ہے ؎

تھی سامنے ہمارے جو فوج ادھر اولی ۔۔۔ ہوں گے وہ دس ہزار تلک پیادہ و سوار
سنتے ہیں اب ہر ایک سے اس فوج کی بہی ۔۔۔ سرکردہ تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار
ادھر سے بان و رہکلہ و توپ متصل ۔۔۔ پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سرگذار
بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے ۔۔۔ اس پلے پر جہاں سے جزائر کے ہوشے مار
تھی کرتیاں تلنگوں کی مانند لالہ زار ۔۔۔ تھا دود توپ ابر سیاہ تگرگ باد
توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن ۔۔۔ رنجک مثال برق چمکتی تھی بار بار
گجنال مثل رعد کے کڑکے تھی دمبدم ۔۔۔ آواز شتر نال تھی طاؤس کی جھنکار
بارود گولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی ۔۔۔ جن نے کہ قوم عاد اڑائی تھی جوں غبار

ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو
گھوڑا ادھر پڑا تڑپے ہے ادھر پڑا اسوار

لیکن سوداؔ نے مرثیوں میں اس طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ اسی لیے شبلی نے مرثیوں میں "رزمیہ" کی جدت کا سہرا انیس ؔو دبیرؔ کے سر باندھا ہے۔ حالانکہ خود سوداؔ کے مرثیوں میں رزمیہ کے ابتدائی نقوش مل جاتے ہیں۔ حضرت عباس فرات

سے مشک بھر چکے ہیں۔ اور اب اہل بیت کے خیموں کی طرف آنا چاہتے ہیں کہ دشمنوں نے انھیں گھیر لیا۔ اور جنگ کی نوبت آگئی۔ سودا نے حضرت عباس اور دشمنوں کی جنگ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

نہ مانا جب تو پیٹھا فوج میں وہ اشجع عالم — لگی تب صف بہ صف لشکر کی ہونے درہم و برہم
جدھر کو رخ کیا کشتوں کے پشتے واں ہوئے اس دم — ادھر خون کے بہے نالے جدھر اس کا پڑا سایا

کہوں کیا جس طرح چھایا ابر آہن کا اس جا پر — سناں پر تیغ برسے تھی پڑی اور تیغ پر خنجر
نہ جانے آہ واویلا کہ اس میں کن نے واں آکر — حوالے تیغ کی اس کے کہ دست چپ لٹک آیا

بعد کے مرثیہ نگاروں نے اہل بیت کے گھوڑوں، تلواروں، نیزوں اور دوسرے اسلحہ جنگ کی تعریف میں جو زور بیان صرف کیا ہے اُس کی مثال کسی اور صنفِ سخن میں نہیں ملتی۔ اردو قصیدوں میں اس قسم کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ اس جوشِ بیاں، فنی مہارت اور جزئیات نگاری سے محروم ہیں۔ سودا کے قصیدوں میں بھی اس قسم کے بیشتر مضامین ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ممدوحین کے آلاتِ حرب مثلاً تیر، کمان، گھوڑا، ہاتھی، تلوار وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر کے قصیدے میں سودا کہتے ہیں ؎

سیدؔ میں کیا بیاں کروں تیری کماں کا زور — سینہ عدو کا توڑ کے نکلے ہے جب خدنگ
بیٹھے زمیں پر تو اسے پھر نہ پایئے — گر سو کروڑ کوس تلک کھودیے سرنگ
خلقت کا بر و بحر کی ہیبت سے ہو یہ حال — شمشیر گر علم کرے اپنی تو روزِ جنگ
ویسے نہ دے صفائے برش اس کی تیغ کی — باقی کسو ہی طرح سے صنّاریہ کے دل میں زنگ
گر پشت آسماں پہ وہ آئے تو بہرِ حکم
ہو خرق والتیام فلک دیکھ کے دنگ

لیکن مرثیے میں اس قسم کے مضامین نہیں ہیں۔ یہ ضمیر اور ان کے بعد کے مرثیہ گو شعرا کی جدت ہے۔

شہادت:۔ سودا نے جہاں کہیں بھی شہادت کے مضامین باندھے ہیں۔ بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ کبھی ایک بند اور کبھی صرف ایک شعر ہی پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ چند مرثیوں میں شہادت تفصیل سے بیان کی ہے۔ حضرت امام حسین کی شہادت ملاحظہ ہو ؎

یہ کہہ کے شہِ دیں نے کیا گھوڑے کو رخصت — خیمے کی طرف کو
من بعد نصیب اس کے ہوا جامِ شہادت — از دستِ جفا جو
واں سے جو گیا اسپ سوئے پردۂ عصمت — مل چہرہ میں لہو
پھر کیا کہوں تھا حق ہی اس احوال سے محرم — گذرا جو انھوں پر
آیا جو نظر خانہ زین شاہ سے خالی — میں کیا کہوں اُس آن

وحشت ہوئی اک وحشتِ محشر سے زالی از نالہ وافغاں
خاک اتنی سر و شکل پہ ہر ایک نے ڈالی کر بال پریشاں
پہچانتے تھا کوئی نہ کسی کے تئیں باہم از عترتِ اطہر

حضرت عباس کی شہادت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

جو تھا نبی مشک دانتوں سے تو کی بوچھار تیروں کی لگی چاروں طرف سے ہونے مار امار تیروں کی
ستم کیشوں نے کی پیکاں اپنی پار تیروں کی نہ اس کی مشک سے اک پل میں کر غربال دکھلایا

سبب زخموں کے حالت اس پہ جب طاری ہوئی غش کی مدد کرتے ہوئے کی یا اخا اور کبھی اور کبھی
صدا جو ہیں یہ شاہ کربلا کے کان میں پہنچی بسان ابر گریاں آپ کو اُس پاس پہنچایا

پر اس احوال کو راوی نے یوں اخبار میں لکھا کہ جب تک پہنچے ہی پہنچے سرورِ سینۂ زہرا
بہ طعن نیزہ تن کا گوشت اس کے لے گئے اعدا نشان جز استخوان اس کا نہ شاہِ دیں نے کچھ پایا

کہیں کہیں سوداؔ نے تخیل کی مدد سے شہادت کو اور بھی درد انگیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک مرثیے میں حضرت امام حسین کی شہادت کے وقت اُن کے اور شمر کے خنجر کے مکالمے لکھے ہیں ؎

قضا کی تیغ کا جب سب کو کھا چکا جوہر رہا نہ اُس شہِ مظلوم کا کوئی یاور
زبان نکال کے بولا یہ شمر کا خنجر کہ میں ہی اب تو ہوں اک آشنا ترے دم کا

کہے جو تو تجھے جد کے کنے میں لے جاؤں جو مرضی ہووے تو والد کے پاس پہنچاؤں
ترا انجی جو ہے کہ اس کے ساتھ ملواؤں ملاپ چاہے جو تو اس شہِ مکرم کا

سخن یہ سُن کے لگا کہنے وہ شہِ آفاق الھوں کا دل کہے اس قدر نہیں ہے فراق
رضائے حق کی ملاقات کا ہوں میں مشتاق جو ہووے ایسے میں تو ہو ملاپ باہم کا

بین:۔ یہ سوداؔ کا اصل میدان ہے۔ ان کے مرثیے صرف بین ہیں۔ جن کا مقصد لوگوں کو واقعاتِ کربلا یاد دلا کر رلانا ہے۔ سوداؔ نے تشبیہات و استعارات کا سہارا لے کر ان واقعات کو شدید درد انگیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اثر انگیزی میں یہ بین میرؔ اور سوداؔ کے بعد کے مرثیہ گو شعرا کے مرثیوں سے کم ہیں۔ سوداؔ نے عام طور پر اہل حرم کے مصائب کو موضوع سخن بنایا ہے۔ حضرت امام حسین، حضرت عباس وغیرہ کی شہادت پر بھی اظہار افسوس و غم کیا گیا ہے۔ لیکن نسبتاً کم۔ حضرت امام حسین کی شہادت پر بین ان الفاظ میں کیا گیا ہے ؎

کریں نہ اہلِ جہاں کس طرح شیون و شین — سروں کو اپنے نہ پیٹے سو کیوں وہ کر کے بین
ہوا ہے آج کے دن قتل کربلا میں حسین — یہ تعزیہ ہے رموزِ خدا کے محرم کا

بڑا کیا تھا محمدؐ نے جس کو گود میں پال — پھرے تھا ساقیِ کوثر کے دوش پر مہ و سال
گیا جہاں سے پیاسا وہ فاطمہ کا لال — عطش ہے تن سے ہوئی روح کی سبب دم کا

ایک مرثیے میں سوداؔ حضرت عابد کی زبانی ان اندوہناک واقعات پر بین کرتے ہیں ؎

عابد بین کہتے ہیں اے پروردگار — ایک بھائی کو بھی رکھتا روزگار
یکدگر اس وقت ہوتے غمگسار — رونے آپس میں لگتے زار زار

بے برادر نا پدر عم ابنِ عم — غرق لوہو میں پڑے ہیں یک قلم
بیٹھ گئی دریائے خوں میں ہے ستم — کشتیٔ آلِ نبی آ منجھدار

جا پچھلنے بر لبِ آبِ فرات — آب کی خاطر کیا قطع حیات
باپ کے سقے نے کٹائے پاؤں ہات — پانی کی تو بھی نہ پہنچی منہ میں دھار

باپ کو میرے محل یک زماں — دیکھتے تنہا نہ زیرِ آسماں
ذبح کر ڈالا یہ بیکس کر کے واں — جس جگہ کوئی نہ یاد رہے نہ یار

بین دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو اہلِ بیت میں سے کسی فرد کی شہادت پر اس کے اعزہ بین کرتے ہیں اور دوسرے عام مخلوق یعنی حیوانات، جمادات اور نباتات بین کرتے ہیں۔ سوداؔ کے ہاں بین کی دونوں قسمیں موجود ہیں۔ اگرچہ دوسری قسم کی مثالیں بہت کم ہیں۔ ایک مرثیے کے ابتدائی تین بند ملاحظہ ہوں ؎

میں تم سے کیا کہوں یارو یہ کیا سحر ہے آج — کہ زیرِ چرخ جسے دیکھو چشم تر ہے آج
ہر ایک سمت جہاں میں یہی خبر ہے آج — سوم نبی کے جگر کا نگر نگر ہے آج

جو پھول باغ میں ہیں آج سو ہیں اس کے پھول — ہے نرگس آج پیالے کا ارگجی کے اصول
صلوٰۃ بھیجے ہے بوٹی بھی اس پہ ہو کے ملول — چمن میں جو کوئی بلبل ہے نوحہ گر ہے آج

رُوئے ہے سنگ سے سر مار آبشارِ چمن — جگر کے خون سے لبریز ہے کلی کا دہن
سوائے نالہ نہیں باغباں کے لب پہ سخن — ثمر نہالِ محمدؐ کا خاک پر ہے آج

دعا:- عام طور پر مرثیے کے آخر میں مرثیہ گو خدا سے دعا مانگتا ہے۔ بعد کے مرثیہ نگاروں کے اکثر مرثیے دعا پر ختم ہوتے ہیں۔ سودا ایک مرثیے کا اختتام اس طرح کرتے ہیں ؎

اس ارادے پہ تو کر اے سودا یہ کلام کہ تجھ کو حشر میں بخشئے وہ مظلوم امام
شام سے صبح تلک صبح سے لے کر تا شام سُن کے عالم میں اسے عالمیاں روتے ہیں

ان اجزائے ترکیبی کے علاوہ بھی اور بہت سے موضوعات ہیں۔ جو مرثیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں اہل حرم کے مصائب، حضرت عابد کی بیماری اور دشمنوں کے اُن پر ظلم و ستم، حضرت قاسم کی شادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان موضوعات پر جو کچھ مرثیہ گو شعرا نے کہا ہے۔ اُن میں سے بیشتر کی تصدیق تاریخ سے نہیں ہوتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر کے ذہن اور تخیل کی پیداوار ہیں۔ شاعر نے ایک معمولی سی بات پر واقعات کی ایک پوری عمارت تعمیر کر لی ہے۔ چونکہ اردو شاعر عرب کی اور خاص طور پر پہلی صدی ہجری کے عرب کی تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے۔ اس لیے مرثیے کے تمام افراد اپنے لباس، طور طریق اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ہندوستانی ہیں۔ ان کے اسلحۂ جنگ بھی اکثر وہی ہیں۔ جو اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں تھے۔ خود سودا بھی اس عیب کے شکار ہیں۔ انھوں نے حضرت قاسم کی شادی پر بہت مرثیے کہے ہیں۔ ان مرثیوں میں شادی کی جتنی رسوم بیان کی گئی ہیں۔ وہ سو فیصدی ہندوستانی ہیں۔ مثلاً مشاطہ کا رقعہ نسبت لانا، دلہن کے مہندی لگانا، منگنی کا نشان آنا، ساچق، چوتھی، شادی پر شہنائی کا بجنا، آتش بازی، آرسی مصحف اور پان کھانا وغیرہ۔

سودا نے بعض مرثیوں میں جدت سے کام لیا ہے۔ مثلاً ان کا ایک مرثیہ "محرم کی چاند رات" پر ہے۔ پندرہ اشعار کے اس مرثیے میں وہ تاثرات پیش کیے گئے ہیں جو ہر سال محرم کی چاند رات کو دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک اور مرثیے میں مسلمان اور ایک نصاریٰ کے مکالمے قلم بند کیے ہیں۔ جن میں نصاریٰ کربلا کے واقعات یاد دلا کر مسلمان کو شرم دلاتا ہے۔ اور شکر ادا کرتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں۔ ورنہ وہ بھی ایسی عظیم ہستیوں پر ظلم کرتا۔ ایک مرثیے میں حضرت امام حسین کی لاش اپنے اعزہ کو وصیت کرتی ہے۔ اور کربلا کے واقعات پر تبصرہ کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سودا کا کوئی مرثیہ ایسا نہیں ہے۔ جو مرثیے کے اجزائے ترکیبی پر پورا اترتا ہو۔ لیکن یہ عیب صرف سودا کا نہیں تمام مرثیہ گو شعرا کا ہے۔ انیس اور دبیر بھی ان اجزا کی پابندی نہیں کرتے۔ اس لیے چند مرثیوں کے علاوہ ان کے بھی تمام مرثیے اس عیب سے پاک نہیں۔

مرثیہ نگاری کے ارتقا میں سودا کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے تمہید، سراپا وغیرہ کا باقاعدہ آغاز کیا۔ "رزمیہ" کے ابتدائی نقوش انھیں کے مرثیوں میں ملتے ہیں۔ مرثیہ کو مسدس کی شکل میں مقبول بنایا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سودا سے قبل یہ فن ایسے شاعروں تک محدود تھا کہ ذی علم طبقہ اس پر توجہ نہیں دیتا۔ سودا اور میر تقی میر ہی نے اس فن کو آبرو بخشی۔ اور یہ ثابت کیا کہ ہر مرثیہ گو کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بگڑا شاعر بھی ہو۔

قائمؔ چاند پوری

تصنیف ــــ : پنڈت پدم سنگھ شرما

مترجم ــــ : مسعودہ حیات

پنڈت پدم سنگھ شرما ہندی کے مشہور عالم اور ادیب تھے وہ ضلع بجنور کے ایک گاؤں نایک نگلا کے رہنے والے تھے جو چاند پور سے بھی قریب ہے۔ انھیں اُردو زبان سے بھی خاص تعلق تھا، اگرچہ انھوں نے اُردو میں بہت کم لکھا ہے لیکن وہ اس زبان کے سچے پریمی تھے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ اور اکبر الٰہ آبادی سے بھی اُن کے دوستانہ مراسم تھے، پنڈت جی کے نام ان دونوں بزرگوں کے خطوط بھی ہیں جن میں سے کچھ شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اُس مشترک تہذیب کی نشانی تھے جس کا آج صرف تاریخوں میں تذکرہ رہ گیا ہے۔ وہ مدّتوں ہندی کے ایک مشہور رسالہ "وشال بھارت" کے ایڈیٹر رہے انھوں نے ہندستانی اکادمی الٰہ آباد کے سہ ماہی رسالہ "ہندستانی" میں قائمؔ چاند پوری پر ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ پنڈت جی نے چاند پور کی بعض شخصیات سے جو کچھ معلوم کیا اور کہن سال بزرگوں کی زبانی روایت سے جو اُنھیں حاصل ہوا وہ انھوں نے اس مضمون میں پیش کر دیا ہے۔ بعد کی تحقیق سے اگرچہ بعض نئے گوشے بھی سامنے آئے ہیں اور قائمؔ چاند پوری کے بارے میں کچھ نیا مواد بھی ملا ہے، نیز پرانی غلط فہمیوں کی تردید بھی ہو گئی ہے۔ لیکن آج بھی پنڈت جی کا یہ مضمون بہت اہمیت رکھتا ہے اور قائمؔ چاند پوری پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اس میں بعض نئی باتیں اور بحث کے لیے کچھ نئے اشارات ملتے ہیں۔ میں نے اس مضمون کو ہندی سے ترجمہ کیا اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی اس پر حواشی بھی لکھ دیے۔

مسعودہ حیات

قائمؔ چاند پوری اُردو کے بڑے شاعر تھے۔ شعرائے اُردو کے تقریباً سبھی تذکروں اور تاریخوں میں اُن کا ذکر ملتا ہے۔ اور سب نے قائمؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کی تعریف اور اُن کی استادانہ حیثیت کا کھُلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ بعض نے تو انھیں مرزا سوداؔ اور

میر تقی میرؔ سے بھی بڑا شاعر مانا ہے اور ان کا ہم پلہ تو تقریباً سبھی نے تسلیم کیا ہے۔

اُردو ادب کے سب سے بڑے نقاد اور مؤرخ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی لافانی تصنیف "آبِ حیات" میں سوداؔ کے حال میں لکھا ہے:۔

"یہ صاحبِ کمال (قائمؔ) چاندپور کے رہنے والے تھے مگر فنِ شعر میں کامل تھے۔ اُن کا دیوان ہرگز میرؔ و مرزاؔ کے دیوان سے پیچھے نہیں رکھ سکتے۔ مگر کیا کیجیے کہ قبولِ عام کچھ اور ہے۔ شہرت نہ پائی۔"[1]

قائمؔ کے ہم عصر اُردو شاعروں نے قائمؔ کو میر تقی میرؔ اور مرزا سوداؔ کی صف میں شمار کیا ہے۔ میر باقر حزیںؔ، مرزا جان جاناں کے شاگرد تھے۔ صاحبِ دیوان بھی ہیں۔ سوداؔ نے انھیں بڑے شاعروں میں گنا ہے۔ حزیںؔ نے قائمؔ کے بارے میں اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کیا ہے ؎

داغ ہوں اُن سے اب زمانے میں ۔۔۔ بزم شعراؔ[2] کے جو ہیں صدر نشین

یعنی سوداؔ و میرؔ و قائمؔ و دردؔ ۔۔۔ بے ہدایت سے تا کلیم و حزیںؔ

منشی قدرت اللہ شوقؔ نے (جو سوداؔ اور قائمؔ کے ہم عصر تھے) اپنے تذکرہ "طبقات الشعرا" میں لکھا ہے ؎

اے شوقؔ تیرے شعر کی اب تو پڑی ہے دھوم

سوداؔ و میرؔ و قائمؔ و دردؔ و آثمؔ تلک

مشہور شاعر مصحفیؔ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے:۔

"پختگیٔ کلام و چستگیٔ مصرع غزل در قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استاد راہ می رفت بلکہ در بعض مقام رجحان می جست۔"[3]

یعنی قائمؔ کا کلام اپنے زمانے کے شاعروں کی طرح چست اور پختہ ہے۔ غزل قصیدہ اور مثنوی میں اپنے اُستاد سوداؔ کے شانہ بہ شانہ چلتے ہیں بلکہ بعض مقامات پر اُن سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔

مصحفیؔ کی اس رائے پر نواب مصطفےٰ خان شیفتہؔ کو اعتراض ہے وہ قائمؔ کو سوداؔ کے برابر نہیں مانتے پھر بھی انھوں نے اپنے تذکرہ "گلشن بے خار" میں قائمؔ کو "خوش گفتار" اور "بلند پایہ" شاعر مانا ہے۔ قائمؔ کے قطعات اور رباعیوں کی شیفتہؔ نے تعریف کی ہے اور اُن کی قوتِ شاعرانہ کو بھی سراہا ہے۔ کمال نے اپنے تذکرہ "مجمع الانتخاب"[4] جو وفات قائمؔ کے دس برس بعد لکھا

---

[1] آبِ حیات طبع ہشتم / ۱۵۶

[2] غالباً شعرا بروزن فعل نظم کردیا ہے!

[3] تذکرہ ہندی / ۱۷۹ (لیکن عبارت میں اختلاف ہے)

[4] تذکرہ تلخیص مجمع الانتخاب ۔۔۔ از نثار احمد فاروقی مشمولہ "تین تذکرے" / ۹۷

گیا ہے قائم کی اکثر تعریف کی ہے وہ لکھتا ہے کہ سودا کے سوا جو ہندی مسلمانوں کا مقبول شاعر ہے وہ (قائم) سب سے بڑھا ہوا ہے[1] منشی کریم الدین نے اپنے تذکرے میں قائم کے بارے میں لکھا ہے :۔

"عجب طرح کا شاعر خوش گفتار ہے اس کی برابری اچھے اچھے شاعر نہیں کر سکتے کیونکہ وہ شخص (قائم) اس رتبہ کا ہے کہ دیوان دیکھنے سے اس کی قدر کھلتی ہے بعض آدمی جو اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں حق یہ ہے کہ وہ سچے ہیں اور بعض کم مایہ اور بے استعداد جو اس کو برابر سودا کے کہتے ہیں خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ آگ رشک میں جلتے ہیں کیونکہ مثل اس کے شعر نہیں کہہ سکتے، خصوصاً قطعات اور رباعیات ایسی ہیں کہ باریک بین آدمیوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں جب اس کو مطالعہ کرتے ہیں۔"[2]

مرزا علی لطف نے "گلشن ہند" میں لکھا ہے۔

"نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے..... سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔"[3]

شاعروں کے مراتب کا تعین ہمیشہ بحث طلب رہا ہے بڑے شاعر کے بارے میں اس قسم کا اختلاف رائے تو ہمیشہ رہتا ہی ہے۔ اختلاف مذاق کی وجہ سے کوئی کسی شاعر کو بڑا کہتا ہے اور کوئی کسی شاعر کو۔ مسلمہ طور سے اعلیٰ درجے کے اور عظیم شاعر تو دنیا میں دو چار ہی ہوں گے۔ ہاں کسی کے بڑا شاعر ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ نقادوں نے اس کا شمار اچھے شاعروں میں کیا ہو۔ بغیر اختلاف کے چھوٹے بڑے کا فیصلہ تو ہو ہی نہیں سکتا اس لیے قائم چاہے سودا کی برابری کے ہوں یا کسی صورت میں اُن سے بڑھ گئے ہوں یا سودا کے بعد ان کا شمار کیا جائے لیکن یہ بات عام طور سے متقدمین و متاخرین نے تسلیم کی ہے کہ قائم بڑا شاعر ہے۔ اردو شاعری کو خوبصورت سانچے میں ڈھالنے والے اور گلشن شاعری کو بھدے اور بھونڈے الفاظ کے خس و خاشاک سے پاک کرنے والے چند لوگوں میں سے ایک قائم بھی ہیں۔ اُردو زبان اور شاعری پر اُن کا ناقابلِ فراموش احسان ہے۔ قائم نے اردو شاعری پر اپنے احسان کا ذکر ایک شعر میں بھی کیا ہے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

اور اُردو کے سبھی نقادوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔

---

[1] حوالہ ماسبق/

[2] یہ چوٹ شیفتہ کی اس رائے پر ہے۔ بعض ناشناسان سخن بہ مکانت سودا و شمارند شک در دیوانگی شان از جنون است۔

[3] گلشن ہند (طبع ۱۹۰۶ء) / ۱۴۳

سودا اور قائم

کچھ نظمیں ایسی ہیں جو سودا اور قائم دونوں کے دیوان میں شامل ہیں ـــــ ازاں جملہ ایک مثنوی "در ہجوِ موسم سرما" سودا کے کلیات میں شامل ہے۔ میر حسن[1] اور لطف[2] نے اپنے تذکروں میں اسے قائم سے موسوم کیا ہے اس پر مولوی عبدالحق نے "مخزن نکات" کے مقدمہ میں لکھا ہے "موسم سرما کی ہجو میں جو مثنوی ہے اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

دونوں کے کلیات میں بے کم و کاست درج ہے۔ لیکن یہ نظم غالباً سودا کی ہے کیونکہ اسی کے ساتھ کی دوسری مثنوی موسم گرما کی ہجو میں موجود ہے۔ لیکن میر حسن کے تذکرہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے قائم ہی کی خیال کرتے ہیں ایک اور طویل عشقیہ مثنوی جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

الٰہی شعلہ زن کر آتش دل
تپ دل دے بقدر خواہش دل

لطف یہ ہے کہ مثنویوں کے آخر میں سودا کے کلیات میں سودا کا اور قائم کے کلیات میں قائم کا تخلص موجود ہے۔ اس سے صحیح فیصلہ کرنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارا قیاس یہ ہے کہ یہ مثنوی قائم ہی کی ہے[3] جو غلطی سے سودا کے کلیات میں درج ہو گئی ہے۔ اسی طرح اور کئی مثنویاں جن میں چھوٹے چھوٹے قصے اور حکایتیں منظوم کی ہیں دونوں کے کلام میں مشترک پائی جاتی ہیں۔"

مولوی عبدالحق صاحب نے اس فیصلے میں دونوں کی بات رکھ لی ہے اس سے اچھا فیصلہ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن موسم سرما والی مثنوی کو سودا کی تصنیف بنانے کی جو دلیل دی گئی ہے وہ کچھ وزن نہیں رکھتی۔ کیا ضرور ہے کہ اگر سودا نے موسم گرما کی ہجو میں مثنوی لکھی تھی تو وہ ہجو موسم سرما بھی لازماً لکھیں۔ جب میر حسن اور لطف نے موسم سرما کی مثنوی قائم کے نام سے پیش کی ہے تو وہ قائم ہی کی کیوں نہ تسلیم کی جائے۔ کثرت رائے تو قائم ہی کے حق میں ہے۔ بہر حال یہ مثنوی کسی کی بھی ہو لیکن اس سے اس بات کی تصدیق ضرور ہوتی ہے کہ قائم شاعری میں سودا کی مماثل تھے کیونکہ قائم کے اشعار جب سودا کے کلام میں اس طرح خلط ملط ہو سکتے ہیں کہ تمیز کرنا دشوار ہو جائے تو پھر دونوں کی برابری میں کیا شبہ ہے۔ یوں ظاہر میں کچھ تو فرق رہ ہی جاتا ہے ـــــ یہ مشہور ہے کہ قائم سودا کے شاگرد تھے کئی تذکرہ نگاروں نے اس بات کا ذکر کیا ہے۔ قائم نے اپنے تذکرہ "مخزن نکات" میں سودا کو صاف لفظوں میں استاد نہیں مانا ہے۔ لیکن ان کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے جس سے عزت و احترام

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو/ ۱۲۹ — [2] گلشن ہند/ ۱۳۷

[3] مولوی عبدالحق کی یہ رائے صحیح نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ سب رس حیدرآباد فروری ۱۹۶۰ء اور رسالہ نقوش ۱۹۶۱ء میں نثار احمد فاروقی کا مضمون "مثنویات قائم چاندپوری"۔

ظاہر ہوتا ہے۔ قائمؔ نے اس شعر میں بھی سوداؔ کی اُستادی کا اعتراف کیا ہے۔

قائمؔ میں فیضِ حضرت سوداؔ ہے ورنہ میں
طرحِ غزل سے میرؔ کی آتا تھا بر کہیں

آزاد نے "آبِ حیات" میں لکھا ہے:۔

"یہ اوّل شاہ ہدایت کے شاگرد ہوئے اُن سے ایسی بگڑی کہ ہجو کہی۔ تعجب یہ کہ شاہ موصوف باوجودیکہ حد سے زیادہ خاکساری طبیعت میں رکھتے تھے مگر انھوں نے بھی ایک قطعہ اُن کے حق میں کہا۔ پھر خواجہ میر دردؔ کے شاگرد ہوئے۔ ان کے حق میں بھی کچھ سُن کر الگ ہوئے پھر مرزا سوداؔ کی خدمت میں آئے اور ان سے بھی پھرے مرزا تو مرزا تھے انھوں نے سیدھا کیا[1]۔"

سوداؔ نے قائمؔ کو کس طرح سیدھا کیا آزاد نے اس بارے میں لکھا ہے:۔

"ہجوؤں میں ایک ساقی نامہ ہے جس میں فوقی شاعر کی ہجو ہے۔ اصل میں قیام الدین (قائمؔ) کی ہجو میں تھا وہ بزرگ باوجود شاگردی کے مرزا سے منحرف ہو گئے تھے۔ جب یہ ساقی نامہ لکھا گیا تو گھبرائے اور آ کر خطا معاف کروائی۔ مرزا نے ان کا نام نکال ڈالا اور فوقی ایک فرضی شخص کا نام ڈال دیا[2]۔"

شاعروں میں اُستادی اور شاگردی کی روایت

قائمؔ اور سوداؔ میں نوک جھونک ضرور ہوئی تھی۔ شاعروں کی قوم میں استاد شاگردوں کی ہمیشہ بگڑتی آئی ہے۔ قائمؔ نے سوداؔ کی بے شک ہجو کی تھی اور کیوں نہ کرتے۔ آخر سوداؔ ہی کے شاگرد تھے۔ یہ ہُنر انھوں نے سوداؔ ہی سے سیکھا تھا وہی انھوں نے اُستاد کی نذر کر دیا۔ جواب میں سوداؔ نے جو قائمؔ کو صلہ دیا وہ "فوقی نامہ" ہے جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے کیا ہے۔ یہ "کلیاتِ سوداؔ" میں صفحات ۲۰۴ سے ۲۰۸ تک شامل ہے۔

فوقی نامہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قائمؔ نے اپنی کسی نظم میں خود کو شیر اور دوسرے شاعروں کو بکری بتا کر ڈوں کی لی تھی۔ اس کا جواب سوداؔ نے فوقی نامہ کی صورت میں لکھا افسوس ہے کہ قائمؔ کی وہ تحریر یہ نظم نہیں ملتی۔ شاید قائمؔ کے کلیات میں ہو جو ابھی تک نہیں چھپا ہے[3]۔ اور کسی تذکرہ نویس نے بھی اسے نقل نہیں کیا۔ "فوقی نامہ" کے متعلق یہ روایت صرف آزاد ہی نے بیان کی ہے اور یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ فوقی نامہ میں سوداؔ نے فوقی کو طالبؔ آملی کا مقلد اور مضمون چور

---

[1] آبِ حیات/۱۵۶ [2] آبِ حیات/۱۵۶

[3] یہ نظم کلیاتِ قائمؔ کے کسی قلمی نسخے میں بھی شامل نہیں ہے (مترجم)

کہہ کر اس کی ہجو کی ہے۔ فوقی کے دیوان کو ظاہری اور معنوی اعتبار سے کمتر بتلاتے ہوئے سودا کہتے ہیں۔

سو بھی اس میں اک غـزل ایسی نہیں
چار بیتیں جس میں طالب کی نہیں

یعنی اک تو ذرا سا دیوان اور اس میں بھی کوئی غزل ایسی نہیں جس میں چار شعر طالب کے نہ ہوں۔ یعنی ہر غزل میں طالب کا کوئی نہ کوئی مضمون اُڑایا ہے۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اکثر مشہور اُردو شاعروں کے بارے میں یہ اشارہ کر دیا ہے کہ یہ کس فارسی شاعر کے رنگ میں لکھتے ہیں یا کس کے مقلد ہیں۔ میر درد کی بابت لکھا ہے کہ ان کی شاعری حافظ کی شاعری کی طرح شیریں ہے[1]۔ قائم کے بارے میں لکھا ہے

طرزش بہ طرز آملی می ماند[2]

یعنی قائم کا طرز طالب آملی سے مشابہ ہے۔

جو شاعر جس شاعر کی تقلید کرتا ہے اس کے جذبات، الفاظ اور مطالب غیر ارادی طور پر اس کے ہاں آہی جاتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے سودا نے اوپر کے مصرع میں قائم پر چوٹ کی ہے۔

اگر فوقی یا قائم کی وہ نظمیں دستیاب ہو جائیں تو سودا کے فوقی نامہ اور اس کے اعتراضات پر کوئی متوازن رائے دی جا سکتی تھی۔ "فوقی نامہ" کے واقعہ پر کسی تذکرہ نگار نے روشنی نہیں ڈالی۔ معلوم نہیں قائم کی وہ شیر اور بکری والی کونسی نظم تھی جس پر سودا نے اتنی لے دے کی ہے سودا کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شیر اور بکری والی فخریہ نظم میں کل سات شعر تھے جیسا کہ سودا نے جوابی نظم کے آخری حصہ میں لکھا ہے

سُن چکے احوال ساتوں شعر کا

وہ ساتوں شعر کہیں ملیں تو سودا کی اس ہجو کا حال معلوم ہو جائے۔ اب تو وہ ایک پہیلی سی ہے۔ قائم نے سودا کی ہجو میں اور کیا کہا تھا وہ بھی نہیں ملتا۔ صرف ایک شعر ملا ہے وہ بھی قائم کے خاندان کے منشی محمد حسین صاحب کی زبانی سُنا ہے۔ کہیں لکھا نہیں دیکھا۔

ڈال دے سودا کے آگے قائم اک ٹوٹی سی کفش
بحث کو اس کی تری بیزار منہ کھولے رہے

ہجو گوئی

ہجو گوئی بھی اردو شاعری کا ایک حصہ ہے۔ ہجو کہنے میں سودا سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور اس فن کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو/ ۶۶ [2] ایضاً/ ۱۲۸

مخزن نکات کے مقدمہ میں مولوی عبدالحق صاحب کہتے ہیں۔

"ہجو کہنے اور فحش بکنے میں وہ (قائم) اپنے اُستاد سودا کے ہم پلہ تھے۔"

اس سلسلہ میں آزاد نے ایک جگہ آبِ حیات میں لکھا ہے:۔

"اس لکھنے سے اظہار مجھے اس امر کا منظور ہے کہ ہجو ہماری نظم کی ایک خار دار شاخ ہے جس کے پھل سے پھول تک بے لطفی بھری ہے۔ اور اپنی زبان اور دہقان دونوں کی کثافت طبع پر دلالت کرتی ہے چنانچہ اس میں بھی مرزا رفیع مرحوم سب سے زیادہ بدنام ہیں لیکن حق یہ ہے کہ ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا۔ باعث اس کا فقط شوخی طبع یا کوئی عارضی جوش ناراضگی کا ہوتا تھا اور مادۂ کثافت فقط اتنا ہوتا تھا کہ جب الفاظ کاغذ پر آجاتے تھے تو دل صاف ہو جاتا تھا۔ ہمارا زمانہ ایسے مہذب اور شائستہ لوگوں سے آراستہ ہے کہ لفظ ہجو کو گالی سمجھتے ہیں مگر دلوں کا مالک اللہ ہے۔"

پہلے شاعر چاہے زبان کے گندے ہوں مگر دل کے صاف ہوتے تھے آزاد کے قول کے مطابق قائم کی سب ہی سے بگڑی۔ شاہ ہدایت اللہ درد اور سودا سب سے ان کی کھٹکی رہی لیکن مخزن نکات میں ان سب کو انھوں نے بڑے ہی احترام اور عزت سے بھرے ہوئے القاب سے یاد کیا ہے۔ کہیں ذرا بھی دلی کدورت کی بُو نہیں آنے دی۔ اکبر نے سچ کہا ہے ۔

بدی طینت کی چھپ سکتی نہیں شیریں زبانی سے
دل اچھا ہو تو نبھ جاتی ہے شاید بد زباں ہو کر

قائم نے اپنے تذکرہ مخزن نکات میں مرزا سودا کا جہاں ذکر کیا ہے بڑے ادب سے نام لیا ہے۔ سودا کے باب میں تعریف کے پل باندھے ہیں اور بھی جہاں کہیں تذکرے میں سودا کا نام آگیا ہے "حضرتم مرزا رفیع صاحب" "حضرتم مرزا محمد رفیع سودا سلمہ اللہ تعالےٰ" وغیرہ احترام و عزت کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ مخزن نکات پڑھ کر تو اس بات کا ذرا بھی پتہ نہیں چلتا ہے کہ ان دونوں میں کسی طرح کی کوئی رنجش تھی آزاد نے ان لوگوں کے بارے میں جو لکھا ہے بالکل سچ ہے کہ جب الفاظ کاغذ پر آجاتے تھے دل صاف ہو جاتا تھا۔

قائم کی جائے پیدائش

قائم کی جائے پیدائش جیسا کہ چاندپوری کی نسبتِ مکانی سے ظاہر ہے چاندپور ہے۔ چاندپور ضلع بجنور کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ غدر کے بعد بہت دنوں تک یہاں تحصیل تھی اب کئی سال سے تحصیل تو نہیں رہی پر ریلوے کا اسٹیشن ہونے سے منڈی رونق پر ہے۔ گُڑ اور غلے کی تجارت خوب ہوتی ہے۔ منگل اور جمعہ کو بہت بڑی پینٹھ لگتی ہے۔ باشندوں میں بنئے مالدار اور تعلیم یافتہ ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ غدر میں مسلمان رئیسوں کی جائدادیں ضبط ہو گئیں

قصبیں اس وقت سے اُن کی حالت سقیم ہے۔ چاند پور میں ایک تحصیلی مڈل اسکول ہے اور ایک انگریزی بنیادی تعلیم کا اسکول بھی کچھ دنوں سے چندے کے ذریعہ چل رہا ہے ایک سنسکرت پاٹھ شالہ بھی ہے۔ چاند پور ای۔ آئی۔ آر اسٹیشن[1] ہے۔ اسٹیشن کا نام "چاند پور سیاؤ" ہے، مراد آباد سے دلی کو جو، ای۔ آئی۔ آر کی بڑی لائن گئی ہے اس کے گجرولہ جنکشن سے ایک چھوٹی لائن نکلی ہے جو چاند پور سے بجنور ہوتی ہوئی نجیب آباد جنکشن پر (ای۔ آئی۔ آر کی مراد آباد سے ہردوار جانے والی لائن پر) جا ملی ہے۔

پرانے تذکرہ نویسوں میں کسی نے چاند پور ندینہ یا نگینہ لکھا ہے کسی نے سنبھل مراد آباد سے چاند پور کا رشتہ قائم کیا ہے۔ نگینہ ضلع بجنور کی ایک تحصیل ہے جو آبنوس کے لکڑی کے کام کی وجہ سے مشہور ہے لیکن سنبھل کا چاند پور کے ساتھ آج کل کوئی رشتہ نہیں ہے ممکن ہے پہلے شاہی زمانے میں چاند پور سنبھل کی سرکار میں شامل رہا ہو اب تو سنبھل ضلع مراد آباد کی ایک تحصیل ہے۔ مراد آباد اور بجنور ضلع کی حدیں ملی ہوئی ہیں سنبھل ایک پرانا اور مشہور مقام ہے۔ مہاراجہ پرتھوی راج سے بھی سنبھل کا ناطہ رشتہ کہا جاتا ہے۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں بھی سنبھل سلطنت کا صدر مقام تھا۔ "آئین اکبری" میں اور "ملا بدایونی" نے اپنی کتاب میں سنبھل کی سرکار کا تذکرہ کیا ہے۔ سنبھل کی اس پرانی شہرت کی وجہ سے ممکن ہے کہ پرانے مصنفوں نے چاند پور کے ساتھ اُتنے پتے کے طور پر سنبھل کا نام جوڑ دیا ہو بہر حال موجودہ چاند پور کا سنبھل سے کوئی دور دراز کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ نگینہ سے تو اتنا تعلق ہے بھی کہ دونوں ایک ہی ضلع کے قصبے ہیں۔ دونوں کا فاصلہ ۲۰ میل سے زیادہ ہے۔

قائم کے اسلاف کا وطن

قائم کا خاندان آج بھی چاند پور میں موجود ہے اور خدا کے فضل سے یہاں کے باعزت شہریوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان میں منشی محمد حسین صاحب پنشنر جن[2] کا شاعری سے خاص ربط رکھتے ہیں اور بہت شریف انسان ہیں۔ قائم کے بارے میں آپ سے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے :-

قائم کے باپ کا نام محمد ہاشم اور دادا کا نام محمد اکرم تھا۔ یہ قوم کے علوی سید تھے بعد کو شیخ قریشی کہلانے لگے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ قائم کے بزرگ دربار شاہی میں باعزت عہدوں پر تھے اس وقت سلطنت کی باگ ڈور زیادہ تر سیدوں کے ہاتھ میں تھی۔ کلیدی عہدوں پر سیدوں کی اکثریت تھی۔ سلطنت کے کسی معاملہ میں کوئی جھگڑا ہوا اور یہ لوگ شاہی غضب کا نشانہ بن کر وہاں سے بھاگے۔ قائم کا خاندان بھی انھیں میں تھا ان لوگوں نے اپنے کو شیخ کہہ کر چھپایا اور دلی چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ دلی سے بھاگ کر پہلے قائم کے بزرگ محدود نامی گاؤں میں آکر آباد ہو گئے۔

"محدود" ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو چاند پور سے چار کوس شمال کی طرف اور مصنف[1] کی جائے پیدائش نایک نگلا

---

[1] اب E.I.R تو ختم ہو گئی۔ یہ ناردرن ریلوے کا اسٹیشن ہے۔ یہ ریلوے لائن آگے جا کر نجیب آباد اور سہارنپور سے مل جاتی ہے (مترجم)

[2] یعنی پنڈت پدم سنگھ شرما، ایڈیٹر وشال بھارت ہندی

گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ محدود میں قائمؔ کے خاندان کی ایک اور شاخ ہے اُن لوگوں کا کہنا ہے کہ قائمؔ کی جائے پیدائش محدود ہی ہے قائمؔ یہیں پیدا ہوئے تھے بعد میں چاند پور چلے گئے تھے ——— محدود میں جو کنواں ہے وہ قائمؔ ہی کا بنوایا ہوا ہے محدود کے آس پاس کے کئی گاؤں میں غازی پور، سدحن پور، کیکر کھجوری، عزیز پور، دیبا جلا پور، وغیرہ میں قائمؔ کے بزرگوں کو شاہی دربار سے زمینیں ملی ہوئی تھیں جو بیچ میں ضبط ہو گئیں اور قائمؔ کی کوشش سے وہ پھر واپس مل گئی تھیں اور غدر تک قائمؔ کی اولاد کے قبضے میں رہیں۔ اب قائمؔ کے خاندان کے جو افراد محدود میں رہتے ہیں وہ کسان ہیں لیکن قائمؔ کے خاندان سے تعلق پر انھیں فخر و غرور ہے۔ قائمؔ کی بھولی بسری کہانیاں اور ان کا نام ابھی تک انھیں یاد ہے میں نے اُن میں ایک شخص سے قائمؔ کے بارے میں پوچھا کہ کیا تم لوگوں کے پاس پرانے کاغذ ایسے ہیں جن سے اُس وقت کی کوئی بات معلوم ہو سکے تو کہنے لگے کہ پہلے بندوبست تک تو ایسے کاغذات موجود تھے اب سب ضائع ہو گئے۔ دیمک اور کیڑے کھا گئے۔ اب تو قائمؔ کی یادگار اک کنواں ہی باقی رہ گیا ہے اور ہم لوگ ہیں جو صرف اُن کے نام لیوا ہیں۔ قائمؔ کے دادا محمد اکرم "محدود" میں رستا کے نام سے مشہور ہیں۔ منشی محمد حسین صاحب پیشکار چاند پوری سے اس عرفیت کا سبب یہ معلوم ہوا کہ محمد اکرم کو دربار شاہی میں ساڑھے تین سو سوار کا منصب حاصل تھا جس سے اُن کا لقب "ساڑھی رستی" پڑ گیا تھا۔ اسی کی ایک شکل رستا ہے۔

قائمؔ یا قیام

اکثر قدیم تذکرہ نگاروں نے تو ان کا نام قائمؔ لکھا ہے لیکن کسی نے قیام بھی لکھا ہے قائمؔ نے مخزن نکات کے شروع اور آخر میں "فقیر مولف محمد قیام الدین قائمؔ" کہہ کر اپنا تعارف کرایا ہے مگر اُن کے خاندان کے افراد جو چاند پور یا محدود میں ہیں اُن کا نام قائمؔ ہی بتلاتے ہیں۔ زمانہ کانپور کے جولائی ۱۹۲۹ء کے شمارے میں راز چاند پوری کا ایک مضمون حضرت قائمؔ چاند پوری کے عنوان سے چھپا ہے انھوں نے اس مضمون میں محمد حسین صاحب کا ایک خط پیش کیا ہے جو راز صاحب کے خط کے جواب میں پیشکار صاحب نے لکھا تھا:۔

> "آپ کا نام محمد قائمؔ تھا۔ بعض تذکروں میں آپ کا نام جو قیام الدین لکھا ہوا ہے وہ غلط ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے والد کا نام محمد ہاشم اور دادا کا نام محمد اکرم تھا نیز آپ کے صاحبزادے کا نام محمد منعم تھا اس صورت میں آپ کا نام قیام الدین کسی طرح نہیں ہو سکتا۔"

اب میرے پوچھنے پر بھی پیشکار صاحب نے یہی بات دہرائی۔ یہ خط پیش کر کے راز صاحب لکھتے ہیں:۔

> "چونکہ تذکروں کی روایات کے مقابلے میں منشی محمد حسین صاحب کا مذکورہ بالا بیان زیادہ قابل قبول ہے لہذا قائمؔ کے نام میں کسی اختلاف کی گنجائش

باقی نہیں رہتی اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ اُن کا نام صرف محمد قائمؔ تھا۔[1] مخزن نکات میں جو قائمؔ نے اپنا نام قیام الدین لکھا ہے اسے پیش کرتے ہوئے اس اختلاف کا تجزیہ راز صاحب اس طرح کرتے ہیں کہ......

"ایک طرف مندرجہ بالا تحریری شہادت مخزن نکات کی موجود ہے اور دوسری جانب محمد حسین صاحب کا اور (محدود دوانوں کا بھی) زندہ بیان دونوں ہی اپنی جگہ قابل قبول ہیں اور ان دونوں بیانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دراصل قائمؔ صاحب کا نام تو محمد قائمؔ ہی تھا مگر بعد میں یا تو خود یا احباب کے کہنے پر انھوں نے اپنے نام میں ایک معنی خیز تبدیلی کر دی تھی کیونکہ محمد قائمؔ کے مقابلے محمد قیام الدین میں معنویت زیادہ ہے اور اس طرح نام کے بعد تخلّص (محمد قائم قائمؔ) کا لانا جو مخلِ فصاحت تھا اس میں بھی خوبی پیدا ہو گئی۔"

راز چاندپوری کا یہ قیاس بھی اس صورت میں صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس سے نام کا یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے۔

خاندان

قائمؔ نے اپنے تذکرہ "مخزن نکات" میں اپنے حال میں باپ، دادا، بھائی یا بیٹے وغیرہ کے نام کا ذکر نہیں کیا۔ نگار اگست ۲۸ء میں ایک مضمون بعنوان (قائمؔ چاندپوری) سعیدی صاحب کا شائع ہوا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں "(قائمؔ کے) والد کا نام کسی فارسی یا اردو کے تذکروں میں نہیں ملا۔ البتہ کتب خانہ انڈیا آفس کی فہرست میں اُن کے والد کا نام (علی) درج ہے"۔ انڈیا آفس کی فہرست میں لکھے ہوئے اس نام کے بارے میں سعیدی صاحب نے اندازہ لگایا ہے کہ ممکن ہے قائمؔ نے مخزن نکات میں اپنے بیان میں باپ کا نام لکھا ہو۔ سعیدی صاحب نے نگار میں جب ۱۹۲۸ء میں یہ مضمون لکھا تھا اس وقت تک "مخزن نکات" چھپا نہیں تھا۔ وہ ۱۹۲۹ء میں چھپا ہے اس میں قائمؔ کے باپ یا دادا کے نام کا ذکر نہیں ہے۔[2] ان کے باپ دادا اور بیٹے کا نام منشی محمد حسین صاحب سے ہی معلوم ہوئے ہیں۔ "زمانہ" کانپور میں شائع ہونے والے خط کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے اُس میں قائمؔ کے دادا کا نام محمد اکرم باپ کا نام

---

[1] یہ کسی طرح درست نہیں کہ قائمؔ کے اپنے بیان پر منشی محمد حسین کے بیان کو ترجیح بلا مرجّح دی جائے۔ قائمؔ نے مخزن نکات میں قیام الدّین ہی لکھا ہے اور بعض معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی۔ دیوان قائمؔ کا جو قلمی نسخہ انڈیا آفس میں ہے بظاہر وہ قائمؔ کی زندگی میں نقل ہوا ہے اس میں محمد قائمؔ لکھا ہوا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دونوں ناموں سے معروف تھے (مترجم)

[2] مطبوعہ مخزن نکات کا متن انڈیا آفس کے قلمی نسخے پر مبنی نہیں ہے یہ آصفیہ لائبریری کا مخطوطہ ہے اور انڈیا آفس کے نسخے میں اس سے بہت سی باتیں زائد ہیں۔ (مترجم)

محمد ہاشم اور بیٹے کا نام محمد منعم بتایا ہے اس کے علاوہ میرے پوچھنے پر اس سلسلے میں انھوں نے کچھ نام بہ اور بتائے ہیں۔ قائمؔ کی بیوی کا نام چاند بی بی تھا۔ محمد منعم کے لڑکے (یعنی قائمؔ کے پوتے) فضل علی اُن کے مہربان علی اور مہربان علی کے منشی محمد حسین پیشکار —— یہ قائمؔ کے بعد اب تک کا یعنی محمد حسین پیشکار کا نسب نامہ ہے۔ منشی محمد حسین قائمؔ کی پانچویں پیڑھی میں ہیں۔

محمد منعم

محمد منعم قائمؔ کے بیٹے تھے جیسا کہ منشی محمد حسین اور ان کی دوسری اولاد (محدود والی شاخ) کے لوگ بھی کہتے ہیں مگر میر حسن نے اپنے تذکرۂ شعرائے اُردو میں منعم کو (منعم تخلص) برادر بزرگ میاں محمد قائمؔ لکھا ہے[1] یعنی منعم قائمؔ کے بڑے بھائی تھے۔ میری نظر جب میر حسن کے اس مضمون پر پڑی تو میں نے منشی محمد حسین صاحب سے لکھ کر پوچھا کہ اس اختلاف کا کیا سبب ہے۔ کونسی بات ٹھیک مانی جائے آپ کی یا میر حسن کی یعنی لڑکے تھے یا بھائی —— اس کے جواب میں پیشکار صاحب (آپ چاند پور میں اسی نام سے مشہور ہیں) نے لکھا ہے: "یہ غلط ہے (یعنی میر حسن کا بھائی لکھنا) منعم بھائی نہیں تھے بلکہ لڑکے تھے میں تو خوب جانتا ہوں۔" (مکتوب مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۳۰ء)

میں مان گیا کہ ضرور منعم لڑکے ہی تھے۔ میر حسن نے بڑا بھائی غلطی سے لکھ دیا ہے۔ اس کے بعد ایک دن میں قائمؔ کا تذکرہ "مخزن نکات" پڑھ رہا تھا اس میں انیسویں صفحہ پر محمد شاکر ناجی کے بیان میں یہ عبارت نظر پڑی۔

"با برادر فقیر کہ منعم تخلص مے کرد و شعر فارسی بسیار بہ تلاش ہائے نیکو می گفت رابطۂ اتحاد مربوط داشت گاہ گاہ بہ غریب خانہ تشریف می آورد بندہ در خورد سالی او را دو سہ بار دیدہ ام"

یعنی میرے بھائی جن کا تخلص منعم ہے اور جو فارسی کے اچھے شاعر ہیں اُن کے ساتھ (ناجی کی) دوستی تھی اور کبھی کبھی میرے مکان پر بھی آتے تھے میں نے بچپن میں اُنھیں دو تین بار دیکھا ہے" اسے دیکھ کر میر حسن کی بات ٹھیک معلوم ہوئی۔

میں نے پیش کار صاحب سے پھر دریافت کیا کہ کیا بات ہے میر حسن سے غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں تو قائمؔ منعم کو خود بھائی لکھ رہے ہیں۔ اس کے جواب میں پیشکار صاحب کا یہ خط ملا۔

"میں نے خوب تحقیق کر لیا ہے واقعی محمد منعم محمد قائمؔ کے لڑکے تھے۔ قائمؔ کے کوئی بھائی نہ تھا جس کو وہ برادر لکھتے بلکہ یہ لفظ پسر ہے غلطی سے کاتب نے برادر لکھ دیا ہے یعنی یہ یوں ہو جاتا ہے۔

"بہ پسر فقیر کہ منعم تخلص میکرد بندہ خود در خورد سالی او را دو سہ بار دیدہ ام"

یعنی شاکر کو خورد سالی میں دیکھا ہے جیسا لڑکوں کا ربط لڑکوں سے ہوتا ہے۔ ایسے ہی وہ بھی قائمؔ کے مکان پر

---

[1] تذکرہ شعرائے اُردو / ۱۴۹

اُن کے لڑکے منعم کے پاس آتے ہوں گے یہی انھوں نے لکھا ہے۔ باقی سب غلط ہے۔ میر حسن نے "مخزن نکات" کی بنیاد پر غلطی کی ہے (مکتوب محمد حسین چاند پوری مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۳۱ء)

کاتب کی غلطی بھی کبھی کبھی بڑا نقصان کر دیتی ہے پسر کا برادر بنا کہ سلسلہ ہی گڑبڑ کر دیا۔[1]

"مخزن نکات کا متن جس قلمی نسخہ پر مبنی ہے وہ معلوم نہیں کس سن میں لکھا تھا۔ یعنی قائم کی زندگی میں لکھا گیا یا اُن کی وفات کے بعد۔ اس کا اظہار مولوی عبدالحق نے بھی اپنے طویل مقدمہ میں کہیں نہیں کیا۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ صرف ایک ہی نسخہ تھا یا اس کی کوئی اور نقل بھی کہیں ملتی ہے۔ صحیح فیصلہ تو اسی صورت میں ممکن ہے جب مخزن نکات کے کئی قلمی نسخے حاصل ہوں۔ انھیں ملا کر دیکھا جائے کہ کسی کاتبوں نے پسر کو برادر لکھنے کی غلطی کی ہے یا کسی نے پسر بھی لکھا ہے بہر حال اب تو پیشکار صاحب کا کہنا ہی صحیح ماننا چاہیئے اُن کے خاندان میں یہی مشہور ہے کہ منعم قائم کے لڑکے تھے اور قائم کے کوئی بھائی ہی نہیں۔"

چاند پور میں آج سے ۲۰-۲۵ سال پہلے ایک بوڑھے بزرگ زندہ تھے جنھوں نے اپنے بچپن میں منعم کو دیکھا تھا۔ ان کا بھی یہی بیان بتاتے ہیں کہ منعم قائم کے لڑکے تھے اس سے ماننا پڑتا ہے کہ مخزن نکات میں کاتب کی غلطی سے ہی پسر کا برادر ہو گیا ہے۔

قائم کا عہد

پرانے زمانے کے شاعروں کی تاریخ پیدائش اور صحیح تاریخ وفات کا تعین اکثر اٹکل اور اندازے کے سہارے پر ہی کیا جاتا ہے پرانے شاعروں نے اپنے بارے میں خود بہت ہی کم لکھا ہے۔ کسی پہلے شاعر کی تاریخ پیدائش کا ذکر کریں تو کس طرح

---

[1] سلسلہ گڑبڑ نہیں کیا، میر حسن ہی کا بیان صحیح ہے، محمد شاکر ناجی قائم سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ قائم نے ان کی خورد سالی کا زمانہ عادم آباد میں دیکھا ہو تو اور بات ہے۔ قائم نے خود محمد منعم کو اپنا بھائی لکھا ہے، اور یہ بظاہر اُن کے بڑے بھائی تھے۔ اسی سبب محمد شاکر ناجی سے ان کا رابطہ دوستی تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قائم اپنے بچپن ہی میں دہلی چلے گئے تھے اور انھوں نے شاکر ناجی، آبرو وغیرہ کا زمانہ دیکھا تھا۔ میر حسن کے الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرہ شعرائے اُردو کی تدوین کے وقت محمد منعم زندہ تھے۔ اس کی تالیف کا زمانہ ۱۱۸۳ھ سے ۱۱۹۱ھ تک ہے۔ قائم کے کسی فرزند کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا۔ صرف ان کی ایک رباعی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا ایک کم سے کم ایک لڑکا تھا جو عالم طفولیت ہی میں مر گیا تھا۔

کس کھیل میں لگ گیا خدا جانے تو ۔۔۔ بیکار پڑے ہیں سب کھلونے تیرے

منشی محمد حسین کا یہ بیان سراسر غلط ہے کہ محمد منعم اُن کے فرزند کا نام تھا بھائی کا نہیں۔ (مترجم)

کریں قیاس سے ہی کام لیتے ہیں۔ اُردو اور فارسی کے شاعروں میں اشعار کے ذریعہ مادہ تاریخ نکالنے کا ایک خاص رواج رہا ہے اس سے کسی کتاب کا زمانہ تصنیف یا کسی کی تاریخ وفات کا پتہ چل جاتا ہے اور اُردو کے اکثر مصنف اپنی کتاب کا نام ایسا ہی منتخب کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ کتاب کس سن میں شائع ہوئی ہے ــــ مولانا شبلی کی شعر العجم ایسا ہی تاریخی نام ہے اسی طرح قائم کے تذکرہ "مخزن نکات" کا نام بھی تاریخی ہے۔ قائم کے ہم عصر خواجہ اکرم نے قائم کے تذکرے کی تعریف میں ایک قطعہ لکھ کر قائم کے پاس بھیجا تھا جس میں مخزن نکات مادۂ تاریخ ہے اور اس سے ۱۱۶۸ھ نکلتا ہے قائم کو یہ قطعہ پسند آگیا اور انھوں نے اپنی کتاب کا نام یہی رکھ دیا۔ قائم نے خواجہ اکرم کے ترجمہ میں (صفحہ ۶۷) اس کا تذکرہ کیا ہے۔

قطعہ

قائم رکھے ہمیشہ خدا تیرے نام کو
کرنے سے ذکر خیر کے ہے موجب بقا
تاریخ اس کتاب کی جب میں نے کی تلاش
رو پیر خرد نے مجھ سے کہا "مخزن نکات"
۱۱۶۸ھ

اس سے قائم کی ایک کتاب کی تصنیف کا سن تو معلوم ہو گیا[1] لیکن خود قائم کی ولادت کا سن کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کس سن میں پیدا ہوئے نہ کسی پرانے تذکرہ میں لکھا ہے .... نہ اب ان کی اولاد ہی کو یاد ہے۔ مرنے کا سن بھی بحث طلب ہے کسی نے ۱۲۰۸ھ کسی نے ۱۲۰۸ھ اور کسی نے ۱۲۱۰ھ لکھا ہے۔ ۱۲۰۸ھ جرأت کے ایک شعر میں مادہ تاریخ کی صورت میں بھی آیا ہے اس سے یہی ۱۲۰۸ھ صحیح معلوم ہوتا ہے

جرأت نے کہی یہ رو کے تاریخ وفات یکتائی کے ساتھ
قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی، کہیا کہیے اب ــــ آہ آہ[2]

جرأت کے اس شعر نے سال وفات کا مسئلہ تو حل کر دیا اور یہ طے ہو گیا کہ قائم کی وفات ۱۲۰۸ھ میں ہوئی۔ باقی تفصیلات یعنی عمر تاریخ وغیرہ ہنوز پردہ خفا میں ہیں۔

---

[1] سعیدی صاحب نے قائم کے دیوان کے اختتام کا زمانہ انڈیا آفس کی فہرست کے سہارے پر طے کیا ہے کہ قائم کا دیوان ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں لکھا گیا ہے۔ دیوان کے اختتام پر یہ شعر لکھا ہے ـــ

ہوا ہے یہ جس سن میں نامہ رقم ـــ ہے بارہ سو ہجری میاں سات کم

[2] جرأت نے یہ قطعہ تاریخ (مستزاد) شاہ محمد کمال، کمالی ساکن کڑا مانک پور و شاگرد قائم چاند پوری کی فرمائش پر لکھا تھا اور یہ دیوان قائم کے اس قلمی نسخے میں ایک جگہ حاشیے پر لکھا ہوا ہے جو انڈیا آفس لندن کی زینت ہے۔ مولوی عبدالحق نے اسے جس شکل میں مقدمہ مخزن نکات میں نقل کیا ہے اس سے صحیح تاریخ نہیں نکل سکتی۔ (مترجم)

اب تو نے گل نہ گلستان ہے یاد　　اُس کے ٹکڑے کی ہر زمان ہے یاد
آہ اے پیرِ چرخ قائمؔ نام　　ہاں جو رہتا تھا اک جوان ہے یاد

قائم جانتے تھے کہ دنیا کب کسی کو یاد رکھتی ہے سب کو بھول جاتی ہے اسی لیے پیرِ چرخ سے پوچھ رہے ہیں کہ کبھی کوئی یہیں پوچھنے لگے کہ قائمؔ نام کا یہاں جو رہتا تھا ایک جوان یاد ہے۔" تو میاں بوڑھے کیا کہو گے؟ ہمارا بندہ سے سکو گے؟ پر یہ کم بخت پیرِ چرخ کسے یاد رکھتا ہے۔ اس نے نہ جانے کتنوں کو اپنی چکی میں پیس کر ان کا نام و نشان مٹا ڈالا۔

قائم کی تصانیف

قائم کی صرف ایک ہی کتاب اب تک شائع ہوئی ہے۔ "مخزن نکات" جس میں اُردو کے ۱۰۴ شاعروں کے مختصر حالات اور نمونہ کلام شامل ہے۔ اسی میں قائم نے اپنا بھی ذرا سا حال لکھا ہے اور خود اپنے کلام کا بھی مختصر سا انتخاب دیا ہے۔ دوسرے تذکروں میں البتہ زیادہ انتخاب شامل ہے "مخزن نکات" کے مقدمہ میں بطور ضمیمہ سب سے زیادہ انتخاب اُن کے اشعار کا ہے لیکن وہ بھی اتنا نہیں جس سے اطمینان ہو سکے۔ قائم کا دیوان لکھنؤ کے ایک پریس کی کھٹالی میں کئی سال سے پڑا ہوا ہے۔ دیوان کا ایک قلمی نسخہ جو منشی محمد حسین صاحب پیشکار کے پاس تھا وہ انھوں نے الناظر پریس کے مالک مولانا ظفر الملک کو شائع کرنے کیلئے دے دیا تھا۔ مولانا صاحب جیل میں ہیں اور دیوان پریس میں۔ تین سال پہلے میں نے لکھنؤ میں مولانا صاحب سے مل کر درخواست کی تھی کہ دیوان کو پریس سے جلدی نکالئے بہت دیر ہو رہی ہے انھوں نے اس کے کچھ چھپے ہوئے فارم دکھا کر کہا کہ "چھپنا شروع ہو گیا ہے دیر اس لیے ہو رہی ہے کہ دوسری نقل کی تلاش ہے وہ مل جائے تو صحیح ہو کر چھپے جو نسخہ موجود ہے وہ کچھ ادھورا اور کہیں کہیں غلط ہے ایک اور نسخہ کا پتہ چلا ہے وہ مل جائے تو اس سے مقابلہ کر کے کتاب چھاپی جائے۔ مجھے خود خیال ہے اور شائقین کا تقاضا ہے۔ پیشکار صاحب بھی بار بار لکھ رہے ہیں انشاءاللہ اب دیر نہ ہو گی آپ اطمینان رکھیے اس کے بعد بھی میں نے کئی بار معلوم کیا۔ پیشکار صاحب سے بھی لکھوایا۔ ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ ابھی کچھ دیر ہے بس عنقریب انشاءاللہ۔ دیکھئے اس عنقریب کی میعاد کب قریب آتی ہے۔ قدیم اُردو شاعروں کی طرف اُردو ادب کے ماہروں اور جان نثاروں کا دھیان کچھ دنوں سے خاص طور سے اس طرف منعطف ہوا ہے اُردو کے ماہانہ رسالے شاعروں کے نام پہ یادگار نمبر نکالتے ہیں ان کے بارے میں بڑے بڑے عالم تنقیدی مضمون لکھتے ہیں، حواشی کے ساتھ شعرا کے دیوان چھپ رہے ہیں کئی شاعروں کے ناموں پر کلب کھل رہے ہیں جس میں تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ شاعروں کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا جاتا ہے۔ قدیم شاعروں کی عظمت و شہرت باقی رکھنے کا یہ طریقہ قابل تعریف ہے اور ادب کے لیے فال نیک ہے قائم کو اب تک جہانِ ادب بھولا ہوا تھا۔ صرف تذکروں ہی میں اُن کا نام ملتا تھا، کچھ اشعار بھی جو انھیں تذکروں میں لکھے گئے تھے مگر اب عالموں کا خیال اس بھولے ہوئے شاعر کی طرف گیا ہے۔ کتنے ہی اہم اخباروں میں بڑے بڑے عالموں کے مضمون نکل چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

بلاشبہ قائم خوش نصیب ہیں کہ اپنی شاعری کی شہرت کی روشنی میں آج بھی زندہ نظر آ رہے ہیں خدا کی مہربانی سے ان کا خاندان بھی ابھی باعزت ہے ان کی موجودہ اولاد میں کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شریف آدمی ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ اگر ان کے مولد چاند پور میں

ایک "قائم کلب" قائم ہو جائے جو قائم کی تصانیف کی نشر و اشاعت کرے۔ قائم پر اب تک اخباروں میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور آگے لکھا جائے اس کو جمع کر کے شائع کرائے۔ یہ کام کچھ دشوار نہیں اس کے لیے چندہ بھی ہو سکتا ہے۔ ممبر بھی مل سکتے ہیں۔ میں اس کے لیے چاندپور کے باوقار اور ادب نواز شہریوں اور قائم کے خاندان والوں سے اصرار کروں گا۔ بجنور ضلع اُردو کے باعزت عالموں انشاپردازوں اور شاعروں کی جائے پیدائش ہونے کا فخر رکھتا ہے۔ مرحوم شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ایم اے پی۔ ایچ ڈی، مولوی سجاد حیدر صاحب (یلدرم) بی۔ اے۔ اُردو کے ادیبوں میں سرتاج مانے جاتے ہیں اور بھی کتنے ہی اچھے ادیب ہیں جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ضلع بجنور نے اعلیٰ درجہ کے اُردو ادب کی تخلیق میں بڑی شہرت حاصل کی ہے اس لیے اُردو کے ایک بڑے شاعر کی یادگار کے طور پر "قائم کلب" کے قائم کرنے میں بھی ضلع بھر کے ادب نواز تائید کریں گے۔ اس کی پوری اُمید ہے۔

قائم کی متفرق تصانیف

شاعر کی اصلی تخلیق تو اس کی شاعری ہی ہے وہی اس کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ شاعر کی زندگی اور سوانح عمری میں باقی باتیں تو یونہی برائے بیت بھرتی کی ہوتی ہیں۔ شاعری کا روگ شاعر کو دنیا کے اور کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔ دوسری طرف اس کی توجہ جاتی ہی نہیں۔ ایک شاعر اپنی شاعرانہ حیثیت میں دنیا کے جھنجھٹوں سے الگ رہنے والا ایک رشی یا افکار کی دنیا میں کھویا ہوا متفکر ہوتا ہے اسی لیے شاعر کی دنیا میں دنیاوی کاروبار کے نشان کی تلاش ایک بیکار کام ہے۔ بے شک کچھ شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے دنیاوی میدان اور راج کاج میں بھی بڑے بڑے کام کیے ہیں جیسے امیر خسرو۔ خان خاناں۔ فیضی اور ابوالفضل وغیرہ۔ یا موجودہ زمانے میں بڑے شاعر اکبر۔ لیکن یہ ایک کلیہ کا استثنا رہا ہے۔ اس استثنا کی مثال قائم بھی ہیں۔

قائم دلی میں شاہ عالم بادشاہ کے یہاں شاہی توپ خانے کے داروغہ تھے۔ قائم کی زندگی کا زیادہ حصہ دلی میں گزرا۔ پڑھ لکھ کر جب ہوش سنبھالا تو یہ دلی چلے گئے۔ بہت زمانے تک وہیں رہے اس وقت سلطنت تو کمزور ہو چلی تھی۔ مرنے کے قریب تھی۔ مگر اُردو شاعری اپنے پورے شباب پر تھی۔ میر تقی میر، مرزا سودا، میر درد جیسے بڑے بڑے شاعروں کا زمانہ تھا۔ دلی شاعروں سے بھری پڑی تھی۔ امیر غریب ہندو مسلمان سب شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ہر طرف شاعری کا غلغلہ تھا۔ جو شاعر نہیں تھے وہ بھی شاعر کہلانے کی دُھن میں مست تھے۔ ہر امیر شاعر تھا اور شاعروں کا قدردان تھا۔ اس وقت کے سماج کا جو نقشہ آزاد وغیرہ نے کھینچا ہے وہ اس وقت عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

اُردو کے بڑے شاعروں میں یہ تین بڑے شاعر میر۔ سودا اور درد کثرت رائے سے عظیم شاعر مانے گئے ہیں۔ اُن کی عظمت کے آگے سب نے سر جھکایا ہے۔ قائم کو ان سب کی صحبت۔ تعلیم۔ شاگردی اور دوستی سے بہرہ مند ہونے کا فخر حاصل ہے قائم کو اس زمانہ کے شعراء میں اچھی شہرت اور عزت حاصل ہو چکی تھی ان دنوں دہلی میں جو تھوڑے دنوں بھی رہ آتا تھا وہ زبان دانی اور قواعد زبان کی معلومات کے لحاظ سے قابل عزت سمجھا جاتا تھا۔ قائم [illegible] ہی دلی جا پہنچے تھے اور وہاں کے شہری بن گئے تھے۔ اس لیے [illegible] ان کی زبان بھی ٹکسالی مانی جاتی ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں اس بات کی طرف

اشارہ کیا ہے۔

"چوں از ابتدائے جوانی در شاہجہان آباد آمدہ بسر برد بنا بر آں محاورہ او درست گشت"[1]

یعنی قائم جوانی کے شروع میں ہی آکر دلی میں رہنے لگے تھے اس لیے اُن کا محاورہ درست ہو گیا تھا۔ محاوروں کی درستی اور اُردو شاعری کے لیے ایک اہم سند ہے اور یہی وہ بات ہے جس سے اُردو شاعروں نے زبان کو ٹکسال سے باہر نہیں ہونے دیا۔ ہندی والے زبان کے لیے کوئی ٹکسال ہی نہیں مانتے سب اپنی اپنی جگہ خود مختار اہل زبان اور عالم ہیں جو لکھ دیں وہی محاورہ ہے اس لیے زبان میں بھی ویسی سلاست پیدا نہیں ہوتی۔

قائم نے دلی میں رہ کر ادب کی خدمت کے ساتھ سلطنت کی خدمت بھی کی تھی۔ مدت تک شاہی توپ خانے کے داروغہ رہے تھے۔

بادشاہ سے رنجش

شاعر آزاد طبیعت اور لا اوبالی ہوتے ہی ہیں کسی طرح کا اور کسی کا ظلم چاہے وہ اپنے ساتھ ہو یا عوام پر اُن سے برداشت نہیں ہوتا۔ ذرا سی خلاف طبع بات پر بگڑ اُٹھتے ہیں اور جو دل میں آتا ہے کہہ گزرتے ہیں کہ دہلی کے احمد شاہ بادشاہ نے ایک دن ترنگ میں آکر آدمیوں سے بھری ہوئی ایک کشتی جمنا میں یہ تماشہ دیکھنے کے لیے ڈبوائی کہ کشتی ڈوبنے کے وقت کا نظارہ کیسا ہوتا ہے۔ اس سے رعایا میں بڑی برہمی پیدا ہوئی۔ مجبوراً رعایا کیا کرتی۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی لیکن اس حادثہ پر قائم سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے توپ خانہ سے ہجو کا گولہ داغ ہی دیا[2]

کیسا یہ شاہ ظلم پہ جس کی نگاہ ہے
ہاتھوں سے اسکے ایک جہاں دادخواہ ہے

احمق تو اور بھی ہیں پر یہ بادشاہ ہے

کسی طرح جان بچا کر قائم تو دلی سے بھاگ نکلے مگر ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ دلی چھوڑنے کا قائم کو بہت افسوس ہوا اس کا بیان انھوں نے مخزن نکات میں بھی کیا ہے مگر اس میں مندرجہ بالا حادثہ کی طرف اشارہ نہیں بلکہ دلی کی مغلیہ سلطنت کی تباہی کو دلی

---

[1] میر حسن ، تذکرہ شعرائے اُردو / ۱۲۸

[2] کشتی والے اس حادثہ کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں دیکھا گیا۔ منشی محمد حسین صاحب پیشکار کی زبانی سُنا ہے۔ ہجو کی شاعری کا یہ حصہ بھی انھوں نے ہی سنایا تھا۔ پوری شاعری ملے تو اس حادثہ پر کچھ روشنی ڈالی جا سکے۔ (پدم سنگھ شرما) مترجمہ عرض کرتی ہے کہ یہ بند ایک شہر آشوب کا ہے جو قائم کے دواوین میں شامل ہے۔ پورا شہر آشوب رسالہ نقوش میں چھپ چکا ہے، اس کا احمد شاہ سے کوئی تعلق نہیں یہ شاہ عالم ثانی کی ہجو میں ہے۔ چنانچہ یہ شعر اس میں موجود ہے ؎

کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا ‏ ‏ ‏ ‏ داد اترا جو لال کنور کا تھا مبتلا

چھوڑنے کی وجہ بتایا ہے قائم کو کسی نواب سے بھی تکلیف پہنچی تھی جس کا علم اس رباعی سے ہوتا ہے۔

قائم جو تو نواب سے دکھ پایا ہے
کہہ بھڑوے کو جو زبان پر آیا ہے
مر یہ نہیں کھایا کہ رہے گا خاموش
کھایا ہے اگر تو تو نمک کھایا ہے

ممکن ہے کہ یہ شاہ اور نواب ایک ہی آدمی ہوں۔[1]

ٹانڈے کے نواب کے یہاں

ٹانڈے کے نواب محمد یار خاں امیر جو سابق نواب رامپور کے بھائی تھے۔ شاعروں کے قدردان اور شاعری کے دلدادہ تھے انھیں جب شاعری سیکھنے کا شوق ہوا تو استادی کے لیے مرزا سودا اور میر سوز کو اپنے یہاں بلانا چاہا لیکن یہ دونوں شاعر اس وقت نواب مہربان خاں رند کے دربار سے وابستہ تھے انھوں نے معذرت کر لی نواب صاحب کی نظر قائم پر پڑی۔ قائم دلی چھوڑ چکے تھے۔ نواب کے بلانے پر ٹانڈے چلے گئے۔ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی نواب کے استاد مقرر ہوئے۔ ان کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ شاید یہ نیا سہارا پا کر قائم مطمئن ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں ؂

جو قائم خوبی کو نہیں ہے قصد
تو خدمت کر محمد یار خاں کی

نواب کے دربار میں ان دنوں اور بھی مشہور شاعر موجود تھے۔ قدوی لاہوری۔ پروانہ علی شاہ پروانہ مراد آبادی میر محمد نعیم نعیم۔ اور مصحفی جیسے شاعروں سے دربار بھرا ہوا تھا۔ اس مجمع کا ذکر کرتے ہوئے قائم نے کہا ہے ؂

تجھ کو قائم رکھے اللہ بہت سا لے امیر
مجمع سائے میں ہیں جس کے سخنداں اتنے

ٹانڈے کے یہ نواب جب مرہٹہ گردی سے تنگ آکر ٹانڈے سے اپنے بھائی کے پاس رامپور چلے گئے تو قائم بھی اُن کے ساتھ رامپور پہنچے۔ وہاں احمد یار خان نے ان کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی پر ٹانڈے میں جو آرام تھا وہ رامپور میں نہ ملا۔ وہاں کی تنخواہ میں اُن کا گزارا نہ ہوا جب مالی حالت سے بہت پریشان ہوئے تو لکھنؤ پہنچے اور مہاراجہ ٹکیت رائے سے اپنے علاقہ کے حاکم کے نام اپنی ضبط شدہ جائداد کی بحالی کا پروانہ حاصل کیا۔ یہ پروانہ لے کر رامپور آئے۔ یہاں سے وطن جانے کا قصد ہی تھا کہ ابدی سفر پیش آگیا اور سب سے بڑے دربار کے درباری بننے کو چل دیے۔ وطن نہ پہنچ سکے۔ آخر میں مادر وطن کی گود میں سونا بھی نصیب نہ ہو سکا۔ رامپور کی خاک میں آسودہ ہونا مقدر ہو چکا تھا۔

نہ مرنے دیتے ہم قائم کو لیکن — خداوندی سے کچھ چارہ نہیں ہے

---

[1] یہ کیسے ممکن ہے؟ (مترجم)

قائم کے تلامذہ

قائم کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے دس کا ذکر سعیدی صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ ایک تو وہی ٹانڈے والے نواب محمد یار خاں امیر جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

(۲) عباس خان عباس
(۳) پروانہ علی پروانہ مراد آبادی
(۴) قدرت اللہ قدرت رامپوری
(۵) گردھاری لال طرز دہلوی[1]
(۶) بہاری مل دہلوی
(۷) سنتوکھ رائے بیتاب دہلوی یا چاند پوری
(۸) شاہ محمدی مائل دہلوی
(۹) عبدالہادی ہادی دہلوی
(۱۰) کمال الدین حسین کمال کڑا مانک پوری[2]

کسی نے مندرجہ بالا شاعروں کے علاوہ قدرت اللہ شوق کو بھی قائم کا شاگرد لکھا ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے میں لالہ خوشوقت رائے شاداب چاند پوری کو بھی اپنا شاگرد بتایا ہے۔ پہلے یہ نثر نگار تھے۔ قائم کے مشورے سے اشعار بھی کہنے لگے تھے۔ قائم نے ان کی انسانیت اور اعلیٰ کردار کی تعریف کی ہے۔

سیرت

میر تقی میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں قائم کے اخلاق کی تین خصوصیات بیان کی ہیں۔
"جوانے است خیرہ وطیرہ و حسن پرست"
ایک جوان شاعر کا ایسا ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ عموماً اس زمانے کے شاعروں میں بھی یہ باتیں پائی جاتی ہیں مگر سعیدی صاحب نے اپنے مضمون میں ان کے اخلاق کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ . . . . .

"قائم نہایت متواضع اور خلیق و وضعدار تھے۔ طبیعت میں سوزو گداز تھا۔ اپنے فضائل پاکیزہ کی وجہ سے لوگوں کو گرویدہ کر لیا تھا۔ سخن گوئی کی وجہ سے وہ قدرو منزلت و شہرت حاصل کر لی کہ استادان وقت کے ہم عصر خیال کیے جانے لگے۔ معاش کی بے فکری نے کسب سخن[3] کا اچھا موقع دیا۔ دلی میں جو مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں شرکت کرتے تھے۔ سودا درد اور میر سے اچھے تعلقات تھے۔ اُن کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔"

---

[1] طرز کو بعض تذکرہ نگاروں نے امروہہ ضلع مراد آباد کا باشندہ بھی بتایا ہے (مترجم)
[2] مجمع الانتخاب کے مولف
[3] قائم کو شاید ہی کبھی حسب دل خواہ معاشی بے فکری حاصل رہی ہو، وہ ہمیشہ روزی کے لیے سرگرداں رہے (مترجم)

میر صاحب اور جناب سعیدی کے سیرت کے بیان میں تھوڑا سا تضاد معلوم ہوتا ہے مگر وہ ایسا نہیں جس کا باہم ربط نہ ہو سکے۔

میر صاحب نے صرف شاعر کی حیثیت سے قائم کا بیان کیا ہے اور سعیدی صاحب نے شاعر اور دنیادار دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے قائم کا ذکر کیا ہے۔

قائم کے ہم وطن اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی روایات کی بنیاد پر قائم کی کتنی ہی خوبیوں کو سراہتے ہیں۔ جوانی کے دنوں میں دلی کے زمانہ قیام میں اس عہد کی سوسائٹی سے متاثر ہو کر ممکن ہے قائم بھی کچھ دنوں کے لیے ویسے ہو گئے ہوں جیسا میر صاحب نے لکھا ہے مگر سعیدی صاحب نے "خیرہ وطیرہ" و "حسن پرست" کے لحاظ سے اس وقت سب شاعروں کو جن میں میر صاحب قبلہ بھی شامل ہیں۔ بھلا مانس ہی ثابت کیا ہے اپنے بیان کی تصدیق میں شعر العجم کا حوالہ بھی دیا ہے اور کہا ہے "اس وقت یہ روش حسن پرستی عام تھی اور اس زمانہ کی آب و ہوا ہی کچھ ایسی تھی"۔ اس کے آگے اس وقت کے دو ایک مشہور شاعروں کے بارے میں کچھ ایسی باتیں سعیدی صاحب نے لکھی ہیں جن کا یہاں نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔ قائم کی سیرت میں کچھ خامیاں بھی ہو سکتی ہیں مگر بہ حیثیت مجموعی قائم اپنے ہم عصر شاعروں میں اخلاق اور کردار و سیرت کے اعتبار سے ممتاز تھے۔ بہر حال قائم آزاد فطرت انسان تھے وہ کسی سے دب کر چلنے والے نہ تھے اور اس کا ثبوت ان کی زندگی کے حوادثات اور ان کے اشعار سے ملتا ہے۔

وضع دوراں گو خوشامد دوست ہے قائم تو ہو
ہر کس و ناکس سے دب چلنا ہماری خو نہیں

کیا پشم ہیں دنیا کے یہ سب اہل نعیم | بے قدر کریں ہم کو جو دے کر زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ بھیجے سجدہ | محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

قائم کے کلام کا نمونہ

قائم کی شاعری پر تفصیلی اور تنقیدی نظر تو اس وقت کی جا سکے گی جب ان کا دیوان چھپ کر سامنے آئے گا۔ تذکروں میں قائم کے کلام کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں سے بطور نمونہ دس پانچ اشعار کا دوسرے شاعروں کے ہم مضمون اشعار کے ساتھ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ؎

(۱)

ہرگز نہیں مقدور تری حمد زباں کا | برہان ہے دعویٰ کی مرے عجز بیاں کا

اس مضمون کا شعر امیر خسرو کا ہے ؎

سخن آنجا کہ از خدادانی ست | لاف دانش دلیل نادانی ست

مرزا سودا، میر درد نے بھی خدا کی حمد بیان کرنے میں اسی طرح اپنے عجز کا اعتراف کیا ہے۔

مقدور نہیں اُس کی تجلّی کے بیان کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا (سودا)

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

(۲)

جلوہ ہر رنگ میں ہے اُس بُت ہرجائی کا
یہ پریشاں نظری، جرم ہے بینائی کا

(۳)

جب تک کہ ہے توہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ
جوں موج کہ نت لازمہ ہے آب رواں کا

(۴)

اے عشق مرے دوش پہ تو بوجھ رکھ اپنا
ہر سو متحمل نہیں اِس بارِ گراں کا

قائم کے اس شعر میں جو جذبہ ہے وہ حافظ کے اس شعر کا عکس ہے ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

صوفیوں کے بیان کے مطابق امانت کا مطلب عشقِ حقیقی سے ہے جو انسان کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ انسان ہی خدا کو جاننے اور عشق کرنے کا حقدار ہے ؎

(۵)

اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا

ویدانت کا اُپدیش ہے کہ "دنیا کا پردہ بیچ سے اُٹھ جائے تو پھر وہی وہ ہے۔" ہوا نے پانی میں گرہ لگا دی تو بُلبلہ بن گیا۔ گرہ کھلی تو بلبلے کا وجود کہاں رہا —؟

"دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا"

اس خیال کو آتش نے ذرا مختلف انداز سے ظاہر کیا ہے۔

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

(۶)

کیوں چھوڑتے ہو دُردِ تہہ جام میکشو
ذرہ ہے یہ بھی آخر اُسی آفتاب کا

(۷)

ہوتے ترے محال ہے ہم درمیاں نہ ہوں
جب تک وجودِ شخص ہے سایہ نہ جائے گا

کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور
باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کروں

(۸)

اُس سے بے ہستی تک اپنی تفرقہ یک مو نہیں — نقطہ و خط دو ہیں ظاہر میں و لیکن دو نہیں

(۹)

جزو و کل کے فرق پر مت جا کہ اک آتش کو دیکھ — ہے جو تودے میں وہی ذرہ سی چنگاری میں ہے

(۱۰)

وہی معنی ہیں گو دھوکا ہے صورت کے ازالے کا — اگر ژالہ ہو پانی سے دگر پانی ہو ژالے کا

(۱۱)

کھولی تھی چشم دید کو تیرے پہ جوں حباب — اپنے تئیں ہی آپ نہ آیا نظر کہیں

(۱۲)

کیا ساغرِ ہلاہل و کیا جامِ آبِ خضر — آجائے بزمِ دوست میں جو کچھ سو پیجیے

(۱۳)

کشاکش موج سے کرنا کوئی ہمت دور ہے خس کا — ہیں اور تیری رضا پیارے جدھر چاہے اُدھر لے جا

(۱۴)

واقف نہیں ہم کہ کیا ہے بہتر — جز یہ کہ تری رضا ہے بہتر
دیتا ہے وہی طبیب حاذق — بیمار کو جو دوا ہے بہتر

خس خود ساتھ موج کے لگا ہے
بہتے بہتے کہیں تو جائے گا

(۱۵)

اس کو نہ راست کہہ نہ اُسی کو بتا غلط — کیا جانے کیا صحیح ہے واقع میں کیا غلط

(۱۶)

جز سیرِ دل اب اور کتابت نہ سبق ہے — جی اٹکے ہے جس میں وہ یہی ایک ورق ہے

(۱۷)

تن آسودہ کم بیٹھتے ہیں بازارِ محبت میں
جو واں جا ہے تو ٹوٹا دل کوئی یا چشم تر لے جا

مختار ہنسنے رونے پہ تجھ کو اگر کریں — تو اختیار گریہ بے اختیار کر
عاقبت میں ہے یہ بشر سے سوا — جانور کو ہنسی نہیں آتی

(۱۸)

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی — اس سے جو کوئی جیا سو مر کر
سمجھے اگر تو اتنا یہ زندگی مرض ہے — ہر درد جس طرح کا پھر وہ لگے دوا ہے

(۱۹)

قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند | کچھ دُور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

(۲۰)

بہت سا تو رکو مت دخل دے نسخہ میں غالم کے | کہ حاصل دور ہے نظروں سے تیری اس رسالے کا

(۲۱)

جھگڑے ہیں ہم مبادی کے یاں تک پہنچے کہ آہ | مقصود تھا جو اپنے نہیں کام رہ گیا

(۲۲)

فلک جو سبے تو خدائی کو لے اب قائم | وہ دن گئے کہ ارادہ تھا پادشاہی کا

(۲۳)

نے وعدہ اسکے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں | پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

(۲۴)

نالوں سے عندلیب کے آیا ہے جی بتنگ | رکھ سنے مرے مزار پر آکے چڑھائے گل

(۲۵)

ہنسنے کا یار بیہ بھی کوئی طور ہے آج | قائم بھی تیرے ہاتھ سے گھبرا کے رو دیا

(۲۶)

بھری آتی ہیں مت کم پہ ہر پہ یہ آنسوؤں سے | کہے تو چشم کو میری کہ ہیں یہ رہٹ کی گھڑیاں

(۲۷)

ظالم تو مری سادا دلی پر تو رحم کر | روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

(۲۸)

بھٹکا پھروں ہوں یاں میں اکیلا ہر ایک سمت | اے ہم رہاں ہیش قدم تم کدھر گئے

سودا نے بھی یہی بات کہی ہے

کدھر کو چھوڑ گئے مجھ کو ہمرہاں تنہا | پھروں ہوں دشت میں جُوں گردِ کارواں تنہا

(۲۹)

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ | کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

قائم کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔ سب تذکروں میں یہ قائم کے ہی نام سے ملتا ہے۔ آزاد نے آبِ حیات میں اسے سودا کا کہا ہے اور اس کا مقابلہ میر کے اس شعر سے کیا ہے۔

مت رنج کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد | دل ڈھائے کو جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

(۳۰)

سوائے دل شکنی سب مباح ہے یاں شیخ   خبر نہیں تجھے رندوں کے دین و مذہب کی

(۳۱)

اندازہ نگاہ رکھ سخن میں   یعنی جو کہے ہے نیک کہہ تو
دو گوش ہیں تیرے اور زباں ایک   تا دو نہ سُنے نہ ایک کہہ تو

(۳۲)

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پہ اس طرح   دشمن کے گھر میں جیسے کوئی مہمان رہے

(۳۳)

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم   یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

قائمؔ کا یہ شعر مولانا آزاد کو بہت پسند آیا تھا۔ اس کو انھوں نے کئی جگہ پیش کیا ہے اور داد دی ہے۔ پر تعجب ہے قائمؔ کے کلام کے انتخاب میں اس پر کسی تذکرہ نویس کی نظر نہیں پڑی[1]۔ اسے روشنی میں لانے کا کام آزاد ہی کا ہے۔ ان کے بعد مولانا شبلی نے شعر العجم میں نقل کیا ہے یہ حافظ کے ایک شعر کا ترجمہ ہے۔ قائمؔ کے تخلص نے اس پر اپنا قبضہ کر کے مضمون کے اصلی مالک حافظ کو بے دخل کر دیا ہے۔ حافظ کا شعر ہے ؎

گر ز مسجد بہ خرابات روم عیب مگیر
مجلسِ وعظ دراز است و زمان خواہد شد

مجھے تو قائمؔ کا یہ شعر اس لیے بھی پسند ہے کہ اس نے سب سے پہلے میرا دھیان قائمؔ کی طرف منعطف کرایا تھا۔

اس مضمون کے لکھنے میں جن حضرات کے مضامین سے مدد لی گئی ہے میں اُن سب کا ممنون ہوں خصوصاً منشی محمد حسین بھٹیکار صاحب اور ان کے بھتیجے منشی شاہ حسین صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اُن سے مجھے بڑی اہم مدد ملی۔

[اصل مضمون بزبان ہندی تماہی رسالہ ہندوستانی الہ آباد میں شائع ہوا تھا]

---

[1] یہ قائمؔ کے کسی دیوان میں بھی نہیں ملتا اور گمان غالب ہے کہ اس کے مصنف قائمؔ نہیں ہیں (مترجم)

زبان و بیان کے بعض پہلو

رشید حسن خاں

"اس مضمون میں بعض الفاظ کا املا کھٹکے گا۔ مگر مصنف کا اصرار ہے کہ یہی املا رہنے
دیا جائے۔ اس لیے کہ یہی صحیح ہے — دوسرے اس مضمون کے مندرجات سے
بھی اختلاف ممکن ہے۔ مگر یہ مسئلہ قابلِ غور ضرور ہے۔"

(ادارہ)

اب سے کچھ پہلے' ایک دَور ایسا گزر چکا ہے، جب لفظوں کے رکھ رکھاو، مناسبات کے التزام، اور انداز بیان کے پیچ و خم کو، شاعرانہ کمال کے اظہار کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ صرف بندشِ الفاظ اور محض مرصع سازی، مقصود بھی تھی' اور معیار بھی۔ اُس صنعت گری کے زمانے میں جتنی بدعتیں پھیلیں اور شاعری کو جس قدر نقصان پہنچا، اُس سے ہم سب واقف ہیں۔ مناسب الفاظ کے استعمال کا اچھی شاعری میں برابر کا درجہ ہے۔ لیکن اسلوب و خیال میں توازن ضروری ہے۔ رعایتِ لفظی کے پھیر میں اس طرح گرفتار ہو جانا، کہ صرف مناسب لفظوں کو جمع کر دینے کا نام شعر ہو، غیر شاعرانہ عمل ہے۔ اِس توازن و تناسب کے ختم ہو جانے سے' اشعار بے رنگ کاغذی پھولوں کے حریف بن کر رہ گئے تھے۔

اِدھر کے ۱۵، ۲۰ برسوں میں ناقدین نے ہیئت کے تجربوں، ادب و سماج کے باہمی تعلق اور اُس کے تجزیے پر' اس حد تک زور دیا، کہ حسنِ بیان، فصاحتِ کلام' اور معانی و بیان کے بے حد ضروری قاعدوں کو نظر انداز کر دینا، باشعور شاعر کے لیے ضروری سا ہو کر رہ گیا۔ اس طرح پھر ایک بار وہ تناسب و توازن ختم ہو گیا، جس کے بغیر نہ خیال و اظہار میں ربطِ کامل پیدا ہو سکتا ہے، نہ حُسنِ بیان اور تاثیر کی دولت ہاتھ آسکتی ہے۔ قدیم شاعروں کے ایک گروہ نے، الفاظ کو سب کچھ سمجھ کر، اُنھیں کی گردان کو معراج سمجھ لیا تھا! بہت سے نئے شاعروں نے صرف ہیئت کے کچھ تجربوں اور مواد کی معنویت کو سب کچھ فرض کر کے، شاعری کو حسنِ بیان اور تاثیر سے معرا بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ اور اس بات کو فراموش کر دیا کہ صرف لفظ پرستی یا محض خیال بندی، دونوں باتیں دلیلِ کم نظری ہیں۔

ہمارے زمانے کے شاعروں کو زبان و بیان سے اس حد تک بے نیاز بنانے میں، اس بات کو بھی بہت دخل تھا کہ پچھلے ۱۵، ۲۰ برسوں میں، شاعری کو کچھ مخصوص خیالات کی نشر و اشاعت کا وسیلہ بنا لیا گیا تھا۔ تنقیدِ حیات، حقیقت نگاری اور

سماجی بصیرت کے کچھ مفروضات کی ترجمانی، شاعروں کا فرض تھا۔ اس سے غرض نہیں تھی کہ کس بات کو کس طرح کہا جائے۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ جو ترقی پسند ہے وہ اچھا شاعر بھی ہے۔ اور جو اس بزم میں باریاب نہیں ہے، وہ کچھ نہیں ہے۔ زندگی اور اُس کے مظاہر کو، جو دنیا کی لامحدود وسعت کی طرح، مختلف المتنوع ہیں، ایک خانہ ساز دائرے میں بند کر کے، شاعری کو اس محدود تصورِ حیات کی آئینہ داری کے لیے وقف کر دیا گیا تھا ——— شاعری کا مقصود اگر یہ ہو، کہ اُس کا سہارا لے کر بعض سیاسی نظریات کی تبلیغ کی جائے اور اس ہنگامے میں فن، اسلوب، معانی و بیان اور لطافت و فصاحت کا تذکرہ، فضول سی بات ہو کر رہ جائے، تو تعجب کی کیا بات ہے!!

فن اور اُس کے ضابطے، کاوش کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اچھا شاعر بننے کے لیے مشق، مطالعہ اور فکر و تامل کی اہمیت کا احساس بنیادی شرط ہے۔ اگر شاعری کا بلند ترین معیار پیش نظر ہو، تو یہ سارے مراحل طے کرنا ہی پڑیں گے، لیکن اگر شاعری و صحافت میں امتیاز نہ کیا جائے، اور شاعر کا وہی کام ہو، جو کسی جماعت کے پروپیگنڈہ سیکرٹری کا ہوتا ہے، اس صورت میں کسی سرو ساماں کی ضرورت نہیں ہے۔ برسوں یہ کاروبار چلتا رہا کہ شاعر ہر ضروری چیز سے بے نیاز ہو کر، صرف مجاہدوں کی فہرست میں نام لکھا کر یہ فرض کر لیتے تھے کہ بس سارے مرحلے طے ہو گئے۔

کچھ لوگوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ شعر، شاعر کے ذہن پر مع الفاظ نازل ہوا کرتا ہے۔ یہ خود فریبی اس حد تک بڑھی کہ کوئی حد ہی نہیں رہی۔ شاعروں نے یہ سمجھ لیا کہ ٹوٹے پھوٹے لفظ، بے جوڑ تعبیرات، اور مبہم طرزِ بیان، یہ ساری نعمتیں عطیہ فطرت ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ایک لفظ کو پرکھنے، مرادفات کے نازک مفاہیم کو ملحوظ رکھنے، اور بہ لحاظ اندازِ بیان خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہنے، سے نجات حاصل کرنے کا یہ کامیاب نسخہ تھا۔ ان حضرات نے اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ قدما کے بہت سے نہایت اچھے شعر، جن پر آج ہم وجد کرتے ہیں ساتھیں الفاظ میں اُن کے ذہن پر نازل نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے مسودے سامنے ہوں تو معلوم ہو، کہ ایک ایک لفظ پر کئے بار خطِ تنسیخ کھینچا گیا ہے، اور ایک ایک مصرع کو کس کس رُخ سے کہنے کی کوشش کی گئی ہے ——— شاگردوں کے کلام پر استادوں کی اصلاحوں کو دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ باکمال استاد نے صرف ایک لفظ کو بدل دیا ہے یا اس کو اِدھر اُدھر کر دیا ہے اور شعر کچھ سے کچھ ہو گیا ہے ——— ہر شاعر کے یہاں کچھ ہم معنی اشعار ہوتے ہیں۔ کسی کے یہاں کم کسی کے یہاں زیادہ! کچھ شعر ایسے ہوتے ہیں کہ نفسِ مفہوم بالکل ایک ہے صرف اندازِ بیان کے معمولی سے فرق نے، دونوں شعروں میں اندھیرے اُجالے کا فرق پیدا کر دیا ہے۔ قدیم شاعروں میں سے میر کے یہاں اور اس زمانے میں فراق کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی ——— مختلف شاعروں کے یہاں ہم معنی شعر ملتے ہیں۔ نفسِ مفہوم ایک ہے، لیکن طرزِ بیان کی خوبی و خامی، یا انتخابِ الفاظ کے فرق نے، ایک شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ہے ———

مشقِ سخن بڑی چیز ہے جس سے قدرتِ بیان کی قابلِ رشک صلاحیت نمایاں ہو جاتی ہے، اور اس منزل پر پہنچ کر کبھی کبھی شعر واقعی مع الفاظ ذہن پر نازل ہوا کرتے ہیں۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ اچھے اچھے مشاق شاعروں کو ایک مناسب لفظ کے انتخاب میں، یا مناسب اسلوبِ بیان کی تلاش میں، دونوں پریشان ہوتے دیکھا گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ایک مدت کی مشق، قدیم ادب کے اچھے مطالعہ، اور فکر و تامل کی بہت سی دشوار منزلیں طے کرنے کے بعد یہ رتبہ بلند ملتا ہے۔ بہت سے

نئے شاعروں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ سارے مرحلے خود بخود طے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اہل نظر اور بُل ہوس کا امتیاز ہی ختم کر دیا۔ اس مفروضے نے بھی زبان و بیان کو خاصا نقصان پہنچایا۔

ہمارے بہت سے شاعر انتخاب الفاظ میں سلیقے سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ بہ غور دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ بعض اچھی خاصی نظمیں محض اس لیے بے اثری کا شکار ہو جاتی ہیں، کہ چند لفظ یا چند تعبیریں غیر مناسب یا نامانوس ہوتی ہیں۔ ان چند الفاظ کا کفارہ، پوری نظم کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ مندرجہ ذیل صورتوں میں حسنِ بیان اور حسنِ بیان کے نقطۂ نظر سے خامیاں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں

(۱) مناسب صفاتی الفاظ کا نہ ہونا (۲) غلط استعارے

(۳) مرادف الفاظ میں سے صحیح لفظ کا انتخاب نہ کرنا (۴) فصاحتِ کلام کے لحاظ سے غیر مناسب الفاظ کو منتخب کرنا۔

ہمارے بعض شاعروں نے بے معنی یا غیر مانوس استعاروں کو اس بری طرح نظم کیا ہے، کہ مذاقِ سلیم کے ساتھ ساتھ قوتِ فہم بھی الاماں پکار اٹھتی ہے۔ ہمارے یہاں انگریزی کے بعض اسالیبِ بیان کی کورانہ تقلید نے کئی وبائیں پھیلائی ہیں، بے معنی استعارے بھی اسی کورانہ تقلید یا محض ترجمہ کر دینے کے شوق کا مآلِ بد ہیں۔

انگریزی میں (TRANSFERRED EPITHAT) ایک قاعدہ ہے، جس کا لفظی ترجمہ "صفتِ منتقلہ" کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک موصوف کی صفت بہ نظرِ اختصار، دوسرے موصوف کی طرف منتقل کر دی جائے، اور اس موصوف کو حذف کر دیا جائے۔ اس اسلوب کو بے دریغ استعمال کیا گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ اردو میں یہ تقلید محض مناسب بھی ہے؛ اردو یا فارسی میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ جس میں انتقالِ صفت اس طرح ہو۔ البتہ یہ کام استعارے سے لیا جاتا ہے۔ استعارے میں طرفین (مستعار لہ، مستعار منہ) میں ایک تعلق کا ہونا ضروری ہے، جس کو "وجہِ جامع" کہتے ہیں۔ "وجہ جامع" سے مراد، وہ تشبیہی مناسبت ہے جس کے واسطے سے، ایک فرد یا چیز کی مخصوص صفت کو، دوسرے فرد یا شے کی عین ذات مان لیا جاتا ہے۔ اگر جانبین میں کسی طرح کا تشبیہی علاقہ نہ ہو، تو استعارہ کسی اعتبار سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب کہ "صفتِ منتقلہ" میں کسی ایسے واسطے کا وجود ضروری نہیں ہے۔ یہ قاعدہ مناسب تصرف کے بغیر اردو سے میل نہیں کھا سکتا ہے۔ جب اس میں تصرف کیا جائے گا، یعنی دونوں اجزا میں کسی نسبت کا علاقہ پیدا کیا جائے گا، اس صورت میں یہ استعارے میں بدل جائے گا۔ اور یہی اس کا صحیح مصرف ہے۔ انگریزی زبان میں REST-LESS PILLOW (بے چین تکیہ) کہنا کوئی غلط طرزِ سخن نہیں ہے۔ لیکن اردو میں بے چینی کسی طرح تکیے کی صفت نہیں بن سکتی۔ اردو میں "مہکتی چاندنی"، سکوتِ سیمیں، مہکتا شعلہ، کڑوی آگ، میٹھا نور، جیسے مرکبات، اسی تقلیدِ محض کا نتیجہ ہیں۔ جس زمانے میں "انشائے لطیف" کا دور دورہ تھا اور ٹیگور کا رنگ بے حد پسند کیا جاتا تھا، اس زمانے میں محض رومانی انشا پردازوں نے ایسے مرکبات کثرت سے استعمال کیے تھے۔ ان میں نیاز فتحپوری خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ نیاز صاحب نے ایسی بہت سی ترکیبیں تراشیاں کی ہیں۔ ان سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ آنکھیں بند کر کے تقلید کی جانے لگی اور انگریزی کے ایسے مرکبات کا اردو میں لفظی ترجمہ کر لینا قابلِ فخر جدت سمجھی جانے لگی۔

یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کسی زبان کے خصوصی اسالیبِ بیان کو، دوسری زبان میں بعینہٖ نقل کر دینا، غیر مناسب بھی ہو سکتا ہے۔ بعض اسالیب میں اتنا تصرف ضرور کرنا ہو گا کی ضرورت محسوس کی جائے گی کہ وہ اس زبان کے مزاج سے ہم آہنگ

ہو جائیں۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو طریقۂ اظہار، ایک زبان میں بالکل درست ہو، وہ دوسری زبان میں بھی اسی طرح قابلِ قبول ہو۔ نیز کمالِ فن کے نقطۂ نظر سے بھی یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ شاعر کسی زبان کے ایسے اسالیب بیان کو اختیار کرے، جو اجنبیت کو ساتھ لے کر آئیں۔

میں اس بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ذیل میں، تشبیہہ، استعارے اور صفت منتقلہ کے نامناسب استعمال کی کچھ مثالیں درج کرتا ہوں۔ ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غیر مانوس اندازِ بیان کو کس کس طرح اپنایا گیا ہے۔ اور محض تقلید میں صفت منتقلہ سے کس قدر غلط طرزِ سخن کا اضافہ کیا گیا ہے۔

مرے تصور کے زخم خوردہ افق سے
یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں (سردار جعفری)

افق کو زخم خوردہ کہنا غلط ہے۔ یعنی افق کو طائر یا انسان فرض کیا جائے۔ اس طرح وہ زخمی ہو۔ پھر اس کو افق کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کو تناسب بیان سے کوئی علاقہ نہیں۔ افق اور طائر کا انسان یا کسی دوسرے جاندار میں کوئی وجہ شبہ مشترک نہیں ہے۔

جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھا لوں
اور اس کی شاداب لہلہاتی ہوئی جبیں کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں (سردار جعفری)

پہلے زمین کو، بالک بنا کر گود لیا، پھر اس کو سبزہ بنا کر لہلہایا، اور اس سبزے کو بوسوں سے جگمگا دیا۔ یہ ساری باتیں لاطائل ہیں۔ پیشانی اور سبزے میں کوئی نسبت نہیں ہے کہ "لہلہاتی ہوئی جبیں" کہا جائے۔ نہ اس طرح سبزے پر بوسے لیے جا سکتے ہیں۔ نیز جب تک بوسے کے ساتھ کوئی ایسا لفظ نہ لایا جائے، جس سے تابانی کا مفہوم نکلے، اُس وقت تک بوسوں کی جگمگاہٹ بھی فریب خیال کی حد سے آگے نہیں بڑھے گی۔

جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں سے — چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خوابگاہوں سے — پکارتی رہیں بانہیں بدن بلاتے رہے (فیض)

جوانوں کے لہو کے بجائے "جوان لہو" کہنا اور بے صبر حسینوں کی خواب گاہوں کی جگہ "بے صبر خوابگاہیں" کہنا صفت منتقلہ کا ایسا کرشمہ ہے۔ جس کی داد اُردو والے دے ہی نہیں سکتے ہیں۔

یہ خون جو نفع خور بنیوں کی ہتھیلیوں میں کھنک رہا ہے (سردار جعفری)

خون کا استعارہ سکوں سے کیا گیا ہے۔ لیکن دونوں میں کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اس میں کئی محذوفات ہیں۔ کسان کا خون گرم، بالواسطہ فصل میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن وہ فصل ڈیوڑھے سوائے کے پھیر میں آ کر بنیے کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ بنیا اس مالِ غنیمت سے سکے حاصل کرتا ہے۔ اس طرح کسان کا خونِ گرم ہتھیلی میں کھنکتا ہے۔ اگر استعارہ اسی کا نام ہے، تو پھر ایسے اشعار کو کیوں بُرا کہا جائے ؂

دعوا کروں گا حشر میں موسیٰ پہ خون کا
کیوں اس نے آب دی ہے قاتل کی تیغ کو

جس طرح خون گرم نے کئی چکر کھانے کے بعد سکون کا بھیس بدلا ہے، اسی طرح اس شعر میں کئی پھیر ہیں۔ جناب کلیم خدا سے دیدار طلب ہوئے، جس کے نتیجے میں برق حسن نے طور کو پھونک کر سرمہ بنا دیا۔ آنکھیں چلتی ہوئی تلوار تو ہوتی ہی ہیں، اس اعتبار سے اس سرمے نے تیغ چشم کو آب عطا کی۔ اس کے بعد محبوب کے قاتل بننے میں کیا کسر رہتی۔ اُس نے اس ملنگے کی تلوار سے غریب عاشق کو قتل کر دیا۔ عاشق حشر میں حضرت موسیٰ پر دعوا دائر کرے گا، کیونکہ حربۂ قتل انھیں کے واسطے سے فراہم ہوا تھا!!

کھو کہ پانی کی آنکھ اشکوں سے تر نہ ہو گی (سردار جعفری)

پانی کو آنکھیں عطا کرنا اور پھر یہ دعوا کرنا کہ اُن میں آنسو بھی نہیں آئیں گے، کہ مکرنی کے سوا کچھ نہیں۔

اور یونان کی آزاد حسیناؤں نے
کتنے دل فصل بہاراں کے لیے بوئے ہیں
خاک برمانے اگائے ہیں وہ شعلے جن میں
مسکرانے کے لیے ہیں بے تاب
چاند تاروں کے کنول فصل بہاراں کے گلاب (سردار جعفری)

شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ اشتراکیت کی بہاروں کو لانے کے لیے یونان کی بے شمار عورتیں قربان ہوئیں۔ لیکن دل اور بیج میں ایسا کوئی علاقہ نہیں ہے، جس سے یہ مفہوم ادا ہو سکے۔ یہی حال شعلے اُگانے کا ہے۔ ان شعلوں میں چاند تاروں کے کنول اور فصل بہاراں کے گلابوں کا مسکرانا مزید برآں!! کئی شاعروں نے بوتے اور اُگانے کی ایسی مٹی عزیز کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہر چیز بوئی جا سکتی ہے، اسی طرح ہر چیز اُگائی جا سکتی ہے۔ خواہ مذاق سلیم نفاست کلام اور حسن بیان دم توڑ دے۔ حد یہ ہے کہ ایک صاحب نے "لہو بونے" سے دریغ نہیں کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بطن گیتی سے اُبھرتی ہیں تجسلی گاہیں جب شفق وسعت مشرق میں لہو بوتی ہے
(احمد ندیم قاسمی)

بوتے اور اُگانے کی چند مزید مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ ان کو پڑھ کر عبرت و نصیحت حاصل کی جا سکتی ہے۔

۱۔ اگرچہ رات مسلسل سیاہی بوتی ہے (سلیمان اریب)
۲۔ بطون خاک میں بونے ہوئے سر دانجم (، ،)
۳۔ چڑھا ہے ہنسی کی دُھن سے گیت فضا میں بوئیں گے (ساحر لدھیانوی)
۴۔ کہ دور دور کے ملکوں میں قحط بو جائیں (، ،)
۵۔ اُگ رہی ہے بغاوتوں کی سپاہ (سردار جعفری)
۶۔ پتھروں کے سینے سے سرخ ہاتھ اُگتے ہیں (، ،)

۷ - اہلِ دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم (مجروح)

۸ - یہ پھول بھی تو اسی دھول سے اُگے ہیں ندیم (ندیم قاسمی)

(شاعر کی یہ جدت قابلِ داد ہے کہ اس نے دھول سے پھول اگائے ہیں)

۹ - سولیاں اُگتی رہیں زنداں ابھرتے ہی رہے

ہمارے بڑھتی ندی وہ دہقان جو بغاوت کی سرزمیں پر
حسین اصولوں جوان نعروں کی سرخ فصلیں اگا رہے ہیں (سردار جعفری)

امن و محبت کے سایہ میں کھلتے ہیں دل اگتی ہے جوانی
اب نہ اگائے لاش یہ دھرتی جنگ لہو برسانے نہ پائے (مجروح)

شاعر کی آواز کو کس کا
خونیں پنجہ گھونٹ رہا ہے (سردار جعفری)

آواز کو گھونٹنا محض باد پیمائی ہے۔ جب تک آواز کے ساتھ کوئی مناسب لفظ نہیں لایا جائے گا۔ اس وقت تک بات نہیں بنے گی۔

مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں (ساحر)

راستے کو مکھن کی طرح ملائم بتانا، اصولِ تشبیہ اور مذاقِ سلیم، دونوں کے ساتھ تمسخر کرتا ہے۔ "ملائم راہیں" مزید برآں۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو راہیں مکھن کی طرح ملائم تھیں، اُن پر فوجی بوٹوں سے صرف خراشیں پڑی ہیں!!

اپنے گوندھے ہوئے غم کے بندھن
شب کے سناٹے میں
جاگ اٹھتے ہیں تڑپ جاتے ہیں چلاتے ہیں (مخدوم محی الدین)

غم کے بندھنوں کو گوندھنا ہی کیا کم تھا، کہ اُن کو استعارے کے پھیر میں لا کر آدمی بنا دیا اور اس طرح جاگ اُٹھنے، تڑپ جانے، اور چلانے کا فرض اُن سے ادا کرایا گیا۔ مسرت و غم دونوں کو ذی روح کی صفات سے موصوف کیا جا سکتا ہے۔ کیا بھی گیا ہے۔ لیکن ہر نکتہ مکانے دارد! "غم کے بندھن" نہ تڑپیں گے نہ چلائیں گے۔

اجنبی باہوں کے حلقوں میں لچکتی ہوں گی
تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ردائیں اب تک (ساحر)

پہلے مہکے ہوئے (مہکتے ہوئے کے بجائے) بالوں کی ردائیں بنائی گئیں، پھر ان رداؤں کو ذی روح بنا کر، باہوں

کے حلقے میں پلکنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ استعارہ در استعارہ ناپختگی ذہن و فکر کا غماز ہے۔

میری شاداب تمنا کے مہکتے ہوئے خواب (جاں نثار اختر)

خوابوں کا مہکنا، وہی صفت منتقلہ کا کرشمہ ہے۔ جس کو حسن تناسب سے مطلق علاقہ نہیں ہے۔

اٹھ رہے ہیں قدم فضاؤں میں آج ابر بہار بن کر (جاں نثار اختر)

قدموں کو ابر بہار سے تشبیہ دینا، حسن خیال کا خون کرنا ہے۔

آجاؤ میں نے ڈھول سے ماتھا اٹھا لیا
آجاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال (فیض)

'غم کی چھال' بجائے خود غلط نہیں، لیکن اس کے لیے آنکھوں کو درخت بنانا کہاں کی خوش مذاقی ہے؟

سو لیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی (فیض)

لالی کا لپکنا وہی استعارے کا ناجائز صرف ہے۔

جس میٹھے نور
اور کڑوی آگ سے
ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبح بغاوت کا گلشن (فیض)

'میٹھا نور' اور 'کڑوی آگ' صفت منتقلہ کا کرشمہ ہے، اور 'گلشن پھوٹنا' مذاق سلیم سے بے نیاز ہو جانے کا نتیجہ ہے۔

وہ مہکتی ہوئی باتیں وہ مہکتے ہوئے ہونٹ (سردار جعفری)
دھواں کہ برق حسن کا مہکتا شعلہ ہے کوئی (فراق)
جو مہکی چھاؤں میں نغموں کی پنکھڑی سے بنے (")
اک مہکتی ہوئی سرشار نگاہی گم ہے (جذبی)

مہکتی ہوئی باتیں، مہکتا شعلہ، مہکی چھاؤں، مہکتی ہوئی سرشار نگاہی، یہ سب صفت منتقلہ کے غیر مناسب استعمال کی پیدا کی ہوئی بد قواری ہے۔ جو نارسیدہ نوجوانوں کو بے طرح متاثر کرتی ہے اور اسی نسبت سے گمراہ کرتی ہے۔ شاعر جب ان بدعتوں میں پھنس جاتا ہے، تو حسن بیان، تاثیر، اور خوبی کلام، سب محاسن ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ان سب سے پہلے مذاقِ سلیم رخصت ہو جاتا ہے۔ انھیں "کرتب و کرتوت" کی نمائش نے بے شمار اشعار کو پریشاں گفتاری کا مرادف بنا دیا ہے۔

تشبیہ و استعارہ کی حیثیت دو دھاری تلوار کی ہے، یہ وہ عمل ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی سے، خود عامل پر لوٹ پڑتا ہے۔ قدیم شاعروں اور استادوں نے بھی جہاں جہاں خوش مذاقی کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، وہاں نہایت مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو گئی ہے مثلاً

نوک مژہ پہ اشک صباحت نظام ہے — سونٹے پہ آبنوس کے چاندی کی شام ہے

صندل اسکی ہے مانگ میں کیا خوب — راہ ظلمات میں یہ دلدل ہے

ساری رگیں ہوئی ہیں تن زار پر نمود — ناطاقتی نے جسم کو مسطر بنا دیا

دیکھے اس پستاں پہ زلفوں کو تو بچہ بھی سکھے — دودھ پینے کے لیے بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا

ان اشعار میں بہ لحاظ قواعد کوئی عیب نہیں ہے، لیکن بد مذاقی نے سو عیب پیدا کر دیے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں نہ قاعدے کے لحاظ سے بات درست ہو، نہ مذاقِ سلیم کے نقطۂ نظر سے، وہاں کیا رنگ ہوگا؟ آج کل نقرئی آواز، چمکیلا خیال، سکوت سیمیں، مہکتی ہوئی باتیں، جیسی ترکیبیں بعض شاعروں کے یہاں کثرت سے دیکھنے میں آتی ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بہت سے وہ نارسیدہ شاعر، محض تقلید کی برکت حاصل کرنے کے لیے، ان کو فراخ دلی سے استعمال کرتے ہیں، جن کو صحتِ کلام و تناسبِ بیان کا احساس درکنار، ان مرکب استعاروں کے صحیح معنی بھی نہیں معلوم ہوتے ہیں۔

یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جدتِ بیان اور ندرتِ تعبیر، اُس وقت تک پیدا نہیں کی جا سکتی، جب تک کہ حسنِ بیان، صحتِ بیان، اور مانوس طرزِ بیان، سے چھٹکارا نہ حاصل کیا جائے۔ نئے شاعروں کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے مقامات پر ان لوگوں نے جدتِ تشبیہ یا ندرتِ تعبیر کی بہترین مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ان تشبیہوں اور استعاروں کو دیکھ کر ہر شخص تعریف کرنے پر مجبور ہوگا۔ میں سردار جعفری کے یہاں سے ایسے کچھ شعر پیش کرتا ہوں ؎

پتیوں کی پلکوں پر — اوس جگمگاتی ہے

املیوں کے پیڑوں پر — دھوپ پر سکھاتی ہے

چاند کے کٹورے سے — چاندنی چھلکتی ہے

جیل کی فضاؤں میں — پھر بھی اک اندھیرا ہے

جیسے ریت میں گر کر — دودھ جذب ہو جائے

———

ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح

خمارِ نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل — ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے

———

افق کے کوہ سار میں شفق کے آبشار ہیں

———

یہ پیڑوں کی گردن میں پھولوں کے ہار

———

رینگتی ہیں تاریکیں — روز و شب کی راہوں پر

———

نوجوان جسموں پر　　　پیرہن ہیں زخموں کے

———

ان کے ہاتھ میں ہنسیے　　　گیت گانے لگتے ہیں
جھوم جھوم کر پودے　　　اپنا سر جھکاتے ہیں

———

رات پینگ لیتی ہے　　　چاندنی کے جھولے میں

———

رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام

———

اور وہ بوڑھے جہاں دیدہ رفیق
جھریاں جن کی ہیں تاریخ حوادث کے ورق

———

اس حسن بیان کی داد کون نہیں دے گا؟ لیکن جب وہ دل بونے، پھانسیاں اگانے، اور آواز کو گھونٹنے، کا کاروبار شروع کرتے ہیں۔ اس وقت یہی نہیں کہ اس حصۂ کلام سے دل کشی قطع تعلق کر لیتی ہے، دوسرے بہت سے نوجوان شاعروں کی گمراہی کا سروسامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔

یہ مفروضہ کہ جدت، دراز دستی کے بغیر پیدا ہی نہیں کی جا سکتی، قدیم ادب کے مطالعہ سے بے نیاز ہو جانے کا پیدا کردہ ہے۔ صرف میر انیس کے کلام کا مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہو گا کہ ندرت تشبیہ و استعارہ کی کیسی کیسی عجیب مثالیں بکھری ہوئی ہیں۔ جن کو پیش نظر رکھ کر ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ غالباً حضرت علی اکبر میدان جنگ میں تشریف لائے ہیں۔ دہشت سے فوج شام پیچھے ہٹ گئی ہے۔ اس موقع پر فرماتے ہیں ؎

دہشت سے فوج شام کی بدلی سمٹ گئی
قدرت خدا کی دن جو بڑھا رات گھٹ گئی

دوسرے مصرع میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اور استعارہ جس خوبی سے صرف ہوا ہے۔ وہ داد سے مستغنی ہے۔ حضرت امام حسینؑ کے ہمراہیوں نے تیمم کیا ہے۔ چہروں پر ہلکا سا غبار ہے۔ اس کا بیان دیکھئے:۔

ع　باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب

———

ع　مٹی سے آئینوں پہ جلا اور ہو گئی

دو تشبیہیں دیکھئے۔ حضرت عباس نے قطع بازو کے بعد مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا ہے۔ اس عجیب الوضع منظر کی تشبیہ ملاحظہ ہو۔

حسن تشبیہ نے منظر کا رنگ ہی بدل دیا ہے۔

ع مشکیزہ تھا کہ شیر کے منہ میں شکار تھا

شہادت امام کے بعد اہل بیت کو اسیر کر لیا گیا ہے۔ بارہ افراد کو ایک رسی میں باندھا گیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گل ہائے چمن

صفاتی الفاظ کے استعمال میں ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ کہ اُن کو موصوف سے ایک خاص نسبت ہو۔ بیشتر مرادف الفاظ میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ جو صفت ایک لفظ کے ساتھ آ سکتی ہو، وہ دوسرے لفظ کے ساتھ بھی آ سکے۔ حسن بیان کے نقطۂ نظر سے توصیفی مرکبات میں تناسب باہم کی بہت اہمیت ہے۔ جس طرح مرادف الفاظ میں سے مناسب تر لفظ کے انتخاب کا اثر پورے شعر پر پڑتا ہے، اسی طرح مناسب صفت کے استعمال کا حسن کام کر جاتا ہے۔ شاعر کے ذہن میں یہ تفصیلات مرتب نہیں ہیں، تو شعر کی خوبی پر حرف آ جائے گا۔ یہی صورت مناسب الفاظ کے انتخاب کی ہے۔ ہمارے شعراء الفاظ کے انتخاب میں بہت دراز دستی سے کام لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اچھا خاصا شعر بے مزہ ہو جاتا ہے۔ چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو گا۔

رقص کرتی ہے ترے حسن کی رعنائی میں
وادیٔ نجد کے پھولوں کی بھیگی خوشبو (قتیل)

حسن کی رعنائی میں خوشبو کے رقص کرنے کو چھوڑیے، یہ دیکھیے کہ خوشبو کی صفت بھیگی کتنی بے جوڑ ہے۔ لفظ بھیگی ایسے موصوف کے لیے آئے گا، جو مادی وجود رکھتا ہو۔

آج پھر تیری صدا
حلقۂ طوق و سلاسل سے نکل آئی ہے
حشر انگیز لڑائی کے جہازوں کی طرح
پھر بھی پر امن و حسین و شاداب (سردار جعفری)

آواز کو شاداب کہنا غلط ہے۔ شاداب ایسی چیزوں کے ساتھ بطور صفت آئے گا جن میں نمو کی کیفیت ہو جیسے پھول، پودے وغیرہ یا بہ طور استعارہ چہرے کے لیے۔ آواز کو اس سے کوئی مناسبت نہیں۔

ہاں وہی ہاتھ کڑکتے ہوئے کوڑوں کی طرح
زخم ہر پیٹھ پہ ہر جسم پہ برساتے ہوئے
ظلم کی طرح نڈر، رات کی مانند طویل (سردار جعفری)

ہاتھوں کو نڈر کہنا بے سرپا بات ہے۔ یہی حال "کڑکتے ہوئے" کا ہے، جو نہ ہاتھوں کے لیے بطور صفت آ سکتا ہے نہ کوڑوں کے لیے۔

ع گھناؤنی ہے پراسرار ہے فضا ساری (ندیم)

کثرتِ ظلمت کے لیے یہ کہنا کہ فضا گھناؤنی ہے، بے جوڑ بات ہے۔ گھناؤنی اظہار کراہت کے لیے آتا ہے۔ نہ کہ اظہار کثرت کے لیے۔

ع پھٹی بدلی میں سورج مسکرایا (ندیم)

"پھٹی بدلی" بدمذاقی کا کامیاب ترین مظاہرہ ہے۔

رقص کے ساتھ اگر ساز کی جھنکار نہ ہو
تو اک الجھی ہوئی زنجیر ہے یہ فن سلیم (ندیم)

فن کے ساتھ سلیم بطور صفت کسی طرح نہیں آسکتا۔ یہ لفظ ذوق، فطرت، طبع جیسے الفاظ کے ساتھ آتا ہے۔

ع طپش کی آتش جرار کہاں سے لاؤں (فیض)
ع اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے (سردار جعفری)
ع نرم گلابی جاڑے گزرے (جاں نثار اختر)
ع پھر کوئی نرم سا جب راگ سنا دیتے ہیں (جذبی)

نرم راگ، آتش جرار، سخت خموشی، نرم جاڑے، بے جوڑ صفاتی الفاظ سے مرکب ہیں۔ جرار کو آگ کی صفت بنانا اور ہلکے جاڑوں کو نرم جاڑے کہنا، محض بھونڈا پا بات ہے۔ سخت، بہت کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ وہ ہر جگہ آسکتا ہے! "نرم راگ" سب سے زیادہ مہمل ہے۔

ع عروس تہذیب کی ملائم دراز زلفیں سنور گئی ہیں (جاں نثار اختر)
ع کتنے لمحے کہ حسین نرم سبک آنچل سے (" ")
ع کھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں (ساحر)

ملائم راہیں، نرم آنچل، ملائم زلفیں، مکھنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کو یا تو ان الفاظ کا صحیح مفہوم نہیں معلوم ہے یا وہ مذاقِ سلیم سے محروم ہے۔

ساغر خشک ابھی عقدۂ دشوار سہی (مجروح)
ساغر ناب میں آنسو بھی ڈھلک آتے ہیں (فیض)

ع یہ فلک بوس ملیں دلکش و سیمیں بازار (ساحر)
ع جنبش ابرو کے کتنے دلکش و نازک سلام (سلیمان اریب)
ع وہی گھناونے منظر وہی کریہہ جام (" ")
ع مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح (" ")

ساغر خشک، ساغر ناب، سیمیں بازار، نازک سلام، کریہہ جام اور مرمریں خواب، سارے مرکبات غیر مناسب صفاتی الفاظ

سے گراں بار ہیں۔

ع وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن (ساحر)

ع کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں (")

ع ابھرے جذبے دب نہ سکیں گے اکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے (ساحر)

اُجلے دریچے، نرم چھاؤں اور اکھڑے پرچم، صحت بیان سے معرا ہیں)۔ اُجلا کپڑا کے قیاس پر اُجلا دریچہ لکھنا سلامت طبع سے سارے رشتے ختم کر لینا ہے۔ نرم اور نازک، ان دو لفظوں کو عام طور سے بے محل استعمال کیا جاتا ہے۔ نرم چھاؤں بھی اسی ذیل میں ہے۔ اکھڑا پرچم ان سب پر مستزاد ہے۔ پھر شاعر نے اسی پر بس نہیں کیا ہے، اکھڑے پرچم کے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ اب نہیں جم سکے گا۔ سبحان اللہ!! بھلا پرچم کو اکھڑنے یا جمنے سے کیا تعلق!!

اچھے خاصے شاعر مرادف الفاظ اور مناسب صفات کے انتخاب میں دیدہ وری سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ اس سے شعر تو تباہ ہو ہی جاتا ہے۔ ان الفاظ کا کوئی مفہوم بھی باقی نہیں رہتا ہے۔ اگر ہر لفظ ہر جگہ استعمال ہو سکتا ہے، تو پھر متعدد ہم معنی یا قریب المعنی الفاظ میں جو فرق ہوتا ہے اور جس کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ سب سخن مہمل ہے۔ اصل میں کلاسکل ادب سے بے نیاز ہو جانے کی وجہ سے یہ برائیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اکبر کا یہ شعر دیکھیے ؎

برق کے فیض سے آنکھوں کو بچائے اللہ

روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

روشنی اور نور میں جو فرق ہے اس کو ملاحظہ فرمایا؟ اس امتیاز نے شعر میں جو حُسن پیدا کیا ہے، اُس کو ہر صاحبِ ذوق محسوس کر سکتا ہے۔ جگر کا یہ شعر دیکھیے ؎

عرض نیاز عشق کا چاہیے اور کیا صلہ

میں نے کہا بہ چشم نم، اس نے سُنا بہ چشم تر

چشم نم اور چشم تر میں جو تفاوت ہے جو فرق مدارج اور معنوی ارتقا ہے، وہ دوسرے الفاظ سے اس خوبی کے ساتھ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ میر انیسؔ کے یہاں اس کی مثالیں بہ کثرت ہیں اور خوب سے خوب تر، لیکن ان سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے مطالعہ شرط ہے، جو بہت سے "اہل نظر" کی رائے میں قدامت پرستی، تضییع اوقات، یا رجعت پسندی کا کرشمہ ہے!!

صحیح اور مناسب ترین لفظ کا انتخاب بے حد اہم مسئلہ ہے۔ متعدد مرادف الفاظ میں سے بالکل صحیح لفظ کو اختیار کرنا اور کس مفہوم کے لیے کون سا لفظ وضع کیا گیا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھنا، بے حد ضروری ہے۔ قدیم صاحب نظر شعرا نے کہیں کہیں کسی چیز کی مخصوص صفت کو دوسری چیز سے متعلق کر دیا ہے۔ کسی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے جو لفظ آنا چاہیے اُس کے بجائے ایک دوسرا لفظ استعمال کیا ہے، لیکن اس تصرف میں اس حد تک تناسب و احتیاط سے کام لیا ہے اور شیوۂ کار آگہی کا ایسا ثبوت پیش کیا ہے کہ غور کرنے کے بعد، آدمی وجد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جناب آرزوؔ لکھنوی نے اپنی کتاب "نظام اردو" میں اس پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ میں انھیں کی عبارت کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"دمک ایک خاص طرح کی تابندگی کا نام ہے۔ جس کا استعمال ستارہ، کندن وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے لیکن میر انیس کہتے ہیں۔ ع

مٹی میں وہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا

شاعر مٹی سی کم حقیقت چیز کو، کندن سی بیش قیمت شے پر ترجیح دینے کے لیے جو صفت کندن کی تھی، اُسے مٹی کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ اور "وہ" حرف ترقی لاکر، بتاتا ہے، کہ مٹی کی چمک کندن کو مات کر رہی تھی۔ اور لفظ 'گرد' جو مٹی کے لیے وضع ہوا تھا، مات کی جگہ صرف کرکے، مٹی کو سونا اور سونے کو مٹی بنا دیتا ہے۔ اگر مصنف موصوف نے، کندن کی صفت مٹی کے ساتھ لاکر، مٹی کی صفت کندن کے ساتھ نہ استعمال کی ہوتی، تو جملہ بے معنی یا غیر فصیح ہو جاتا۔"

(نظام اردو ص ۵۹)

آب، چمک، دمک، ڈلک، قریب المعنی الفاظ ہیں۔ لیکن سب کا محل استعمال جدا جدا ہے۔ ہمارے بہت سے نئے شاعر جس بے دردی اور بے امتیازی کے ساتھ قریب المعنی الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، اس لحاظ سے لپٹ، بھبھک، مہک میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیئے۔

دھاڑنا، چنگھاڑنا، ہنہنانا، پھنکارنا، کوکنا، سب الگ الگ لفظ ہیں، جو بعض جانداروں کے لیے مخصوص ہیں۔ سانپ پھنکارتا ہے۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہے۔ کوئل کوکتی ہے۔ گھوڑا ہنہناتا ہے۔ اب آپ سارے امتیازات ختم کرکے، کہیئے کہ سانپ چنگھاڑ رہا تھا، ہاتھی پھنکار رہا تھا، اور گھوڑا بلبلا رہا تھا، تو یہ کونسی معقول بات ہوگی؟

کبوتروں کی ٹکڑی، کے بجائے کہیئے کہ کبوتروں کا ایک گروہ آیا۔ اسی طرح ستاروں کے جھرمٹ، کو ستاروں کا مجمع کہیئے، یا درختوں کا جھنڈ، لکھنے کے بجائے، درختوں کا جمگھٹا، اور ہاتھیوں کی ڈار، کے بجائے ہاتھیوں کی جماعت، کہیئے، تو کیا یہ نامعقول ترین حرکت نہیں ہوگی؟ جس بے امتیازی اور کور ذوقی کے ساتھ، غلط اور غیر مناسب الفاظ کو بے تکان، استعمال کیا جا رہا ہے، اس سے کبھی کبھی یہ خدشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مرادف الفاظ، قریب المعنی الفاظ، اور مخصوص صفاتی الفاظ کے سارے امتیازات ہی نہ ختم ہو جائیں۔ ہمارے شاعروں کو اور ناقدین کو اس طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کرنا چاہیئے۔ ذیل میں کسی تشریح کے بغیر، الفاظ کے بے محل استعمال کی کچھ اور مثالیں درج کی جاتی ہیں [illegible] الفاظ کا صرف قابل توجہ ہے۔

صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو (مخدوم)

آغاز وفا کی ڈھارس پر انجام وفا سے ڈر نہ سکے (سلیمان اریب)

میرے سینے مُنی ہوگی بیٹھی آغوش پرانی میں (ساحر)

آجاؤ مست ہو گئی میرے لہو کی تال (فیض)

دست قدرت کے تراشے ہوئے دو برگ گلاب (سردار جعفری)

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ (مجروح)

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام (فیض)

بول کچھ بول مقید لب اظہار سہی (مجروح)

وہ تنک رہے تھے ہمیں ہنس کے پی گئے آنسو (״)

بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے (״)

نوا ہے جادہ داں بجروح جس میں روح ساعت ہو (״)

(اس دیدہ وری کا کیا ٹھکانا ہے کہ شاعر کی نظر میں، روح عصر اور روح ساعت، میں کوئی فرق نہیں)

کوئی وہ خندہ جو برپا نہ ہو پگھل جائے (خورشید الاسلام)

دل سبک اور سادہ ہے اس طور سے قرض جتنے تھے گویا ادا ہو گئے (خورشید الاسلام)

آہ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں (جذبی)

عروس فن کے تقاضے ہیں تیری باہنوں سے (״)

دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دل کائنات ہم (״)

وہ گھڑی کہ ہے خضر و مسیح سے فارغ (خورشید الاسلام)

حرم سے گزرے تو شیخ حرم سے لڑ بیٹھے
مغاں میں پہنچے تو پیر مغاں سے روٹھ گئے (خورشید الاسلام)

(یہ بات قابل داد ہے کہ ایک اُردو کا استاد اور مشہور ناقد مغاں کو حرم کا متضاد سمجھ رہا ہے)

الفاظ کے غلط استعمال کی خامی، اُس وقت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، جب وہ محاورے یا روزمرہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں، شعر نہایت غیر مناسب طرز بیان سے گراں بار ہو جاتا ہے۔ اور فصاحت کلام بالکل قطع تعلق کر لیتی ہے۔ جیسے

ہمیں نے دھانوں کی نبض پرکھی، ہمیں نے دردوں کا دل ٹٹولا (سردار جعفری)

نبض پرکھنا، اور دردوں کا دل ٹٹولنا، صحت کلام، روزمرہ اور حسن بیان کو منہ چڑانا ہے۔

خاموش زمین کے سینوں میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں (ساحر)

سہمی ہوئی دوشیزاؤں کی مسکان بھی بِک جاتی ہے (״)

دو بھولی بھالی روحوں کی پہچان بھی بِک جاتی ہے (״)

طنابیں گڑنا، مسکان بکنا، پہچان بکنا، جیسے مرکب افعال استعمال کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاعر جس زبان میں شعر کہہ رہا ہے، اُس زبان کی معمولی معلومات سے بھی بے بہرہ ہے!!

دنیا کے اپنے نگر میں حق کی پہلی گونج اٹھی ہے (ساحر)

کون الجھے ہوئے بالوں کی گرہ سلجھائے (ساحر)
آجاؤ میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ (فیض)
دو پٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں (سردار جعفری)
غم گساروں سے بھی اب چشم کرم جاتی رہی (خورشید الاسلام)

گونج اٹھنا، گرہ سلجھانا، ترنگ سننا، دوپٹے ڈوریوں پر ٹانگنا اور چشم کرم جاتی رہنا، یہ سب پریشان گفتاری کے ذیل میں آتے ہیں۔

کیا جو دل نے جنوں ساراں سے روٹھ گئے (خورشید الاسلام)
تمھیں بھی ہم سے رم ہونے لگا ہے (" ")
یہی گھر جو حرم ہونے لگا ہے (" ")

جنون کرنا، رم ہونے لگنا، حرم ہونے لگنا، بدمذاقی کے عبرتناک مرقع ہیں۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ خورشید الاسلام اردو کے استاد اور مشہور نقاد ہیں۔ زبان و ادب کے ایک استاد اور مبصر کا، زبان کو اس طرح مجروح کرنا اور بدذوقی کے انبار لگانا بے حد غلط اور لائق سرزنش ہے۔ کیونکہ ان حضرات کی ایسی خوش فعلیاں، دوسرے بہت سے ناپختہ حضرات کو گمراہ بنانے میں ضرورت سے زیادہ معاون ثابت ہوتی ہیں ؎

ہر قدم آگے بڑھانے کے لیے خون کی بھینٹ
ایسے بھی اے غم دل کتنے مقام آئیں گے (جذبی)
نئے بل زوران کو سکھائے (جذبی)
دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دل کائنات ہم (جذبی)

دل دھڑکانا، بل سکھانا، زور سکھانا، خون کی بھینٹ آگے بڑھانا، بھی اردو کے ایک استاد کے فرمودات ہیں۔
چو کفر از کعبہ برخیزد......

ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے (مجروح)
پھر اٹھ کے گرم کریں کاروبار زلف و جنوں (")
اب وہ غم زنداں دیتے ہیں جن کو غم زنداں ہونا تھا (")
اب جنوں پہ وہ ساعت آپڑی کہ اے مجروح (")

آرزو کھو دینا، کاروبار گرم کرنا، غم ہونا تھا، ساعت آپڑنا، یہ سب اسی ذیل میں آتے ہیں۔

ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں (فیض)
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں (")
دراز قد جیسے سرو سہی نماز کرے (")

کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے (فیض)
ہر درد کو اجیالا ہر اک غم کو سنوارا (〃)

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے (〃)

پیغام بجھ جانا، نام بجھ جانا، مناز کرنا، جزا لے جانا، درد کو اجیالانا، زبان ٹھہرنا صحت زبان کے دائرے سے یکسر خارج ہیں۔

ایسی غلط نگاری اس وقت دو آتشہ ہو جاتی ہے، جب کسی غزل کی ردیف و قوافی پر اس کی مکمل گرفت ہو۔ ایسی غزلیں بدذوقی کا شاہکار بن کر رہ جاتی ہیں۔ جیسے

غم کدے وہ جو ترے گام سے جل اٹھتے ہیں | بت کدے وہ جو مرے نام سے جل اٹھتے ہیں
رات تاریک سہی میری طرف تو دیکھو | کتنے مہتاب ابھی جام سے جل اٹھتے ہیں
ذہن شاعر میں وہ انوارِ سحر کا عالم | جب چمن شبنمِ الہام سے جل اٹھتے ہیں

وہ چمن ہجو نہ ہوئے وجہ نشاطِ غمِ دل
جو چمن ہمارے گلفام سے جل اٹھتے ہیں (سلیمان اریب)

ردیف ہر جگہ بے جوڑ ہے۔ یہ عیب بھی اس وقت عام ہے۔ ستم یہ ہے کہ نومشق شاعر بعض اوقات ایسی سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کرتے ہیں، جن کا سر سبز ہونا ناممکنات کے ذیل میں آتا ہے۔ اور پھر اس مشکل زمین میں پریشاں گفتاری کے عجیب عجیب مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔ شعر یا بند کے دوسرے الفاظ و مرکبات کی نسبت سے الفاظ کے انتخاب کی بھی خاص حیثیت ہے۔ اچھے شعر میں، ایک لفظ بھی غیر متناسب ہو، تو اس کا حسن دھندلا جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اچھی خاصی نظم یا غزل کو صرف چند غیر متناسب الفاظ تباہ کر دیتے ہیں۔ بعض مثالوں سے اس کا اندازہ ہو گا۔ ایک نظم کے دو بند دیکھئے ؎

ریزہ سنگ سہی پھول کی نازک پتی | تودۂ خاک سہی پیکرِ ابنِ آدم
ذرۂ ریگ ہی قلب کا ایوان حسیں | قطرۂ بحر سہی وسعتِ ہر دو عالم

•

یہ جہاں خواب سہی ایک پریشاں سا خواب | جس کی تعبیر ہے اک تیرہ و تاریک خلا
جس کی پہنائی میں اڑتے ہیں ننگے بھتنے | نوعِ انساں کے کلیجے ہیں فقط جن کی غذا

پہلا بند بہ لحاظ انتخاب و ترتیب الفاظ خوب ہے۔ دوسرے بند کا پہلا شعر بھی ایسا ہی ہے۔ تینوں شعروں میں نہایت شستہ فارسی ترکیبیں ہیں۔ لیکن دوسرے بند کے تیسرے مصرع کو پڑھتے ہی پہلے اشعار کا حسن بھی ختم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ "ننگے بھتنے" نظم کر کے شاعر نے تناسبِ بیان کو ذبح کر دیا ہے۔ ایک اور نظم کے یہ دو بند دیکھئے

تری ہی دین سہی قوتِ ستارہ شکار | لرز رہا ہے مگر میرا عزم طور آثار
مرا کلام ہے میری تڑپ کا آئینہ دار

عمل کے دشت میں جب عزم دندنائے گا　　افق پہ نجمِ سحر جب نقاب اٹھائے گا
تو میری شعلہ مزاجی کو چین آئے گا

ملاحظہ فرمایئے، ایک طرف توٹ ستارہ شکار، عزم علو آثار، شعلہ مزاجی، آئینہ دار، جیسی ترکیبیں ہیں۔ دوسری طرف اسی کے پہلو بہ پہلو عزم بھی دندنا رہا ہے!! پانچ مصرعوں کی ساری دلکشی، ایک مصرع کی دندناہٹ سے تباہ ہو گئی۔

چپ چاپ خلاؤں میں ظلمت نے علم کھولے
سوچوں کے سمندر میں آنے لگے ہچکولے

"سوچوں کا سمندر" کیسی بار سماعت ترکیب ہے!

نظم تو پھر بھی وسیع الذیل صنف ہے۔ بعض معمولی خامیاں اس کی وسعت میں سما سکتی ہیں۔ لیکن غزل میں معمولی سی خامی بے حد نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ بہت سے غزل گو شعرا اس پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور غزل میں ایسے الفاظ نظم کر دیتے ہیں کہ شعر کا سارا حسن رو بہ خاک ہو جاتا ہے۔ مثلاً

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن　　دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا　(مجروح)

زمانہ ہو چکا اس اوّلیں مڈبھیڑ کو لیکن　　سنائی دے رہی ہے تیری نظروں کی پکار اب تک　(ندیم)

میں ابتدائی سکھوں کے سہارے جی لوں گا　　مرے دکھوں کی کوئی انتہا نہیں نہ سہی　(ندیم)

اب سے چند سال پہلے تک شعریت سے محروم، غزل کے مزاج سے بالکل میل نہ کھانے والے الفاظ سے بوجھل، اور حسنِ بیان سے معرا غزلیں کہنا، شیوۂ آگہی سمجھا جاتا تھا، کوشش کی جاتی تھی کہ غزل پر مذاقِ سلیم کی پرچھائیں نہ پڑنے پائے، اور حلاوتِ بیان کی جھلک بھی نہ آسکے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ پریشان گفتاری کا باقاعدہ مقابلہ ہو رہا ہے۔ میں مثال میں صرف ایک غزل درج کرتا ہوں۔ یہ غزل مجروح کی ہے ؎

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے　　یہ تو کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے
امن و محبت کے ساگر میں کھلتے ہیں اگتی ہے جوانی　　اب کے اگائے لاش یہ دھرتی جنگ لہو برسانے نہ پائے
صدیوں کے دو رگوں سے نکل کر روپ نکھارا ہے انساں نے　　مشکل سے سلجھے ہیں یہ گیسو کوئی انھیں الجھانے نہ پائے
اپنے ہی سنکٹ کے بھنور میں چکرائی ٹرومین کی نیا　　ڈھونڈھتی ہے تنکے کا سہارا تنکا بھی کام آنے نہ پائے

امن ترا جیون کا نغمہ امن اس کا ہے موت کا نغمہ
سرخ ہی گل ہے سرخ لہو بھی آنکھ یہ دھوکا کھانے نہ پائے

مجروح کے مجموعے "غزل" میں ایسی کئی غزلیں اور متعدد اشعار ہیں۔ سردار جعفری نے اس کے دیباچے میں مجروح کی خصوصیاتِ شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ایک اور خصوصیت جو مجروح کو عام غزل گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ انھوں نے سماجی اور سیاسی موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کے پیرایے میں ڈھال

لیا ہے۔ عام طور سے غزل گو سماجی اور سیاسی موضوعات کے بیان میں پھنسے اور
سیٹھے ہو جاتے ہیں یا ان کا انداز بیان ایسا ہو جاتا ہے کہ نظم اور غزل کا فرق باقی
نہیں رہتا۔ مجروحؔ کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔"

اسی قسم کے جانبدارانہ، مصلحت پسندانہ اور گمراہ کن رائیں بہت سے نئے شاعروں کو بے راہ رو بنانے میں معاون اور شریک غالب ثابت ہوئی ہیں۔

ہم کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ اچھا خیال صحیح انداز بیان سے آراستہ ہو کر داد طلب ہو سکتا ہے۔ جس طرح صرف الفاظ کی تکرار، رعایت اور محض صنعت گری سے شاعرانہ خوبیاں گرفت میں نہیں آتی ہیں، اسی طرح صحیح اسلوب نہ ہونے سے بھی خیال کا حسن خاک میں مل جاتا ہے۔

رسالہ "سوغات" (بنگلور) نے ابھی جدید نظم نمبر شائع کیا ہے۔ اس میں اس زمانے کے بہت سے اچھے بُرے شاعروں کی نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ ان سب نظموں کو ذرا رُک کر، سوچ سمجھ کر، اور ان کا مفہوم سمجھنے کی خاطر سنبھل سنبھل کر، پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج کل ہمارے نوجوان شاعروں کا ایک گروہ، ایک طرف تو ابہام کے جال میں از سرِ نو گرفتار ہو رہا ہے، بیان کی پیچیدگی رمزیت ساری حدیں توڑ چکی ہے اور بہت سی نظموں کو سمجھنا، اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ خود شاعر یا اس کے شارحین کے طویل نوٹ بھی بطور حاشیہ شامل نہ ہوں۔ (رسالہ ادبی دنیا (لاہور) کے کئی حالیہ شماروں میں اس کی مثالیں بکھری ہوئی ہیں کہ ایک نظم کے چار حضرات نے چار مختلف مفاہیم بتائے، اور جب شاعر صاحب کا نمبر آیا تو انھوں نے ان سب کے مفاہیم پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا)

دوسری طرف اسلوب بیان کی اجنبیت بھی سارے مرحلے طے کر چکی ہے۔ جس سے لطف اندوز ہونا اس وقت تک ممکن نہیں ہے، جب تک کہ مذاقِ سلیم و حسنِ بیان سے کچھ دیر کے لیے دست برداری کا اعلان نہ کر دیا جائے۔ یہ صورتِ حال (جس کا جواز سماجی انتشار میں تلاش کیا جاتا ہے) بہر صورت اس لائق ہے کہ اس طرف توجہ کی جائے۔ جدید نظموں کے بعض نمونے دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض نو رسیدہ و نارسیدہ شعرا نے شاعری کو خوش فعلی کا مرادف سمجھ لیا ہے۔ آسان پسندی سے زیادہ ذہنی انتشار پسندی نے ان کی بعض حسیات کو مفلوج کر دیا ہے۔ امریکی معاشرت کی کورانہ تقلید سے جس طرح روزمرہ کی زندگی میں عجیب عجیب نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ لباس میں، لہجے میں، بے اعتدالی میں، اور بے پروا خرامی میں، جس جس طرح داد تقلید دی جاتی ہے۔ اسی طرح خیالات کی ترتیب و تنظیم اور ضبط شوق کے بھی پرزے اڑانا، بعض حضرات کے نزدیک داخل حسنات ہونے کے مرادف ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قاعدوں اور ضابطوں سے شاعر کو ایسی واقفیت ہو جیسی مدرسے کے ایک طالب علم کو ہوتی ہے۔ یہ تو شاعری کا میکانکی تصور ہے۔ ہاں یہ بات بہت ضروری ہے کہ قدیم ادب کے جواہر پاروں کا برابر مطالعہ کیا جائے۔ کہ ذوق کی تربیت ہوتی رہے۔ اور پیرایہ بیان کی خوبیوں کا احساس بڑھتا رہے۔ شاعری میں خیال اور پیرایہ بیان، دونوں کے لحاظ سے کم سے کم پر قناعت کر لینا گناہ ہے۔ یہاں تو خوب سے خوب تر کی تلاش بلندی کی ضمانت ہے۔

ہمارے نئے شاعروں کے پاس اچھے خیالات کی کمی نہیں ہے۔ ان کی قوتِ تخیل نئے نئے راستوں پر پرواز کرتی رہتی ہے۔ لیکن جب وہ ان خیالات کو پیش کرتے ہیں، اس وقت عجزِ بیان آنکھیں دکھاتا ہے۔ اور ان کے پاکیزہ و نادر خیالات غلط پیرایۂ بیان یا

غیر متناسب الفاظ کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ دیتے ہیں جب اس غیر فنکارانہ عمل کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، فوراً چند صحافتی الفاظ سے اس شخص کے مزاج و نظریات کا تجزیہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ تفتیش کی جاتی ہے کہ اس کے یہاں دورِ جاگیرداری کے کس قدر اثرات ہیں۔ اور یہ کس مرتبے کا قدامت پرست یا رجعت پرست ہے۔ آخر میں فتویٰ دے دیا جاتا ہے کہ اس شخص کا ذہن اس قابل ہے ہی نہیں کہ ان الہامی باتوں کو سمجھ سکے۔ اس طرح بیک جنبشِ قلم نادر و نادری دونوں کا صفایا کر دیا جاتا ہے۔

خیال کی اہمیت و اولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک زمانے میں غزل پر لفظی بازی گری کے جو اثرات پڑے تھے اور جس کے کچھ انعکاسات اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آ جاتے ہیں، ان سے ہم سب واقف ہیں۔ اس لیے کوئی بھی صاحبِ نظر مطلق لفظ پرستی کو اچھا نہیں کہہ سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ تمدن و معیشت کے انقلابات کے نتیجے میں ادب میں خیالات کی رو بدلتی رہتی ہے۔ اس سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے۔ لیکن خیالات کے راستے کتنے ہی بدل جائیں اور زندگی کی اُلجھنیں خیالات میں کتنی ہی پیچیدگیاں پیدا کر دیں، ان کے اظہار میں بہر طور اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ وہ زبان و فن کے لوازم سے معرا نہ ہونے پائیں۔ خیال ہر شخص کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اور ہر شخص اس کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ادا کر سکتا ہے۔ اگر شاعر کی تخلیقات کو پرکھنے کا کوئی معیار نہ ہو، اور اس کے لیے کوئی قید ضروری نہ سمجھی جائے، تو اس کی فنکاری کا کیا مصرف ہوگا؟ — الفاظ و اسالیب جامد چیزیں نہیں ہیں۔ اُن میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اور ہوتی رہیں گی۔ لیکن اس بنا پر انارکزم کا جواز نہیں نکل سکتا۔ ترمیم و اضافے کے لیے ضروری ہے، کہ مذاقِ سلیم اور زبان کے مزاج کا لحاظ رکھا جائے۔

ہر زبان کا مزاج اور تقاضے جداگانہ ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی زبان کے مخصوص مرکبات یا خاص اسلوبِ بیان کا لفظی ترجمہ کر دینا نہ کمال کی بات ہے، نہ قابلِ فخر، یہ تو عجزِ شاعرانہ کا اظہار نہیں اعلان ہے۔ غالب کی بھاری بھرکم شخصیت سے کون واقف نہیں۔ ان کی پُر رعب آواز، اور پُر وقار لہجے سے سب مرعوب ہیں۔ لیکن اس سارے سروسامان کے باوجود ان کے عجمی نژاد ترجمے قبولِ عام حاصل نہ کر سکے۔ جب تک وہ "تماشا کر" اور "انتظار کھینچ" جیسے مرکبات سے کام لیتے رہے، اور استعارات میں بیدل کا رنگ جھلکتا رہا، معیار و قبولِ عام منہ پھیرے رہے۔ تا بہ دیگراں چہ رسد۔

ہر زبان دوسری زبان سے مسلسل استفادہ کرتی ہے، لیکن استفادے کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے، کہ ہر چیز بعینہٖ نقل کر دی جائے۔ استفادے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہر زبان سے ان چیزوں کو لے لیا جائے، جو ہمارے کام کی ہیں اور اس طرح کہ چراغ سے چراغ جل اٹھے، یہ نہ ہو کہ کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا جائے۔

عربی کی وسعت سے کس کو انکار ہوگا۔ فتحِ ایران کے بعد عربی نے فارسی کو متاثر کرنا شروع کیا۔ لیکن اہلِ ایران کی خوش ذوقی نے نفیس کے قاعدے سے کام لے کر اُن الفاظ کو جو ایرانی لہجے سے میل نہیں کھاتے تھے اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ وہ بحریں جو عربی کے مزاج کے عین مطابق تھیں، لیکن فارسی سے میل نہیں کھاتی تھیں، ان کو چھوڑ دیا — اُن کے بجائے نئے زحافات سے مرکب ایسے شگفتہ و مترنم اوزان اختیار کیے، جو اُن کے مزاج کے مطابق تھے۔ اگر اس وقت ایرانی اہلِ زبان وہی کرتے، جو آج اردو کے مغرب زدہ حضرات کر رہے ہیں، تو وہی اونٹ

کی چٹکیاں محبوب کے تِل کی قائم مقامی کرتیں، وہی پتلی پتلی مسواکیں محبوب کی نرم و دراز انگلیوں کے کام آتیں اور عربی کے ثقیل لفظ فارسی کی لطافت و شیرینی کو مرحوم کر چکے ہوتے۔

غرض کہ نئے اضافے کرتے وقت یہ سوچنا ضروری ہے کہ وہ زبان کے معیار اور اس کے مزاج کے مطابق ہیں یا نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر کی دیدہ وری و فنکاری کی آزمائش ہوتی ہے۔ سورج کو اگر کوہ طور بنا دیا جائے، یا ذروں کے جگر سے انقلاب کے نعرے برآمد کیے جائیں، تو یہ محض خوش فعلی ہوگی۔ یہ ویسی ہی بات ہوگی جیسے ایک تبصرہ نگار نے ایک ڈرامہ نویس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا "وہ دنیائے ڈرامہ کے ناخدا تھے"۔ تبصرہ نگار نے زمین پر کشتی چلا کر ڈرامہ نگار صاحب کو ناخدا بنایا ہے۔ بہت سے شاعر بھی اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔

آواز

جوش ملیح آبادی

یہ شب ہے، شبِ قہرِ چکاں، جاگتے رہنا
جینا ہے تو اے اہلِ جہاں، جاگتے رہنا

ہر لحظہ ہے، اک دیوِ کمر بستہ، خبردار
ہر آن ہے، اک پیلِ دماں، جاگتے رہنا

جس سے رُخِ تہذیب پہ رقصندہ ہے سُرخی
خطرے میں ہے وہ امن و اماں، جاگتے رہنا

تم اُونگھ بھی جاؤ گے تو دامانِ تمدّن
پھٹ جائے گا مانندِ کتاں، جاگتے رہنا

معمورۂ افکار پہ غلطیدہ ہیں اوہام
اے حلقۂ صاحب نظراں، جاگتے رہنا

گردوں پہ، حریفانِ زمیں، کھول چکے ہیں
انساں کی ہلاکت کے نشاں، جاگتے رہنا

تھم تھم کے چمکتے ہیں در و بام پہ ناوک
رہ رہ کے کڑکتی ہے کماں، جاگتے رہنا

ذرّوں سے، اُبلتے نظر آتے ہیں شرارے
تاروں میں پر افشاں ہے دھواں، جاگتے رہنا

گردونِ جہاں سوز کی پُر ہول نگاہیں
پھرتی ہیں سوئے گیتی نگراں، جاگتے رہنا

ہاں، راہ میں ہے، راہ میں، العظمتہ للہ
اک زلزلۂ تند عناں، جاگتے رہنا

جس میں تپشِ خونِ برہمن کی ہے سُرخی
اُڑنے پہ ہے وہ رنگِ بتاں، جاگتے رہنا

جُنباں ہے سرِ تاج محل، برقِ جہاں سوز
اے لشکریِ شاہِ جہاں، جاگتے رہنا

شہروں میں کل ایک دوڑتی راہِ سبقت پہ
اب مغرب و مشرق ہیں دواں، جاگتے رہنا

آئے ہیں خُمستاں میں جوانانِ سُبک سر
پیرانِ خُم و رَطلِ گراں ، جاگتے رہنا

اب خال و خط و رنگ پہ ہے جنگ کا آغاز
اے امن شناسانِ زماں ، جاگتے رہنا

دُشمن ، گُھپ اندھیرے میں جنھیں بانٹ رہے ہیں
پھولوں کی وہ چھڑیاں ہیں سناں ، جاگتے رہنا

اُٹھا ہے گریباں کی طرف ، پنجۂ وحشت
اے طائفۂ بخیہ گراں ، جاگتے رہنا

پھر خاتمِ ظلمت کو ضرورت ہے نگیں کی
الماس تراشانِ جہاں ، جاگتے رہنا

اے ذہنِ اماماں تمدّن کے طبیبو!
جُنباں ہے فضا پر خفقاں ، جاگتے رہنا

غلطاں ہیں پھر آفاتِ جہانِ گزراں پر
اعیانِ جہانِ گزُراں ، جاگتے رہنا

اک چاپ ہے تاریک گزُرگاہ میں ، ہشیار
اک سایہ ہے دیوار پہ ، ہاں ، جاگتے رہنا

سن سن ہے خموشی میں کہ رَن بول رہا ہے
فتنے ہیں دبے پاؤں رواں ، جاگتے رہنا

تم سوئے ، تو اس تشنہ دہاں دورِ زماں کی
مُنھ سے نکل آئے گی زباں ، جاگتے رہنا

ہاں آنکھ نہ جھپکے کہ ہے پتھراؤ کی زَد پر
یہ کارگہِ شیشہ گراں ، جاگتے رہنا

بھاری ہے بہت پیرِ خرابات پہ یہ رات
خُدّامِ جہاں بین و جواں ، جاگتے رہنا

پھر مُحتَسبِ شہر ہے آمادۂ شبِ خوں
اقطابِ شبستانِ مغاں ، جاگتے رہنا

اے چنگ و رباب و دف و قُلقُل کے امینو
اُٹھنے ہی پہ ہے شورِ اذاں ، جاگتے رہنا

ہاں ، بارگہِ جوش میں جاکر یہ پکار آؤ
اے قبلۂ رندانِ جہاں ، جاگتے رہنا

○

احمد ندیم قاسمی

پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں
آنکھوں کو بجھا لوں کہ حقیقت کو بدل دوں

حق بات کہوں گا، مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو، وہی بات نہ کہہ دوں

ہر سوچ پہ خنجر سا گزر جاتا ہے دل سے
حیران ہوں، سوچوں تو کس انداز میں سوچوں

سناٹے اڑا دیتے ہیں آواز کے پرزے
یاروں کو اگر دشتِ مصیبت میں پکاروں

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر،
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھولوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوحیں
بازار میں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

جینے پہ جو مجبور ہو، جی کر وہ کرے کیا
صحرا میں کبھی خضر جو مل جائے تو پوچھوں

ملتی نہیں جب موت بھی مانگے سے، تو یا رب
ہو اذن تو میں اپنی صلیب آپ اٹھا لوں

یاد آنے لگا ہے مجھے انجامِ بہاراں،
اے ابرِ کرم، تیری اجازت ہو تو رو لوں

سوکھا ہوا پتہ ہوں، مگر اے شبِ تاریک
میں ایک ستارہ ہوں، اگر شاخ سے ٹوٹوں،

طوائف

احمد ندیم قاسمی

صدیوں پہلے کا ذکر ہے، جب لوگ
خوف کو دیوتا سمجھتے تھے
سرخ کوندوں، سیہ گھٹاؤں کو
چیختی پیٹتی، ہواؤں کو
اپنے اپنے خدا سمجھتے تھے

قصرِ شاہی سے ایک شہزادی
بت کدے کی طرف روانہ ہوئی
پتلیوں میں جواں لہو کی چمک
اور اچھوتے لبوں میں رس کی دمک
رُت بدلنے کا اک بہانہ ہوئی

دیوتاؤں کے پاؤں پر اس نے
خون چھڑکا بھری جوانی کا
جذبے معصوم، تجربے کمسن
روح تتلا کے رہ گئی، لیکن
جسم آغاز تھا کہانی کا

اک پجاری نے، اس کا دشتِ بدن
چھو کے دیکھا تو غنچے کھلنے لگے
کونپلوں میں نمو کا رس مچلا
جسم کا جذبۂ ہوس مچلا
ابر اُمڈے، پہاڑ ہلنے لگے

کل کی اک سربلند شہزادی
آج سب کی نظر میں ہیٹی ہے
یوں تو بن ٹھن کے آئی ہے سرِبام
اور "زینت الھوا" ہے اس کا نام
"کیچنی" دیوتا کی بیٹی ہے

○

آنند نرائن مُلّاؔ

جن پاک نفَس انسانوں میں کردار کی عظمت ہوتی ہے
ایسوں سے نہ مل پائیں بھی اگر نادیدہ عقیدت ہوتی ہے

منزل سے جو واقف ہے اُسے کب رہبر کی ضرورت ہوتی ہے
وہ آپ ہی رہبر ہے اپنا جس دل میں محبت ہوتی ہے

کم دل سے ہوس کی آلائش غم ہی کی بدولت ہوتی ہے
اشکوں کی نمی جب ملتی ہے شاداب محبت ہوتی ہے

کوئی بھی نظامِ محفل ہو فقط، رہ اوّل پاسِ محفل
ساقی کا جہاں سکّہ ہو رواں مے نوشی عبادت ہوتی ہے

تنگیِ فضائے گردوں کے شاکی وہ وقت بھی آتا ہے
ہلکی سی بھی جنبش جب پر کی طائر کو غنیمت ہوتی ہے

تو ڈھونڈ فلک پر باغِ ارم - اپنا تو عقیدہ ہے زاہد
جس خاک پہ دو دل پیار کریں وہ خاک ہی جنت ہوتی ہے

کیسی ہی حقیقت ہو لیکن بیکس کی زباں پہ افسانہ
آتی ہے لبِ طاقت پہ جب تب جا کے حقیقت ہوتی ہے

آواز میں رس، ہونٹوں پہ عنب، باتوں میں شکر، یہ سب ہو کے
انسان کی اک پہچان یہ ہے آنکھوں میں مروّت ہوتی ہے

ہیں کیا، تم کیا، اور دُنیا کیا، انسان کی کچھ فطرت ہے یہی
اپنے لیے عذر ہزاروں ہیں اوروں کو نصیحت ہوتی ہے

اک جرمِ خیانت تو نے کیا طاقت کو جہاں اپنا سمجھا
مسند پہ پہنچ کر بھول نہ جا، طاقت تو امانت ہوتی ہے

اک چال وہی لیکن اس کے بازیِ جہاں میں نام ہیں دو
ہارے تو بغاوت کہلائی، جیتے تو نبوت ہوتی ہے

محفل کی نظر ہی میزاں ہے تول آپ نہ اپنے کو مُلّاؔ
جس دام بکے جو چیز وہی اُس چیز کی قیمت ہوتی ہے

○

عندلیب شادانی

مرے پاس آج بھی ہیں تیری کتنی یادگاریں
خلش و گدازِ پیہم تپ و سوزِ جاودانہ

نہ وہ خوشگوار صبحیں نہ وہ دل نواز شامیں
ہمیں کچھ بدل گئے ہیں کہ بدل گیا زمانہ

مجھے بھول جانے والے مجھے یاد آنے والے
تجھے اپنی خلوتوں کا کوئی یاد ہے فسانہ

وہ لبوں کی مے فروشی وہ لبوں کی بادہ نوشی
تمھیں کچھ تو یاد ہوگی وہ حکایتِ شبانہ

مری آرزو سے تیرا وہ نیازِ والہانہ
اسے اب کہاں سے لاؤں وہ گزر گیا زمانہ

○

شاد عارفی

ہونٹوں پر محسوس ہوتی ہے آنکھوں سے معدوم رہی ہے
پھلواری کی نکہت، دلہن"۔ پھلواری میں گھوم رہی ہے

اُس کا "آنچل اور آویزے" میرا ماتھا چوم رہی ہے
پھر بھی "چشم بد طینت" پر "اُلفت لا معلوم رہی ہے"

ہر میکش کی ذہنی لغزش اس محور پر گھوم رہی ہے
جیسے وہ سنبھلا بیٹھا ہے۔ جیسے محفل گھوم رہی ہے

چُننا ہے تو مسکانے سے پہلے چن لو، کوئی کلی بھی
"گلشن میں کھلنے سے پہلے تک" بیشک معصوم رہی ہے

تم عشرت سے فارغ ہو کر مجھ سے پوچھو، میں واقف ہوں
کس کس بے چارے کی خواہش، نغموں سے محروم رہی ہے

اس سے، اُس سے، میری بابت روزانہ سرگوشی یعنی...
بنتے کیوں ہو۔ میری حالت تم کو بھی معلوم رہی ہے

پینے والوں کے کہنے سے، غم سے چھٹکارا پانے کو
پی کر بھی، میری تنہائی، مایوس و مغموم رہی ہے

عارض عارض صبح بہاراں، گیسو گیسو شام نشیمن
وہ کیا جانے، جس کی غفلت، جلووں سے محروم رہی ہے

"میں تخیئلی نخلستاں میں" آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوں
میری مستقبل اندیشی، منزل منزل گھوم رہی ہے

ورنہ سیدھے سادے سجدے، ورنہ ہلکی پھلکی حمد
دُنیا "کیا اور کیوں کے ہاتھوں" بھاری پتھر چوم رہی ہے

ہمدردی کے منہ پر فن کی آنکھیں کھلتی ہیں اے شاد
گویا انسانی ہمدردی، شاعر کا مقسُوم رہی ہے

○

غلام ربانی تاباںؔ

کوئی حریفِ غمِ رہ گزر ملے نہ ملے
ہماری طرح خرابِ سفر ملے نہ ملے

جفا کا دور ہے غم کو اثر ملے نہ ملے
جبیں جھکے نہ جھکے، سنگِ در ملے نہ ملے

غبارِ راہ چلا ساتھ یہ بھی کیا کم ہے
سفر میں اور کوئی ہم سفر ملے نہ ملے

جلا سکو تو جلاؤ تم آرزو کے چراغ
سحر کی راہ نہ دیکھو سحر ملے نہ ملے

خود رقیبِ تماشہ ہے دل رہینِ جمال
وہ کش مکش ہے سکوں عمر بھر ملے نہ ملے

ہوس کو جلوۂ بارِ دگر کا شوق سہی
نظر کو فرصتِ بارِ دگر ملے نہ ملے

پیامِ درد بھی تاباںؔ بہت غنیمت ہے
نجانے دل کی کبھی پھر خبر ملے نہ ملے

خطِ کہکشاں

پروفیسر شور علیگ

جلوے قدم قدم پہ لٹاتی چلی گئی
پردے نظر نظر پہ گراتی چلی گئی

چہرے سے یوں نقاب ہٹاتی چلی گئی
ہر شے کو اک حجاب بناتی چلی گئی

شہرِ شباب و گلکدۂ حسن و عشق میں
ابر و ہوا کے ساز پہ گاتی چلی گئی

بندِ نقاب کھول کے جوشِ بہار میں
ہر و سمن میں آگ لگاتی چلی گئی

ماتھا بھی رنگ، رخ بھی سحر تاب، لب بھی آگ
سر تا قدم شفق میں نہاتی چلی گئی

ملتھے کے ایک قشقۂ رنگیں کی جوت سے
تاروں کا ہر چراغ بجھاتی چلی گئی

ہونٹوں کے اک تبسمِ لعلیں کی فوج سے
بے لفظ و صوت نغمے سناتی چلی گئی

یوں زخمۂ سکوت سے چھیڑا ربابِ شوق
نجم و قمر کو نیند سی آتی چلی گئی

رُخ سے نقاب اُٹھا کے جدھر سے گزر گئی
ذرّوں کو آفتاب بناتی چلی گئی

غمّازیٔ نگاہ سے دل کو اُچھال کر
طوفان ساحلوں سے اُٹھاتی چلی گئی

میری طرف وہ دیکھ کے چپ ہو گئی مگر
آواز ہر نگاہ سے آتی چلی گئی

ناکردہ کاریٔ نگہِ التفات سے
پردہ مرے جنوں کا اُٹھاتی چلی گئی

جو قہقہوں سے جل نہ سکے آرزو کے دیپ
وہ دیپ آنسوؤں سے جلاتی چلی گئی

ہر قہقہے میں دل کے چھپا کر ہزار زخم
خود بھی ہنسی، مجھے بھی ہنساتی چلی گئی

دہکا کے ہر نفس میں غمِ آرزو کی آگ
پھولوں سے گلکدے کو جلاتی چلی گئی

ماتھے کی سلوٹوں سے لبوں کے سکوت سے
مجھ کو مرے فسانے سناتی چلی گئی

موجوں کے پیچ و تاب کو میں سوچتا رہا
وہ ساحلوں کے خواب دکھاتی چلی گئی

اک بحرِ بے کنارِ تمنّا میں ڈوب کر
مجھ کو بھی اپنے ساتھ بہاتی چلی گئی

جن کی شرابِ تند میں کھلتا رہا سرور
اُن زمزموں سے مجھ کو رُلاتی چلی گئی

روح القدس کی آنکھ سے ٹپکے جو بن کے خون
آنکھوں سے وہ شراب پلاتی چلی گئی

سمجھا تھا جس نے ہیں کہیں اپنے وطن کی خاک
اُس کو بھی آسمان بناتی چلی گئی

اپنے وطن میں میں بھی ہوا خانماں خراب
اُس کی نظر بھی ٹھوکریں کھاتی چلی گئی

ٹھہری تو اُس کے ساتھ زمانہ ٹھہر گیا
گزری تو کائنات پہ چھاتی چلی گئی

خلیل الرحمن اعظمی

پینا نہیں حرام ہے زہرِ وفا کی شرط
آؤ اٹھا دیں آج مئے جاں فزا کی شرط

شوریدگیٔ سر کے لیے سنگِ در کی قید
زنجیرِ غم کے واسطے زلفِ دوتا کی شرط

ہو دوپہر کی دھوپ تو پلکوں کے سائبان
راتیں گزارنی ہوں تو کالی بلا کی شرط

یہ کیا ضرور ہو مژۂ عشق خوں فشاں
کیوں دستِ ناز کے لیے رنگِ حنا کی شرط

ہر دلفگار کے لیے کیوں چاکِ پیرہن
ہر دلنواز کے لیے بندِ قبا کی شرط

کیا فرض ہے کہ ہم بھی بنیں قیسِ عامری
راہِ جنوں میں کیوں ہو کسی نقشِ پا کی شرط

کیوں دل کے توڑنے کو کہیں رسمِ دلبری
کیوں ہو کسی سے وعدۂ صبر آزما کی شرط

کیوں ہو کسی کو کوچۂ قاتل کی جستجو
کیوں امتحاں کے واسطے تیغِ جفا کی شرط

کیوں زندگی کو جبرِ مسلسل کا نام دیں
کیوں آرزوئے مرگ کو دستِ دعا کی شرط

یوں ہر گھڑی زباں پہ ہو جرم و سزا کا ذکر
کیوں ہر عمل کی فکر میں خوفِ خدا کی شرط

ہم نے خود آپ اپنے زمانے کی سیر کی
ہم نے قبول کی نہ کسی رہنما کی شرط

○

عبدالمجید حیرتؔ

وہی، سچ تو یہ ہے، کہ کچھ پا گئے
اُدھر سے جو کٹ کر اِدھر آ گئے

فراغت کی راتیں، نہ فرصت کے دن
ہمیں تو یہ دنیا کے غم کھا گئے

بمشکل ہوئی تھی سحر رُونما
سحر ہی سے بادل مگر چھا گئے

نہ جانے، یہ افکارِ تہذیبِ نَو
زمانے کو کیوں اس قدر بھا گئے

رہا ہوش باقی نہ سر پیر کا
مغنّی، معلوم، کیا گا گئے

اُٹھائے گا پھر کون بارِ وفا
اگر اہلِ ہمّت بھی گھبرا گئے

یہ مانا کہ کچھ پھول ایسے بھی تھے
جو سورج کی گرمی سے کملا گئے

مگر، ایسے غنچوں پہ بھی اک نظر
جو مالی کی غفلت سے مرجھا گئے ق

نگاہیں تھیں جن کی بڑی دُور بیں
وہی کون سا رازِ دل پا گئے

وہ آ بھی گئے بہرِ پرسش، تو کیا
خلش کون سی دور فرما گئے

وہی چارہ گر تھے کہ تھکتے نہ تھے
وہی چارہ گر ہیں کہ اُکتا گئے

مسائل کو حیرتؔ کے آساں تو کیا
وہ آئے تو کچھ اور اُلجھا گئے

غمِ جہاں

ظہور نظر

رات کچھ ایسے نمودار ہوا درد کا چاند
سوچ کے گہرے سمندر میں تلاطم آیا
سانس کی چاندنی، دامن میں لیے دل کی ہوا
آہ کی دھند میں ملبوس، کچھ ایسے نکلی
ہر طرف درد کا بے مہر فسوں پھیل گیا

موج در موج بڑھے وقت کے ساحل کی طرف
درد کی جھاگ اُڑاتے ہوئے نمناک خیال
بھیگ کر سرد ہوئی تلخئ احساس کی ریت
دور تک گونج اُٹھا جبرِ مشدّت کا جلال
میں کہ تھا، شدّتِ جذبات سے مبہوت نڈھال
بیٹھ کر گننے لگا آتی پلٹتی لہریں

بادباں کھول کے فردا کا، مرے ماضی و حال
کشتئ ذہن کو گرداب سے ٹکرانے لگے
ساحلِ وقت پہ صدیوں کے نقوشِ کفِ پا
مل کے آپس میں اُلجھنے لگے، چکرانے لگے

مٹ گئیں سمت و جہت، فرش و خلا کی قیدیں
افقِ زیست پہ اک سانحہ نظر آنے لگے
ماضی و حال کی خوں رنگ حقیقت کے نشاں،

وادیٔ یاد میں ہنگامۂ آلام مچا،
کل کے بے رحم زمانوں کی سنانیں چمکیں،
جرمِ آزادیٔ اظہار نے کٹوایا جنھیں
لوحِ تاریخ پہ وہ سُرخ زبانیں چمکیں
ہیروشیما کی طرح جل اٹھا ادراک کا شہر
جنگ کے خونیں فسانوں کی کمانیں چمکیں
اور پھر تیر چلے اتنے کہ افکار کا جسم
دھجیاں بن کے ہر شاخِ تمنّا اُلجھا

آہ کی دھند نے دھندلا دی تخیّل کی فضا
میرا آدرش، مری فکر کا مینارۂ نور
دیکھتے دیکھتے مبہم ہوا، تاریک ہوا
تیرگی، دکھ کے چٹانوں سے اُتر کر پھیلی
راستہ بھول گئے میری بصیرت کے جہاز
فلسفہ کوئی نہ آدرش کوئی راہِ نجات
شدّتِ درد سے چلّایا دلِ درد نواز
آدمی ہو کہ فرشتے ہوں کہ ہو خالقِ کل
سب کو ہے اپنی بقا اپنی اطاعت مطلوب

دہر میں کوئی نہیں بندۂ کمزور کا دوست
ارضِ امجیریا میں والٹیر کے ہم قوم
روز جمہور کا گلرنگ لہو پیتے ہیں
بیسیوں ملکوں میں لنکن کے وطن کے تاجر
لاد کر توپوں پہ ڈالر کا مقدس سکہ
اپنی تقدیر پہ اتراتے ہوئے پھرتے ہیں
چیلے گاندھی کے اہنسا کے پجاری یوگی
آئے دن خون بہاتے ہیں مسلمانوں کا
زورِ شمشیر سے ہر مسئلہ حل کرتے ہیں

فلسفہ کوئی نہ آدرش ہے پائندہ کوئی
اپنی رفتار سے بیزار ہے وہ بادِ شمال
عمر جس کی ابھی پچاس برس کی بھی نہیں
خطۂ روس کا وہ بندۂ آہن کل تک
جس کو اس ملک نے یزداں کی طرح پوجا تھا
ہر بڑے شہر کی زینت تھیں شبیہیں جس کی
ہر بڑے چوک میں استادہ تھے جس شخص کے بت
آج مدفن سے گھسیٹا گیا لاشہ اس کا
جیسے وہ مجرم مرحوم کبھی سرخ نہ تھا

فلسفہ کوئی نہ آدرش ہے پائندہ کوئی
مذہبوں کو نہیں آپس کی لڑائی سے فراغ
تیرگی دکھ کی سہر دہر وہی ہے کہ جو تھی
دورِ افلاک کے اس پار خدائی کا چراغ
لوگ کہتے ہیں کہ جلتا ہے، تو جلتا ہوگا

○

ظہور نظرؔ

تم بھی ہو پہلو میں شمعِ ماہ بھی مدھم نہیں
وادیٔ جاں کا اندھیرا ہے کہ پھر بھی کم نہیں

حسرتِ ناکام و مرگِ آرزو کا غم نہیں
غم تو یہ ہے اب نگاہِ یار میں بھی دم نہیں

دیکھ کر پھولوں کو بھی آتے نہیں یادِ اُس کے لب
اب تخیّل کی رفاقت کا بھی وہ عالم نہیں

اُن کے دل کی کیا خبر لیں ہم کہ مرگِ عشق کا
مدّتیں گزری ہیں اپنے دل میں بھی ماتم نہیں

آنسوؤں سے کتنے دن تک سبز رکھتے برگِ دل
آب کا نعم البدل گُل کے لیے شبنم نہیں

ہم سے اب رکھیے نہ تجدیدِ محبّت کی اُمید
موسمِ گل زخمِ ترکِ عشق کا مرہم نہیں

اس کو اُفتادِ طبیعت کے سوا کیا نام دیں
غم نہیں ہے کوئی پھر بھی وحشتِ دل کم نہیں

دل بیاباں ہو تو پھر آساں نہیں گھر کی تلاش
گھر فقط بام و در و دیوار کا سنگم نہیں

جو بھی ہے دل میں جنوں کہتا ہے سب کہہ دیجیے
عقل کہتی ہے کہ یہ اظہار کا موسم نہیں

ہر گھڑی تنہائی رہتی ہے ہمارے آس پاس
کون کہتا ہے کہ اب اپنا کوئی ہمدم نہیں

بعد ترکِ عشق یہ عقدہ کھلا ہم پر نظرؔ
زندگی کی رہگزر میں کوئی پیچ و خم نہیں

دہر میں کوئی نہیں بندۂ کمزور کا دوست
ارضِ الجیریا میں والٹیر کے ہم قوم
روزِ جمہور کا گلرنگ لہو پیتے ہیں
بیسیوں ملکوں میں لنکن کے وطن کے تاجر
لاد کر توپوں پہ ڈالر کا مقدس سکہ
اپنی تقدیر پہ اتراتے ہوئے پھرتے ہیں
چیلے گاندھی کے اہنسا کے پجاری یوگی
آئے دن خون بہاتے ہیں مسلمانوں کا
زورِ شمشیر سے ہر مسئلہ حل کرتے ہیں

فلسفہ کوئی نہ آدرش ہے پائندہ کوئی
اپنی رفتار سے بیزار ہے وہ بادِ شمال
عمر جس کی ابھی پچاس برس کی بھی نہیں
خطۂ روس کا وہ بندۂ آہن کل تک
جس کو اس ملک نے یزداں کی طرح پوجا تھا
ہر بڑے شہر کی زینت تھیں شبیہیں جس کی
ہر بڑے چوک میں استادہ تھے جس شخص کے بت
آج مدفن سے گھسیٹا گیا لاشہ اس کا
جیسے وہ مجرم مرحوم کبھی سرخ نہ تھا

فلسفہ کوئی نہ آدرش ہے پائندہ کوئی
مذہبوں کو نہیں آپس کی لڑائی سے فراغ
تیرگی دکھ کی سرِ دہر وہی ہے کہ جو تھی
دورِ افلاک کے اس پار خدائی کا چراغ
لوگ کہتے ہیں کہ جلتا ہے، تو جلتا ہوگا

ظہور نظرؔ

تم بھی ہو پہلو میں شمعِ ماہ بھی مدھم نہیں
وادیٔ جاں کا اندھیرا ہے کہ پھر بھی کم نہیں

حسرتِ ناکام و مرگِ آرزو کا غم نہیں
غم تو یہ ہے اب نگاہِ یار میں بھی دم نہیں

دیکھ کر پھولوں کو بھی آتے نہیں یاد اُس کے لب
اب تخیّل کی رفاقت کا بھی وہ عالم نہیں

اُن کے دل کی کیا خبر لیں ہم کہ مرگِ عشق کا
مدّتیں گزری ہیں اپنے دل میں بھی ماتم نہیں

آنسوؤں سے کتنے دن تک سبز رکھتے برگِ دل
آب کا نعم البدل گُل کے لیے شبنم نہیں

ہم سے اب رکھیے نہ تجدیدِ محبّت کی اُمید
موسمِ گل زخمِ ترکِ عشق کا مرہم نہیں

اس کو اُفتادِ طبیعت کے سوا کیا نام دیں
غم نہیں ہے کوئی پھر بھی وحشتِ دل کم نہیں

دل بیاباں ہو تو پھر آساں نہیں گھر کی تلاش
گھر فقط بام و در و دیوار کا سنگھم نہیں

جو بھی ہے دل میں جنوں کہتا ہے سب کہہ دیجیے
عقل کہتی ہے کہ یہ اظہار کا موسم نہیں

ہر گھڑی تنہائی رہتی ہے ہمارے آس پاس
کون کہتا ہے کہ اب اپنا کوئی ہمدم نہیں

بعد ترکِ عشق یہ عقدہ کھلا ہم پر نظرؔ
زندگی کی رہگزر میں کوئی پیچ و خم نہیں

○

شفقت کاظمی

جب کبھی تیری شکایت کی ہے
ہم کو یاروں نے ملامت کی ہے

چاند تاروں سے محبت کی ہے
ہم نے یوں بھی تیری چاہت کی ہے

کچھ ترے ظلم کا رونا روئے
کچھ نصیبوں کی شکایت کی ہے

ہم کو پردیس میں تنہا پاکر
تیری یادوں نے رفاقت کی ہے

درخورِ جور بھی کب تھے ہم لوگ
واقعی تم نے عنایت کی ہے

عمر بھر ہم سے وہ بیگانہ رہے
عمر بھر جن سے محبّت کی ہے

بات لفظوں میں کہی کچھ ہم نے
کچھ اشاروں میں صراحت کی ہے

گلشنِ دہر میں ہم نے شفقت
چند کلیوں پہ قناعت کی ہے

○

مصطفےٰ زیدی

بیٹھا ہوں سیہ بخت و مکدّر اسی گھر میں
اُترا تھا مرا ماہِ منوّر اسی گھر میں

اُس سانس کی خوشبو، لب و عارض کے پسینے
کھولا تھا مرے دوست نے بستر اسی گھر میں

چٹکی تھیں اسی کنج میں اُس ہونٹ کی کلیاں
مہکے تھے وہ اوقاتِ میسّر اسی گھر میں

افسانہ در افسانہ تھی مڑتی ہوئی سیڑھی
اشعار در اشعار تھا ہر در اسی گھر میں

ہوتی تھی حریفانہ بھی ہر بات پہ اک بات
رہتی تھی رقیبانہ بھی اکثر اسی گھر میں

شرمندہ ہوا تھا یہیں پندارِ امارت
چمکا تھا فقیروں کا مقدّر اسی گھر میں

وہ جن کے درِ ناز پہ جھکتا تھا زمانہ
آتے تھے بڑی دُور سے چل کر اسی گھر میں

○

نور بجنوری

کیسے کیسے خواب دیکھے تھے دلِ سودائی نے
کچھ دنوں ہم کو بھی چاہا تھا کسی ہرجائی نے

شہرِ دل میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بچھ گئیں
ہائے کیسا حشر برپا کر دیا شہنائی نے

زخم کا پرچم اٹھائے کون یہ آگے بڑھا
پے بہ پے سجدے گزارے درد کی پروائی نے

کچھ تو پہلے ہی سے دل دادہ تھے طوفانوں کے ہم
اس پہ للکارا نشیلی آنکھ کی گہرائی نے

ہم تری بستی سے جب مایوس ہو کر چل دیے
نام لے لے کر پکارا دور تک رسوائی نے

شعر و نغمہ، رنگ و بو، عقل و جنوں، دیر و حرم
کتنے ہنگامے تراشے ہیں مری تنہائی نے

○

یوسف جمال انصاری

آج ہوائے صبحِ بہاراں لے کر آئی کس کا سلام
کانوں میں رس گھول رہا ہے آج یہ کس کا میٹھا نام

پتّی پتّی لالہ و گُل کی جیسے کسی کا ہو مکتوب
بادِ صبا کی ہر ہچکی ہیں جیسے کسی کا ہو پیغام

دامن چاک ہے، بھیگی پلکیں، آنکھیں آٹھ پہر بیخواب
کوئی گُلوں کے جی سے پوچھے، حُسن ہے کتنا غم انجام

غنچہ غنچہ رازِ محبّت، پتّی پتّی حرفِ وفا
نکہت و رنگ کے پردے میں بھی کتنے اشارے، کتنے پیام

عالم عالم رُسوائی ہے اہلِ وفا کی قسمت میں
ایک محبّت لاکھ فسانے، ایک تمنّا سَو الزام

خواب سے تھا مخمور زمانہ، درد سے تھی معمور فضا
پچھلے پہر کے سنّاٹے میں خاموشی بھی تھی کہرام

ترک و طلب کی منزل ہے اور آج دلِ دیوانہ ہے
دردِ محبّت شمع کی لو ہے، دردِ زمانہ ماہِ تمام

سراب

فارغ بخاری

بچوں کی مانند زمانہ
امیدوں کے رنگارنگ کھلونے دے کر
بہلاتا ہے ہم کو

مٹی کے یہ ہاتھی، گھوڑے
ٹین کی موٹر، لاری
پل بھر ان کی یاری

کانچ کا راجا
موم کی رانی
ان کا روپ پرایا، ان کی سندرتا آنی جانی

جگ مگ کرتے تاج محل
یہ قوس قزح کی کھال کے گول غبارے
میٹھی میٹھی سی یہ خوابیں
سپنے پیارے پیارے
جیسے شفق میں ڈوبتا سورج، جیسے ٹوٹتے تارے

رُت کی ریت

خاطر غزنوی

پیلی دھوپ پہ بادل نے پھیلا دی چادر میلی سی
چلی ہوا ترکش میں لے کر تیر پرانے
سمٹ گئے شاخوں پر پنچھی
جیسے شاخ پہ لگے لگے پھل سُوکھ گیا ہو
تیز ہوا کے جھونکوں کی محکوم ہیں شاخیں
ٹوٹ ٹوٹ کے سوکھے پتّے پیڑوں سے

کھیتوں،

راہوں،

پگڈنڈیوں پر پھیل رہے ہیں
ڈھانپ رہے ہیں اُس تالاب کا عریاں سینہ
جس کا پانی سُوکھ گیا ہے۔
جس کے ہونٹوں پہ پپڑی سی جمی ہوئی ہے
بادل گہرے ہو کر پھیل گئے ہیں ہر سُو
جیسے چھت پر کہگل سی کر دی ہو کسی نے
دھیرے دھیرے گرنے لگی ہے ساری کہگل
جیسے پن چکی کی اندھیری کٹیا میں پستی گندم کی اُجلی دھول
اب تو ہر شے پر اک تہہ سی جمی ہوئی ہے
پسی ہوئی گندم کی
پیڑوں، شاخوں، تالابوں پر
سمٹے پنچھی بھی اب دھول میں اَٹے ہوئے ہیں
اب تو زیست کا سرمایہ ہیں برف کے پھول

جمیل ملک

کعبہ و دیر سے پتھّر کے صنم نکلیں گے
جب باندازِ جنوں شہر میں ہم نکلیں گے

وہ بھی شمشیر بکف ، نعرہ بلب آئیں گے
ہم بھی ہاتھوں میں لیے لوح و قلم نکلیں گے

آج گمنام پڑے ہیں، تو شکایت کیسی!
کل اسی راہ سے ہم لوگ ، بہم نکلیں گے

ماہ و خورشید لبِ بام اُتر آئیں گے
یوں، شبِ تار، تری زلف کے خم نکلیں گے

جن کا سینہ بھی کشادہ ہو، زباں بھی شیریں
ایسے دو چار ہی اربابِ کرم نکلیں گے

کس لیے ڈھونڈتی پھرتی ہے ہمیں موجِ بلا!
جو شناور ہیں وہ ہمرازِ عدم نکلیں گے!

ذات کو ہم نے بنایا ہے گزرگاہ حیات
ہم سے درویش بھی اس دور میں کم نکلیں گے

○

عروج زیدی

پاتا ہوں اگر دوست کو سرگرمِ جفا اور
بڑھ جاتی ہے پابندیٔ تسلیم و رضا اور

گو فرق مسلّم ہے مگر یہ نہیں تسلیم،
تاروں کا خدا اور ہے ذرّوں کا خدا اور

آواز بتاتی ہے کہ دل ٹوٹ گیا ہے
یعنی ہے مرے دل کے دھڑکنے کی صدا اور

پلکوں پہ جو ٹھہرے ہیں کہاں تک اُنھیں روکوں
معلوم یہ ہوتا ہے کہ برسے گی گھٹا اور

کیوں میں کرمِ دوست کو محدود بناؤں؟
رحمت کا تقاضا ہے کہ سرزد ہو خطا اور

انسان بھی اس دور میں یک رنگ نہیں ہے
دل اور، زباں اور، طلب اور، دعا اور

اُس وقت کوئی جبر کی مختاریاں دیکھے
جب سعیٔ بشر اور ہو، منظورِ خدا اور

گو شاخ پہ ہم پہلو و ہم دوش ہیں لیکن
پھولوں کی ادا اور ہے کانٹوں کی ادا اور

اے دوست! میں جس دور میں شایانِ کرم تھا
محسوس یہ ہوتا ہے کہ تھے ارض و سما اور

اُس رُخ پہ عروج اپنی نگاہیں نہ جماؤ
بڑھ جائے گی کچھ شوخیٔ انداز و ادا اور

○

حمایت علی شاعر

پندارِ زہد ہو کہ غرورِ برہمنی
اس دورِ بت شکن میں ہے ہر بُت شکستنی

صرصر چلے کہ تند بگولوں کا رقص ہو
موجِ نمو رواں ہے ہر گل شگفتنی

گل چین و گل فروش کی خاطر ہے فصلِ گل
اور قسمتِ جنوں ہے فقط چاک دامنی

دیوارِ ابر کھینچے کرنوں کی راہ میں
ذرّوں میں قید کیجیے سورج کی روشنی

موجِ نفس سے لرزتے ہے تارِ رگِ حیات
پھیلی ہے شہرِ دل میں وہ پُرہول سنسنی

کل تک تھا جس پہ ناز وہی شاعرِ غریب
احباب کی نگاہ میں ٹھہرا ہے گشتنی

○

رفعت سلطان

وہ ہے مرا خدا کہ صنم، سوچتا ہوں میں
اک نام کرکے دل پہ رقم، سوچتا ہوں میں

تیری گلی میں ترکِ محبت کے باوجود
کیوں رُک گئے ہیں میرے قدم، سوچتا ہوں میں

صبحِ طرب تو خیر مقدّر کی بات ہے
گزرے گی کیسے شامِ اَلم، سوچتا ہوں میں

تو میرے ساتھ زیست کی راہِ طویل پر
کیوں چل سکا نہ چار قدم، سوچتا ہوں میں

تم کو بھی جستجوئے مسرّت نہ ہو کہیں
اے رہروانِ منزلِ غم، سوچتا ہوں میں

دنیا میں تیرے حُسنِ مقدّس کے باوجود
کیوں بن گئے ہیں دیر و حرم، سوچتا ہوں میں

ہنس تو دئے ہیں آپ مرے حال پر، مگر
سمجھوں اسے کرم کہ ستم، سوچتا ہوں میں

خوشیاں جسے نصیب تھیں رفعتؔ، وہ زندگی
کیوں بن گئی ہے پیکرِ غم، سوچتا ہوں میں

گڑیوں کا بیاہ

محمد علوی

اب گڑیوں کا بیاہ رچالے
مُنّی رانی جی بہلالے

کل کو اُٹھ کر جب تو اپنی ماں سے اُونچی ہو جائے گی
پھر نہ یہ مہندی ہاتھ لگے گی پھر نہ یہ چنری لہرائے گی
پھر نہ یہ گھونگھٹ منہ چومے گا پھر نہ کبھی یوں شرمائے گی
پھر نہ بجے گی یہ شہنائی پھر نہ سکھی بابل گائے گی
پھر نہ کوئی گھوڑا آئے گا پھر نہ کوئی ڈولی جائے گی
بچپن کی یہ یاد تجھے پھر خون کے آنسو رُلوائے گی
پھر تو اپنے آپ کو مُنّی گڑیوں سے کمتر پائے گی

اب گڑیوں کا بیاہ رچالے
مُنّی رانی جی بہلالے!

آگ میں اُڑان

جلیل ہشمی

یاد آرہے ہیں ناگ کے گھائل نرت کے رُوپ
سائے نہ اُس کو دُور تھے دھرتی کی کوکھ کے،
پھیلی تھی چار کھونٹ یہی دوپہر کی دُھوپ
پاتال تک کا گیانی لگے جیسے وہ نہ تھا
(جیسے لچکتی شاخ کو پت جھڑ مروڑ دے)
سیکھا نہیں تھا اُس نے کبھی جیسے رینگنا،

تھال آگ کا سروں کو کہیں چھُو گیا اگر
جیو چھُپ رہے ہیں قُتی کے انگور کی طرح
ہوگا لہُو پہ کائی جمانے کا بھی ہنر؟
اس دوپہر میں بھاڑ سے انبر پہ ایک چیل
آفاق سوز اگست کے سورج کی چھاؤں میں
طے کر رہی ہے جلتے ہوئے کوس، تپتے میل
صحرائے بے اماں کا سفر، آگ میں اُڑان

اور یہ صدائے نغمہ، خنک چاندنی سی دُھن
جنگل میں بہتی ندی کی لہروں سی دھیمی تان
ابر کے گرم تانبے پہ آواز کے خطوط
یہ آرتی کے تھال کے پھیرے، طوافِ دہر،
ــــ وہ ناگ میرے ذہن کے اہرام میں حنوط
کے پیرہن کو پھاڑ کے بل کھا رہا ہے کیوں
کائی ابھی جمی نہیں اس بے بہا پتھر پر
رقصاں ابھی تو ہے رگ و ریشہ میں جوئے خوں
پاتال تک کا گیان نہیں چاہیے مجھے
مجھ کو غروب ہونا سکھائے جو قبر میں
جو روشنی کے قرب میں دم توڑ توڑ دے،
میں دوپہر کا راہی ہوں لیکن مجھے یہ لوگ
کہتے ہیں اپنی آنکھیں جلاتا ہوں دھوپ میں
چپ ہوں، میری زبان نہیں جانتے یہ لوگ

کس کو بتاؤں دھوپ ضیاء زندگی کی ہے
یہ آگ میں اُڑان، یہ شبنم سی نرم دُھن
کوئی تو سیکھ لو کہ ادا زندگی کی ہے

○

اختر ہوشیار پوری

زخم مہکے ہیں کہ پھولوں سے صبا ملتی ہے
شہرِ دل میں ترے کوچے کی فضا ملتی ہے

پھول کیا جانئے کیا سوچ کے لب بستہ ہیں
ہم تو یوں چپ ہیں کہ جینے کی سزا ملتی ہے

کوئی وحشی کوئی بھٹکا ہوا آہو جیسے،
یوں تری یاد سرِ شہرِ وفا ملتی ہے

آرزو! تجھ میں تو اُن کی سی کوئی بات نہیں
زندگی! تجھ میں تو اپنی ہی ادا ملتی ہے

جب کوئی پتہ لرزتا ہے تو کانپ اُٹھتا ہوں
کہ اس آواز سے کچھ دل کی صدا ملتی ہے

میری راتیں ترا اندازِ محبت ترا لطف
میرے ملنے سے تری زلفِ رسا ملتی ہے

جب زمانے میں خزاں دیکھو یہاں آجانا
میرے سینے میں بہاروں کی فضا ملتی ہے

آرزو ہو تو زماں کیسا مکاں کیا اختر
بوئے گل اُڑ کے سرِ راہ بھی آملتی ہے

بشیر بدر

مجھ کو براہِ راست کوئی تجربہ نہیں ‏— ان گل رخوں میں کہتے ہیں بوئے وفا نہیں

کچھ بے وفائیاں بھی ضروری ہیں عشق میں — ورنہ خدا گواہ ہے، میں بے وفا نہیں

شوقِ گناہ و عزمِ بغاوت نہیں رہا — یہ کم سزا نہیں ہے کہ کوئی سزا نہیں

اس دشتِ غم میں، غم کے سوا کون آئے گا — چپ چاپ سو رہو، یہ کسی کی صدا نہیں

کیا کیا ہوا بیاں کے لیے عمر چاہیے — یوں پوچھ لیجیے کہ ابھی کیا ہوا نہیں

میرا خدا تو سب کا رحیم و کریم ہے — جو صرف آپ کا ہے وہ میرا خدا نہیں

لب امتیازِ شعلہ و گل خود نہ کر سکے — اپنے کیے کی کوئی دوا و دعا نہیں

ہم صرف شب کو رو لیے، بس اور کیا کیا — کس منھ سے پھر کہیں کوئی اپنا ہوا نہیں

صحرا کی وسعتیں مری وحشت کا عکس ہیں — اب سازگار شہر کی آب و ہوا نہیں

یہ آگ بجھ رہی ہے، اسے اب ہوا نہ دو — تم سے تو کوئی راز ہمارا چھپا نہیں

اے موت تیرے ہاتھ میں کیا سحر خواب ہے — جس کو سلا دیا وہ ابھی تک اٹھا نہیں

خوابوں کے قافلے کہیں زلفوں میں سو گئے — آنکھوں میں آج نیند کا کوسوں پتہ نہیں

آئینہ مجھ کو جانیے حیرت نہ کیجیے — خود آپ سامنے ہیں کوئی دوسرا نہیں

شکرِ خدا نظر کبھی نیچی نہیں ہوئی — یہ سر بھی آج تک کبھی بے جا اُٹھا نہیں

ایسے تعلقات کو جو چاہو نام دو — اتنا قریب کوئی تمھارے سوا نہیں

حسن وفا نواز، ترا شکریہ مگر — اتنا اُداس دل کبھی پہلے ہوا نہیں

رنج اُس نے کچھ سوا دیئے یہ حق اُسی کا تھا — اتنا قریب دوسرا کوئی رہا نہیں

مجبورِ فراق ہے اے بدر دخترِ رز
لازم تھا احترام اُدھر رخ کیا نہیں

شکیب جلالی

وہ کون ہے جو تمھارا سراغ پا نہ سکا
کہ میں تو اپنے ہی صحرا کے پار جا نہ سکا

وہ اپنا معنوی چہرہ مجھے دکھا نہ سکا
اس آئنے سے کوئی بھی نظر ملا نہ سکا

یہ ٹھنڈی آگ جدا ہے بدن کے شعلے سے
بدن کا شعلہ مری روح کو جلا نہ سکا

کسی کی بات تھی جو اُس نے ڈھال دی مجھ پر
وہ آج خود تو ہنسا پر مجھے ہنسا نہ سکا

اسی لیے تو اُجالا ہے میرے سینے میں
میں بھول کر بھی کسی کا دیا بجھا نہ سکا

کچھ اتنے ہاتھ بڑھے تھے مجھے گرانے کو
کہ ڈگمگانا بھی چاہا تو ڈگمگا نہ سکا

وہ پیرہن ہوں میں اپنے برہنہ جذبے کا
جو کوئی زخم تری آنکھ سے چھپا نہ سکا

جو لوحِ دل ہوئی ٹکڑے تو یہ خیال آیا
کہ میں بھی سنگ اُٹھاؤں مگر اٹھا نہ سکا

شکیب روح میں طوفاں کا شور باقی ہے
میں اپنا درد کسی ساز پہ سنا نہ سکا

○

آتش لودھیانوی

کیسے ہو اُس سے ملاقات اسی سوچ میں ہوں
بن ملے کیسے بنے بات اسی سوچ میں ہوں

وہ مرے دل کے قریں ہو کے بھی ہے مجھ سے دور
کیسے بدلیں گے یہ حالات اسی سوچ میں ہوں

میں نے سوچا تھا کہ وہ دن بھی ضرور آئے گا
میری اُمیدوں کے گلشن میں بہار آئے گی

یہ خزاں جو کہ مسلّط ہے ہر اک سمت ابھی
اک نہ اک روز بہت دور چلی جائے گی

کیا ہوا آج اگر دُور ہے وہ جانِ قرار
دل کے ویرانے پہ کل بن کے گھٹا چھائے گی

آج جو موجِ ہوا صورتِ صرصر ہے رواں
دل کے غنچے کو صبا بن کے یہ مہکائے گی

میں نے سوچا تھا کہ یہ فاصلے کٹ جائیں گے
دل سے اُس زلف کی ہو جائے گی ہمسائیگی

پیار کی جلتی ہوئی شمع کی بے نُور سی لَو
اُس تبسّم کی ضیاؤں سے جلا پائے گی

زندگی ہجر کی راہوں میں جو ہے نوحہ بلب
وصل کے ساز پہ نغمے بھی کبھی گائے گی

کب ڈھلے ہجر کی یہ رات اسی سوچ میں ہوں
ہو گی کب صبحِ مکافات اسی سوچ میں ہوں

○

بشیر منظر

اب نہ پھولوں سے رکھیں گے رغبت
ہم سے کانٹوں کو گلہ رہتا ہے

پتّہ کھڑکے، کوئی غنچہ چٹکے
دل کو دھڑکا سا لگا رہتا ہے

کچھ بتاؤ یہ ہوا کیسی ہے؟
پھول کا رنگ اُڑا رہتا ہے

گھر ہے سنسان سا اک ویرانہ
شہر میں شور بپا رہتا ہے

غم ترے، داغ ترے، یاد تری
دل میں گلشن سا کھلا رہتا ہے

○

غلام رسول طارق

عشق میں جو بھی در بدر ہو گا
وہی انسان معتبر ہو گا

گریۂ شب نہیں اگر شبنم
صبحِ صادق کا دیدہ تر ہو گا

یہی عالم رہا اگر کچھ روز
کون پھر کس کا منتظر ہو گا

بام و در پر نگہ نہیں ہو گی
یونہی الزام چاند پر ہو گا

لا دوا درد کے سوا طارق
اور کیا حاصلِ نظر ہو گا

احمد ندیم قاسمی

سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ شہباز کا قد بہت چھوٹا تھا۔ لوگ اس کے قریب سے گزرتے تو اسے یوں دیکھتے جیسے وہ سب کا برخوردار ہے۔ اور جیسے وہ کترا کر نہ نکلا تو اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیں گے۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں جنھیں وہ ہر صبح گھی سے چپڑتا تھا۔ اس نے قلمیں بھی کانوں کی لووں تک پھیلا لی تھیں۔ وہ اپنے پٹوں میں ہاتھی دانت کا ننھا سا قوسی کنگھا کچھ اس ادا سے لگاتا تھا کہ وہ اس کے دو طروں والی پگڑی سے بھی نہیں چھپتا تھا۔ ہر روز ڈاڑھی منڈاتا تھا۔ دھاری دار بوسکی کے کرتے میں سیپ کے بٹنوں کی بجائے چاندی کی زنجیر لٹکا رکھی تھی جس کے آخری سرے پر گھونگھریاں لگی تھیں، اور وہ ہر قدم پر یوں بجتی تھیں جیسے چڑیوں کے گھونسلوں میں ان کے بے پر بچے بولتے ہیں۔ پھر اس کے ہاتھ میں تبر رہنے لگی تھی جس کا چوبی دستہ اس کے قد سے ذرا ہی کم تھا۔ اتنے اہتمام کے باوجود لوگ اس سے بے خبر گزر جاتے تھے، یا بعض من چلے اس کی ہئیت دیکھ کر مسکرا دیتے تھے، اور اگر پوچھتے تھے کہ "آج کدھر کی مار ہے شہباز خان؟" تو ان کا لہجہ کچھ ایسا ہوتا تھا، جیسے پوچھ رہے ہیں "آج کہاں مار کھانے چلے ہو شہباز؟"

ماں باپ کا اکلوتا بیٹا نہ ہوتا تو اس کی جوانمردی کو ہل کی پھال برسوں پہلے کھود کر ہموار کر چکی ہوتی، مگر وہ والدین کی آخری عمر کی کمائی تھا اور اس کے باپ کو یقین تھا کہ اگر وہ اپنے بازو دیں، اور اس کی بیوی اپنے پیڑو میں تعو نہ باندھتی تو دوسرے لڑکوں کی طرح شہباز بھی کسی دوسرے گھر میں جنم لے چکا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے شہباز کو ایسے چاؤ چونچلوں سے پالا کہ دس برس کی عمر تک وہ روٹی کو بوتی کہتا رہا۔ پھر جب اس کی مسیں بھیگیں اور کندھے پر ہل پنجالی رکھ کر کھیتوں کی راہ لینے کا زمانہ آ گیا تو ماں باپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ان کے دم میں دم ہے، شہباز کھیت کھلیان کا کام نہیں کرے گا۔ اسی لیے انھوں نے اپنے مکان کے پچھواڑے میں دروازہ نکلوا کر اسے دوکان کھول دی مگر پانچ چھ مہینے ہی میں اس نے دکان کو برابر کر دیا۔ اور جس روز دکان کا دروازہ چنوایا گیا، تو یکایک سارے گاؤں میں یہ خبر جیسے کود پڑی کہ شہباز کو لڑکیوں نے لوٹا ہے۔ یہ نئی نئی جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں اکا دکا کر کے شہباز کے پاس ایک ایک کر کے آتیں، اس کی طرف پیار سے دیکھتیں "ہائے وے شہباز، تیری آنکھیں تو بن سرمے سرمیلی ہیں" جیسی باتیں کرتیں، اور شہباز انھیں دو دو سیر گڑ مفت ہی تول دیتا۔ شہباز نے بھی یہ باتیں سنیں۔ اسے بہت غصہ آیا مگر وہ کس کس سے نمٹتا۔ دن بھر دکان کے چنے ہوئے دروازے کے پاس گلی کے نکڑ پر بیٹھا گھی لگی مونچھیں مروڑتا رہا کہ شاید کوئی اس کا مذاق اڑانے کا حوصلہ کرے اور وہ اس کی بوٹیاں اڑا دے، مگر لوگ اس کے قریب سے یوں ٹھرا کر نکلتے چلے

گئے، جیسے شہباز کے روپ میں وہاں کوئی جوان ننگی لڑکی بیٹھی تھی۔

عصر کی اذان کے ساتھ ہی لڑکیاں دو دو گھڑے سروں پر سجائے ٹولیاں بنائے گھروں سے نکلیں تو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اور دکان کے پچنے ہوئے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے ہنسی پر بہت ضبط کیا، مگر جب ایک بے قابو ہو گئی تو سب ہنس دیں اور اتنی ہنسیں کہ اللہ دین کی منگیتر جنت کا تو ایک گھڑا بھی گر کر ٹوٹ گیا۔ اور جب جنت چلی گئی تو وہ دیر تک گھڑے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جیسے بیٹھا جوڑتا رہا۔

اس روز شہباز نے کھانا بھی نہ کھایا اور لحاف میں منہ چھپا کر روتا بھی رہا۔ مگر آدھی رات کو ایک دم اس کے جی میں جانے کیا آئی کہ اٹھا اور باپ کی پرانی تبر کو کھونٹی پر سے اتار کر انگشتِ شہادت کی پور پہ اس کی دھار آزماتا رہا اور پھر گہری نیند سو گیا۔

کانوں کی لووں تک قلمیں اس کے بعد ہی بڑھیں۔ پٹوں میں ہاتھی دانت کا کنگھا انھی دنوں سجا۔ بوسکی کے کرتے میں چاندی کی زنجیر اسی زمانے میں چھپائی۔ اور پگڑی میں ایک اور طرّے کا اضافہ بھی جبھی ہوا۔ مونچھیں تو خیر پہلے سے موجود تھیں البتہ اب زیادہ نکیلی ہو گئیں۔ اِدھر اس کے ہاتھ میں بالشت بھر کی قوسی دھار والی تبر آ گئی۔ اس ہیئت کے ساتھ اس کی چال میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ چلتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے تک کا انداز بدل گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی دستے کے ساتھ پریڈ کر رہا ہے اور آئزرائٹ اور آئز لفٹ کرتا جاتا ہے۔ لوگوں نے اس اہتمام کا صرف اتنا سا اثر قبول کیا کہ اس پر ذرا کھُل کر مسکرانے لگے اور ایک بار گاؤں کے نامی بدمعاش دلیر نے تو قہقہہ مار کر یہ تک کہہ دیا کہ "نہ نہ، شہباز کو یوں ہاتھ بھر کا نہ دیکھو۔ جتنا زمین کے اوپر ہے، اتنا زمین کے اندر ہے۔ ہم میں سے کون جوانمرد ایسا ہے جس نے گاؤں کی ایک ایک لڑکی کو ایک ایک بوری گڑ کھلا دیا ہو۔ ہم تو کسی کو ایک ریوڑی بھی دیں تو جان کو آ جاتی ہے۔" اس پر خوب قہقہے پڑے۔

مگر اس روز دلیر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جب شام کے بعد اس کی چوپال پر کوٹھے کے وسط میں الاؤ انگاروں میں بدل گیا اور لوگ گاؤں کی سیاسیات پر باتیں کرتے کرتے اونگھنے اور اپنے گھروں کو جانے کی تیاریاں کرنے لگے، تو چوپال کا ایک کواڑ ایک لمبی بھیانک چیخ کے ساتھ کھُلا اور شہباز اپنی تبر سمیت اندر آ گیا۔

"دلیر خاں!" شہباز نے وہیں لوگوں کے جوتوں میں کھڑے ہو کر کہا "آج تم نے بھری گلی میں میری ہنسی اڑائی ہے مگر بھائی نہ دلیری نام سے آتی ہے نہ جوانمردی قد سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سارا جھگڑا حوصلے کا ہے اور مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں تمہاری ہی چوپال پر، تمہارے ہی دس پندرہ آدمیوں کے درمیان، بالکل اکیلا آؤں اور کہوں کہ آج کے بعد میری ہنسی نہ اُڑانا۔ کہیں مجھے اپنی تبر سب سے پہلے تمہی پر نہ آزمانی پڑ جائے۔"

ایک بار تو چوپال پر جیسے اُلّو بول گیا مگر پھر دلیر مسکراتا ہوا اُٹھا اور شہباز کے پاس آ کر بولا "مزے آ گئے بھائی شہباز خاں! تبر کو وہاں کونے میں رکھ دے اور آ، میری چھاتی سے لگ جا۔ آج سے تو میرا یار ہے۔"

دلیر سے یاری کے بعد لوگوں کو شہباز پر ہنسنے کا حوصلہ تو کبھی نہ ہوا لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دلیر کی چوپال پر شہباز کی حیثیت حقہ تازہ کرنے والے سے زیادہ نہیں ہے۔ خود شہباز بھی جانتا تھا کہ دلیر مجھے میرے قد سے زیادہ نہیں اُبھرنے دیتا۔ خاص طور سے

اس وقت تو وہ اپنے آپ کو دھرتی میں دھنستا ہوا محسوس کرتا تھا جب دلیر اور اس کے ساتھی اپنے اپنے کارناموں کے قصے لے بیٹھتے تھے اور دشمن کو قتل کر کے اس کی ہڈیاں تک غائب کر دینے کی داستانیں سناتے تھے۔ پھر جب سب اپنے اپنے معاشقوں اور اغواؤں کا ذکر کرتے تھے تو شہباز کے دل میں جنت کے ساتھ منتقمانہ محبت کا جذبہ پٹاخے سے چھوٹتا رہ جاتا تھا کیونکہ اب اللہ دین سے اس کی شادی ہو گئی تھی اور اللہ دین بڑا دبنگ قسم کا شوہر تھا جس کا ہاتھ ذرا ذرا سی بات پر سیدھا بیوی کی چوٹی کی طرف لپکتا تھا۔

ایک بار چوپال کا دروازہ اندر سے بند کر کے لوگ اپنے اپنے پستولوں اور ریوالوروں کو جانچ تول رہے تھے جب دلیر نے اپنا ریوالور کھول کر دیکھا اور پھر شہباز کی طرف تان کر مسکرانے لگا۔ اس پر جب شہباز بھی مسکرانے لگا تو دلیر نے کہا "مسکراہٹ شہباز خاں۔ ریوالور بھرا ہوا ہے۔ انگوٹھے والی انگلی کو ذرا سا دباؤں تو تیرا بھیجا سامنے دیوار سے جا چپٹے۔" پھر اس نے تنتے ہوئے ہاتھ کو حرکت سی دی۔ ریوالور کے دہانے میں خفیف سی جنبش ہوئی اور دلیر نے گھوڑا دبا دیا۔ گولی تڑ سے نکلی اور شہباز کو ایسا لگا جیسے وہ اس کے دونوں طرف کے بیچ میں سے اس کی پگڑی کے بالائی پیچ کو چاٹتی ہوئی نکل گئی ہے۔ سب لوگ پہلے تو سناٹے میں آ گئے۔ پھر دلیر کو ہنستا دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے اور اتنے ہنسے کہ شہباز غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جب وہ اٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے سینے اور پیٹ کا پسینہ اس کی رانوں پر بہ نکلا ہے، اور وہ کانپ رہا ہے، اور اس کا منہ کھلا ہے، اور پپوٹے اکڑ گئے ہیں۔ ایک پل کے لیے اس کا جی چاہا کہ مارے شرم کے، اپنا سر سامنے چولہے میں بھری ہوئی بھوبھل میں دے مارے، مگر پھر وہ ایک دم سنبھلا اور زبان کو منہ میں گھما کر اور حلق کو تر کر کے بولا "تمہارا نشانہ خراب ہے دلیر خاں۔ ریوالور میرے ہاتھ میں دو تو تمہیں بتاؤں کہ بھیجا کس طرح دیوار سے جا چپٹتا ہے۔"

اس پر ایسی سنسناتی ہوئی خاموشی چھا گئی جیسے گولی پھر سے چل گئی ہے۔ لوگ اس لیے سہم گئے تھے کہ شہباز نے دلیر کے بھیجے کو دیوار پر دے مارنے کی دھمکی اس وقت دی تھی جب بھرے ہوئے ریوالور میں سے صرف ایک گولی چلی تھی اور ریوالور ابھی تک دلیر کے ہاتھ میں تھا۔ مگر دلیر نے ریوالور زمین پر رکھ کر ہاتھ بڑھایا اور بولا "ہم یار بناتے ہیں تو یونہی نہیں بنا لیتے ہیں۔" اس کے بعد وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا اور لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

"یہ پٹھا تو نرا قہر ہے۔"

"دلیر سیانا ہے۔ بات کو بڑھنے نہیں دیتا ورنہ آج شہباز کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔"

"لو اور سنو۔ جس شخص نے اب تک ایک چڑیا نہیں ماری وہ دلیر کو قتل کرے گا؟ دلیر کا خون کرنے سے پہلے کسی اور کا تو خون کر لے۔"

"باتوں میں بیٹھتا ہے۔ کبھی قتل بھی کرے گا۔"

"جی نہیں۔ بالشت بھر کے قد والے لوگ چھرا دشمن کے پیٹ میں مارتے ہیں تو وہ ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل جاتا ہے۔"

اس پر زور کا ایک قہقہہ پڑا اور آخری فقرہ بولنے والا بولے چلا گیا "بنتا ہے۔ آج تک تم نے سنا ہے کہ اس نے کبھی دسوبی میراثی کے بھی ایک تھپڑ مارا ہو؟ مونچھیں اور قلمیں تو ہیجڑے بھی بڑھا سکتے ہیں۔ تمہی بتاؤ، آج تک کسی ایک بھی لڑکی کے ساتھ اس کی بدنامی ہوئی؟ ایک بار جنت کو گھورا تھا تو اس نے اپنا بھرا ہوا گھڑا اس کے سر پر دے مارا تھا۔" اس پر سب ایک بار پھر ہنسے۔

"اور اب کے گھوڑے تو مارا جائے۔ اللہ دین کی گھوری سے تو دلیر خاں بھی ڈرتا ہے۔ نہ جانے دلیر خاں کو اس سے کیا کام لینا ہے کہ ساتھ لگائے پھرتا ہے ورنہ میں تو اس ٹٹے کو نوکر بنا کر بھی ساتھ نہ رکھوں۔ خواہ مخواہ آدمی کو جھک کر بات کرنی پڑ جاتی ہے۔ دلیر خاں مجھ سے کہے تو شہباز کے سر پر ایسا ہاتھ ماروں کہ سارے کا سارا زمین میں اتر جائے۔ قبر تک کھودنے کی ضرورت نہ پڑے۔ میں تو حیران ہوں کہ دلیر خاں اس کی بات سہہ کیسے لیتا ہے۔"

اتنے میں دلیر اور شہباز اندر آ گئے۔ دونوں مسکرا رہے تھے اور ایک دوسرے کے پنجے میں پنجہ دے رکھا تھا۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر دلیر نے کہا "بکرا بکرا شرط اگر تم میں سے کوئی یہ بتا دے کہ میں نے باہر شہباز سے کیا کہا۔"

شہباز بھی چہکا "کل اس بکرے کو یہیں چوپال پر بھونا جائے گا۔"

لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر کھسر پھسر کرنے لگے۔ پھر ٹولیوں میں بٹ گئے۔ اس دوران میں دلیر حقے کے کش لگاتا رہا۔ شہباز جب بھی مسکرا کر دیکھتا، وہ آنکھ مار دیتا اور شہباز کی ہنسی نکل جاتی۔ لوگ پلٹ کر ان کی طرف دیکھتے اور پھر اندازے لگانے میں مصروف ہو جاتے کہ دلیر نے شہباز سے کیا کہا ہو گا۔

یکایک دلیر چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ جیسے پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ شہباز نے زمین پر پڑا ہوا ریوالور اٹھا لیا تھا، اور اسے کھول کر دیکھ رہا تھا کہ کتنی گولیاں باقی ہیں۔ پھر جیسے اس اطمینان کے ساتھ کہ فی الحال ایک ہی گولی استعمال ہوئی ہے، اس نے ریوالور بند کیا اور اسے اپنے پنجے میں لے کر دلیر کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو چپ چاپ گھور رہے تھے

اچانک ایک ٹولی میں سے ایک شخص بولا "لو بھئی دلیر خاں کی بجھارت کسی نے بوجھ لی ہو تو بتائے ورنہ ہم بتاتے ہیں۔"

دوسری ٹولیاں اب تک کسی نتیجے تک نہیں پہنچی تھیں، اس لیے سب نے کہا کہ جس نے پہلے بوجھی ہے، وہی اپنا بکرا قربان کرے۔

ایک میراثی نے کہا "میں نے بھی بوجھ تو لی ہے پر سرکار۔ کیا کروں۔ میں تو آپ ہی اپنا بکرا ہوں۔ اگر کل آپ مجھے بھوننے بیٹھ گئے تو مجھے تو اپنی ایک بوٹی بھی نہیں ملے گی۔"

لوگ ہنسنے لگے۔

شہباز بولا "تو پھر پہلے تو ہی بتا۔ تیرے لیے بکرے وکرے کی کوئی شرط نہیں۔"

سب لوگ مسکرانے لگے تو دلیر اس دوران میں شہباز کے سامنے سے کھسک کر اس کے پہلو میں آ بیٹھا جیسے اس کے نشانے سے بچ رہا ہے۔

میراثی بولا "دلیر خاں نے شہباز خاں سے کہا ہے کہ سناؤ بھائی شہباز خاں، کیا حال چال ہے؟"

زور کا قہقہہ پڑا اور میراثی سنجیدہ صورت بنائے ہتھیلیوں میں تمباکو مسلنے لگا۔

"اچھا بھئی اب بکرے والا بولے۔" دلیر نے کہا۔

بجھارت بوجھنے کا دعویٰ کرنے والا بولا "دلیر خاں نے شہباز خاں سے کہا ہے کہ جب کسی کو قتل کرنا ہو ——"

ابھی اس نے فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ قتل کا لفظ سن کر شہباز نے ایک جھٹکے کے ساتھ سر کو گھمایا اور دلیر کو گھورنے لگا۔

بوجھنے والا حیران ہو کر ذرا سا رُکا۔ پھر بولا "جب کسی کو قتل کرنا ہو تو ریوالور سے نشانہ اس کے گھٹنوں کا باندھتے ہیں تاکہ گولی اس کے پیٹ میں لگے۔ گولی نالی کو ہمیشہ اُوپر کی طرف دھکا دیتی ہے۔"

شہباز نے یکایک پہلو بدل کر ریوالور چلا دیا اور بولا "غلط۔"

دلیر تیورا کر ہٹا اور دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کی پگڑی سر پر سے لڑھک گئی۔ سب لوگوں کو یقین تھا کہ شہباز کی گولی دلیر کے کہیں نہ کہیں ضرور لگی ہے۔ دیوار سے ٹکرا جانے کے بعد دلیر نے کچھ اس طرح ہر طرف آنکھیں گھمائیں جیسے گولی ابھی تک کوٹھے میں گوشے گوشے گھومتی پھر رہی ہے اور دلیر کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔

مگر پھر دلیر نے ہاتھوں سے بکھرے ہوئے پٹوں کو سنوارا اور سیدھا بیٹھ کر پگڑی باندھنے لگا۔

"بھئی شہباز خاں۔ تم نے تو حد کر دی۔" ایک شخص بولا۔

"خاک۔" شہباز نے جواب دیا۔ "گولی تو دلیر خاں کے لگی ہی نہیں۔ لگتی تو حد ہوتی۔"

دلیر اپنی جھینپ چھپانے کے لیے ناصح بن بیٹھا۔ "ہنسی ہنسی میں بھی ایسا نہیں کرتے شہباز خاں۔ بڑے بڑے حادثے ہو جاتے ہیں۔" پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے ریوالور اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے تہبند کی ڈبک میں ڈال کر بولا۔ "اُدھر نقل میں میرا ایک یار ہے۔ اپنی بھری ہوئی رائفل صاف کر رہا تھا کہ چل گئی۔ گولی اس کے چھوٹے بھائی کے جا لگی اور اب بیچارہ سیشن سپرد ہوا بیٹھا ہے۔"

"مگر دلیر خاں۔" شہباز بولا۔ "تم تو میرے بڑے بھائی ہو۔"

دلیر سمیت سب لوگ جیسے یہ نئی پہیلی حل کرنے لگے، مگر ایک دم دلیر نے پہلو بدلا اور شرط ہارنے والے سے بولا۔ "تو بھئی کل دوپہر تک بکرا یہاں پہنچ جائے۔ نہیں پہنچے گا تو بکری اٹھوا لوں گا۔"

"پہنچے گا بھئی۔ کیوں نہیں پہنچے گا۔" ہارنے والا بولا۔

پھر محفل منتشر ہونے لگی اور جب کوٹھے میں صرف دلیر اور شہباز رہ گئے تو دلیر نے کہا۔ "پیر دستگیر کی قسم، کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

"پتہ چل بھی جائے تو کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔" شہباز بولا۔ "یہی ہوگا نا کہ میں مر جاؤں گا۔ اچھا چلو میں مر گیا۔ پھر؟"

دلیر نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے کندھے کو تھپک کر بولا۔ "تم بڑے نر آدمی ہو شہباز خاں۔"

صبح کو ادھر مسجد میں اذان ختم ہوئی، ادھر چوکیدار نے اپنے مکان کی چھت پر نقارہ پیٹ دیا۔ بعض نمازی تو وضو کو ادھورا چھوڑ کر اللہ دین کے گھر کی طرف بھاگ گئے۔ جنت کی چیخیں صبح کے اُجالے کی سطح پر پتھروں کی طرح لڑھک رہی تھیں اور سارا منظر چنخا جا رہا تھا۔ وہ جب اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی تھی تو خاصے فاصلے پر بھی دھمک سُنائی دیتی تھی۔

اور دلیر کی چوپال کے ایک گوشے میں شہباز اسے بتا رہا تھا کہ۔ "میں پہنچا تو دروازہ اندر سے کھلا تھا۔"

"وہ تو میں نے جنت سے کہہ دیا تھا۔" دلیر بولا۔

"ہاں ہاں، وہی تو کہہ رہا ہوں۔" شہباز تفصیل سنانے لگا۔ "چراغ جل رہا تھا۔ پہلے تو وہ مسٹے مارے پڑی رہی۔ پھر جب

میں نے اس کے پاؤں کے انگوٹھے کو دبایا تو وہ اُٹھ بیٹھی اور بجتی ہوئی چوڑیوں کو کہنیوں کی طرف چڑھا کر وہ اُٹھی۔ ہولے سے پڑکوٹھے کی کنجی کھولی اور اندر چلی گئی۔ میں بھی دبے پاؤں اس کے پاس پہنچا تو بولی "مجھے پتہ ہے تجھے دلیر نے بھیجا ہے۔" اس پر دلیر خاں، قسم پروردگار کی، میں نے تمھیں ایک دو تین ننگی ننگی گالیاں دے دیں کہ بعد میں وہ بے ایمان ہو جائے تو تمہارا نام نہ لے سکے۔ میں نے کہا "دلیر کی ایسی کی تیسی۔ میں تو اپنی مرضی سے آیا ہوں۔ اس لیے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔" میری آواز شاید ذرا سی اُونچی ہو گئی تھی اس لیے اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ میں نے کہا "میں اندھا اور بہرہ نہیں ہوں۔ میں یہ کیسے دیکھ سکتا ہوں کہ چار پیسے کا ایک مزارعہ تم جیسی عورت کو بالوں سے پکڑ کر پورے صحن میں گھسیٹتا پھرے۔ میں یہ کیسے سُن سکتا ہوں کہ رات اللہ دین نے جنت کو چارپائی پر رسیوں سے کس کر باندھ دیا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور چمٹے کو چراغ پر گرم کر کے اس کے سینے کو داغتا رہا۔ نہیں جنت میں یہ سب کچھ نہیں سہہ سکتا۔ اور آج رات میں تمہارے اللہ دین کو دوزخ کی طرف روانہ کرنے آیا ہوں۔" اس پر وہ بولی "تو پھر تو اتنی لمبی بات کیوں کرتا ہے۔ یہ سؤر کا بچہ جاگ گیا تو تجھے اپنی مٹھی میں لے کر چُرمُر کر دے گا۔" میں نے غصے میں آ کر کہا "اچھا تو میں اسے جگا کر قتل کرتا ہوں۔" اس پر جنت نے پھر سے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا اور میں نے پھر سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ پھر وہ بولی۔ "دشمن کو ہمیشہ زبردست سمجھنا چاہیئے۔ جگانے وگانے کی ضرورت نہیں۔ رہا۔ وہ سامنے پڑا ہے۔ کاٹ کے رکھ دے کہ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ پر دیکھ۔ میں نے کہا ہے کاٹ کے رکھ دے۔ گولی وولی نہ چلانا۔ پلس پوچھے گی کہ گولی چلی تو تم کیوں نہ جاگیں؟ تبر سے کام چلا کہ میں کہہ سکوں مجھے کیا پتہ۔ کوئی آیا اور چپکے سے کاٹ کر چلا گیا۔ بس اب بسم اللہ کر پر ذرا ٹھہر جا۔ مجھے اپنی کھاٹ پر لیٹ جانے دے۔" پھر وہ بلّی کی سی چال چلتی اپنی کھاٹ پر گئی اور سوتی بن گئی۔ میں نے تبر کے دستے پر ہاتھ رکھا اور دل میں کہا "یا پروردگار۔ پہلی بار تبر آزما رہا ہوں۔ میری لاج تیرے ہاتھ میں ہے۔" پھر میں نے ایک ہی وار میں اللہ دین کے نرخرے کو کاٹ دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ چیخے گا۔ اس کی چیخ نے اس کے سینے کو پھیلایا مگر وہ منہ سے کیسے نکلتی۔ میں نے دوسرے وار سے اس کی گردن کاٹ دی تھی اور اس کا سر لڑھک کر تخت سے نیچے گر گیا تھا۔ اور جب اس کا سر گرا تو کیا ہوا دلیر خاں کہ جنت ایکدم ہڑبڑا کر اُٹھی۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ چیخ دے گی۔ مگر پھر اس نے اپنا سر کھاٹ کی پٹی پر دے مارا اور دبے دبے رونے لگی، اور میں نے اس پر جھک کر آہستہ سے کہا "اب نہ رو۔ فجر کی اذان کے بعد رونا۔ اب آرام سے سو جاؤ۔ اب تمہارے سر کا بھوت اُتر گیا ہے۔"

"پھر؟" دلیر نے کہانی سننے والے بچے کی طرح پوچھا۔

"پھر یہ کہ میں چلا آیا۔" شہباز بولا۔

"جب تم چلے تو وہ رو رہی تھی؟" دلیر نے پوچھا۔

"ہاں رو تو رہی تھی۔" شہباز نے بتایا۔ "مگر یہ دُکھ کا رونا نہیں تھا۔ میرے خیال میں وہ ڈر گئی تھی۔ عورت بے چاری کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔"

"اب تو کھل کر رو رہی ہے۔" دلیر نے دور سے آتی ہوئی بینوں کی ادھوری آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

شہباز ہنسا "اب خوش ہو کر رو رہی ہے۔"

پھر دونوں جیسے جنت کے رونے پیٹنے کی آوازیں سننے لگے۔

اچانک۔ دلیر بولا "تم نے ایک ایسا نیک کام کیا ہے شہباز خاں، کہ قسم پیر دستگیر کی، سیدھے بہشت میں جاؤ گے۔ تم نے ایک دکھی عورت کا دکھ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو ساری بات کا راز رکھنا ہے۔ جب مقدمہ ختم ہو جائے گا اور میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ اللہ دین کو شہباز کی تبر نے کاٹا، تو لوگ تمہارے ہاتھ چوم لیں گے۔"

"لوگ چومیں نہ چومیں۔" شہباز بولا۔ "پر جب جنت نے میرے ہاتھ چومے تو میں سمجھوں گا میں اتنی مدت تک تبر بیکار نہیں اٹھائے پھرا۔"

"مگر تمہاری تبر کہاں ہے؟" دلیر کو جیسے ایک بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"فکر نہ کرو۔" شہباز بولا۔ "نیا قاتل ہوں پر بیوقوف قاتل نہیں ہوں۔ میں تبر وہیں نہیں چھوڑ آیا۔ محفوظ پڑی ہے۔"

دلیر خاموش رہا اور شہباز بولتا گیا۔ "دلیر خاں۔ یہ جنت کتنی عجیب عورت ہے۔ خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہے۔ لوگ کہتے ہیں میں نے اپنی ساری دکان لڑکیوں کو کھلا دی پر میں ایسا بیوقوف نہیں ہوں۔ میں تو اپنا سب کچھ جنت کی نذر کرتا رہا اور جب دکان بند ہو گئی تو مجھ پر سب سے زیادہ وہی ہنسی۔ جبھی میں نے قسم کھائی تھی کہ جنت کو اپنی ماں کی بہو بنا کر نہ لاؤں تو کافر ہو کر مروں۔ تم مجھ سے نہ بھی کہتے تو میں تھوڑے دنوں میں اللہ دین کو چلتا کر دیتا۔ تم نے تو خیر خدا ترسی سے مجھے ایسا کرنے کو کہا پر میں جھوٹ کیوں بولوں، میں نے تو اپنی قسم کا ایک حصہ پورا کیا ہے۔ اب یہ مقدمہ ادھر ادھر ہوئے تو قسم کا دوسرا حصہ بھی پورا کروں گا اور اگر اس نے اکڑ دکھائی تو میں اسے بتاؤں گا کہ تبر کی دھار ایک گردن کاٹنے کے بعد ہمیشہ کے لیے کند نہیں ہو جاتی اور عورت کی گردن تو ریشم کا تار ہوتی ہے۔ چاقو سے بھی کٹ سکتی ہے۔"

"کہیں تمہارے سر پر خون تو سوار نہیں ہو رہا ہے شہباز؟" دلیر نے اس سے عجیب سی آواز میں پوچھا۔

جواب میں شہباز مسکرا دیا۔ "یہ میرا پہلا خون ہے پر دلیر خاں میرا ظرف اتنا چھوٹا نہیں ہے۔ میں تو تمہیں بھی قتل کر دوں تو سیٹی بجاتا پھروں۔"

دلیر ذرا سا چونکا مگر پھر سنبھلا اور مسکرا دیا۔ پھر اس نے شہباز کے بازو کو اپنے شکنجے میں بھینچ کر کہا۔ "تمہاری چال سے، تمہاری نظروں سے، تمہاری باتوں سے کچھ بھی ظاہر نہ ہو۔"

شہباز نے کنکھیوں سے اپنے بازو پر دلیر کے بھنچے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے چھڑا کر بولا۔ "ظاہر ہو بھی جائے تو تم تسلی رکھو کہ میں اپنے یار کا نام پھانسی کے تختے پر بھی نہیں لوں گا۔"

"وہ تو مجھے پتہ ہے" دلیر نے شہباز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"پر تمہارا نام ظاہر ہوا تو سمجھو میرا نام ظاہر ہو گیا۔ تم پکڑے گئے تو میں کیسے چپ بیٹھ سکوں گا۔ میں یاروں کا یار ہوں۔"

صبح چمک اٹھی تھی اس لیے دونوں چوپال سے اتر کر گلیوں میں ہو لیے۔ جب شہباز اللہ دین کے ہاں پہنچا تو دلیر اس سے پہلے موجود تھا اور کسانوں کی ایک ٹولی کے سامنے مرنے والے کی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ پولیس کا انتظار ہو رہا تھا۔ نمبردار اندر کوٹھے میں اللہ دین کی لاش کے پاس ایک مونڈھے پر بیٹھا جیسے پہرہ دے رہا تھا۔ شہباز نے لاش جہاں چھوڑی تھی وہیں رکھی تھی۔ اللہ دین کے کٹے ہوئے سر کو بھی نیچے زمین میں ایک ٹوکرے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ٹوکرے کے آس پاس جنت کی سبز، سرخ اور نیلی چوڑیاں ٹوٹی

ہوئی پڑی تھیں۔ سامنے جنت عورتوں میں گھری بیٹھی تھی۔ اس کے کھلے بال اس کے چار طرف بکھرے ہوئے تھے اور پڑوسنیں اسے سہارا دے کر پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کا بھائی نور اللہ ایک طرف بت کی طرح کھڑا تھا۔

باہر لوگوں کی کھسر پھسر سے شہباز نے اخذ کیا کہ زیادہ شبہ نور اللہ پر کیا جا رہا ہے جس نے ایک بار اللہ دین کو ڈپٹ کر کہا تھا کہ اگر تم نے آئندہ میری بہن پر ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ کاٹ لوں گا۔ بیچ بچاؤ ہو گیا تھا ورنہ اس روز دونوں میں سے ایک ضرور قتل ہو جاتا۔ کہتے ہیں اس روز نور اللہ سیدھا اپنی بہن کے پاس آیا تھا اور کہا تھا "چل میرے ساتھ۔" اور جنت نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا تھا کہ "جب تم مجھے اس ظالم کے حوالے کر رہے تھے تو جب کیوں نہیں سوچا تھا۔ اس وقت بھی تو سارا گاؤں جانتا تھا کہ وہ مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔ میں تو اب مرتے دم تک یہیں رہوں گی۔"

دوپہر کو شہباز کھانا کھانے کے لیے پلنگ پر بیٹھا ہی تھا اور اس کی ماں چنگیر میں کھانا رکھے چولہانے سے اٹھی ہی تھی کہ چوکیدار آیا اور اس نے بتایا کہ شہباز خاں کو تھانیدار نے دلیر خاں کی چوپال پر بلایا ہے۔ چوکیدار کے ساتھ ایک سپاہی بھی تھا۔ اس لیے اپنی بے خوفی اور بے پروائی کا مظاہرہ کرنے کے لیے شہباز اٹھا اور ماں سے بولا "رہنے دے ماں۔ ابھی واپس آ کر کھا لوں گا۔ دیکھوں تو تھانیدار کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے۔" پھر وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اٹھا اور چلا گیا۔

شہباز چوپال پر پہنچا تو نور اللہ کو ہتھکڑیاں لگ چکی تھیں۔ دلیر نے شہباز کو آنکھ ماری۔ پھر تھانیدار دلیر کو اندر کوٹھے میں لے گیا۔ کافی دیر تک سارا گاؤں باہر سانس روکے بیٹھا رہا۔ بس سپاہی یا گاؤں کا نمبردار یا اللہ دین کا چاچا یا جنت اور نور اللہ کا باپ اندر آتے جاتے رہے اور جب مسجد میں ظہر کی اذان ہوئی تو شہباز باہر آیا مگر وہ ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے زرد چہرے پر اکڑی ہوئی مونچھیں اجنبی سی لگ رہی تھیں۔

شہباز کی ہتھکڑیاں دیکھ کر لوگ ششدر رہ گئے۔ پھر دلیر جس کے سر پر آج کلاہ والی طرہ دار پگڑی آ گئی تھی اور جو اپنے سفید براق لباس میں علاقے کا رئیس معلوم ہوتا تھا، تھانیدار کے قریب کی چارپائی پر سے اُٹھا اور دست بستہ بولا "دیکھئے حضور۔ اللہ دین کے قتل نے میرے دل کا خون کر دیا ہے۔ وہ اس گاؤں کا بیٹا تھا اس لیے ہم سب کا بیٹا تھا۔ مگر شہباز خاں کو بھی ہم سب جانتے ہیں اور میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ شہباز ایک اللہ دین ہی کیا، کسی کے قتل میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جس شخص نے کبھی چاقو سے ایک ٹہنی نہیں کاٹی وہ تبر سے اتنے بڑے جوان کا سر کیسے کاٹ سکتا ہے۔ پھر اللہ دین کے ساتھ اس کی نہ کوئی دشمنی تھی نہ دوستی تھی۔ قتل کرنے والے ایسے نہیں ہوتے۔ وہ دوسری طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں۔"

جب دلیر بول رہا تھا تو شہباز کو ایسا لگا جیسے وہ سارے گاؤں کے سامنے اس پر جوتے برسا رہا ہے۔ اس نے پگڑی کو سر پر جمانے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہتھکڑیاں جیسے اس پر ہنس پڑیں۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ ایسی بے عزتی برداشت کرنے سے تو قتل کا اقبال کر دینا بہتر ہے۔ مگر جب دلیر بول چکا تو پلٹ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے شہباز کو آنکھ ماری اور شہباز اپنی حماقت پر شرمندہ ہو گیا۔ اگر وہ بک بیٹھتا تو؟

کچھ دیر کے بعد، جب تھانیدار کچھ لکھنے میں مصروف تھا، دلیر اٹھا اور شہباز کے پاس جا بیٹھا۔ پھر موقع پا کر اس نے آہستہ سے کہا "ساری کارستانی اس حرامزادی کی معلوم ہوتی ہے۔"

ایک دم شہباز کا جی چاہا کہ ہتھکڑیوں کو ایک جھٹکے سے توڑ کر بھاگے اور جنت کے گھر جا کر اس کی بوٹیاں کتوں کی طرح دانتوں سے کاٹ لے۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنے خوبصورت جسم میں اتنی بدصورت نیت بھی چھپ سکتی ہے۔ یکایک اس نے عزم کیا کہ وہ پولیس کے سامنے بھی اپنے جرم کا اقبال نہیں کرے گا تاکہ اس کے پھانسی لگ جانے کا کوئی دور دراز کا بھی امکان پیدا نہ ہو۔ پھر جس روز وہ بری ہو کر گاؤں واپس آئے گا تو اپنے گھر جانے کی بجائے سیدھا جنت کے ہاں پہنچے گا اور سب کے سامنے اس سے خوب سختی کے ساتھ لپٹ کر اور اچھی طرح چوم کر اس کا گلا گھونٹ دے گا۔

شہباز اور نوراللہ نے پولیس کے سامنے بھی اپنے جرم کا اقبال نہ کیا۔ اور عدالت میں بھی ثابت قدم رہے۔ بس اتنا ہوا کہ نوراللہ کبھی کبھی رو دیتا تھا اور شہباز سے کہتا تھا "بس مجھے تو یہ حسرت ہے شہباز کہ اللہ دین میرے ہاتھوں کیوں قتل نہ ہوا۔ کسی دوسرے نے میرا یہ حق کیوں چھین لیا۔"

شہباز کے باپ نے اپنے بہترین کھیت بیچ کر ضلع کے بہترین وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ دلیر خاں بھی ہر پیشی پر آتا تھا اور شہباز کو دیر تک تسلیاں دیتا رہتا تھا۔ ایک بار شہباز نے جنت کا پوچھا تو دلیر بولا "استغاثے کے گواہوں میں سب سے پہلا نمبر جنت کا ہے۔ کہہ رہی تھی کہ میں نے تو پولیس کی سختی سے بچنے کے لیے شہباز خاں کا نام لے دیا تھا ورنہ میں ایسی کمینی نہیں کہ عدالت میں بھی اسی کا نام لوں۔ کہہ رہی تھی کہ میں تو مر بھی جاؤں تو شہباز خان کا احسان نہیں اُتار سکتی۔"

استغاثے کے گواہوں کی باری آئی تو سب سے پہلے جنت اپنے باپ کے ساتھ عدالت میں داخل ہوئی۔ وہ شہباز کو اتنی خوبصورت لگی کہ اگر اتنی خوبصورت اس رات لگتی جب اس نے اللہ دین کو قتل کیا تھا تو وہ قتل کرنے سے پہلے صبح کی اذان تک اسے مسلسل پیار کرتا رہتا۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے جنت کے گہرے سُرخ ہونٹوں کے گوشے ذرا سے کانپتے ہیں۔ اور اس کی بے حد کالی آنکھوں میں ٹمٹماہٹ سی پیدا ہوئی ہے۔

مگر جب جنت کا بیان شروع ہوا تو شہباز نے کٹہرے کے جنگلے کو اس زور سے پکڑا کہ اگر اتنے زور سے کسی کا بازو پکڑتا تو اس کی انگلیاں بازو کی ہڈی تک میں اُتر جاتیں۔ جنت نے عدالت کو بتایا کہ ——— "جب میں آدھی رات کو اللہ دین کی غرغراہٹ کی آواز سے جاگی تو شہباز ہاتھ میں تبر لیے کھڑا تھا۔ ہم رات بھر چراغ جلائے رکھتے تھے کیونکہ اللہ دین دشمنوں والا آدمی تھا۔ میں نے اس چراغ کی روشنی میں شہباز کو پہچان لیا اور میں ڈر گئی۔ میں اس لیے ڈر گئی کہ شہباز نے ہمیشہ مجھے بھوکی نظروں سے دیکھا اور جب میں نے اللہ دین کو بتایا کہ شہباز مجھے گلی میں آتے جاتے گھورتا ہے اور اشارے کرتا ہے، تو اللہ دین جو بڑے غصے والا آدمی تھا ہنسنے لگا اور بولا۔ شبر چوہے نہیں مارا کرتے۔"

اس وقت شہباز کو ایسا لگا جیسے سشن جج سمیت سب لوگوں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا ہے اور مسکرا رہے ہیں۔ جنت بھی ذرا دیر کو رُک گئی اور شہباز کی طرف دیکھنے لگی، مگر شہباز کٹہرے کے جنگلے پر سے نظریں اُٹھاتا تو اس کی نظریں جج سے ملتیں۔

پھر جنت نے کہا "اس وقت بھی، جب وہ ہاتھ میں تبر لیے کھڑا تھا تو بولا "میں تمہارا عاشق ہوں اس لیے اپنی راہ کا روڑا ہٹانے آیا ہوں" اور جب میں نے چیخنا چاہا تو اس نے میرے گلے پر تبر کی دھار رکھ دی اور اس کے بعد میں بے ہوش ہو گئی۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو صبح کی اذان ہو رہی تھی اور اللہ دین کا سر نیچے پڑا ہوا تھا اور چیونٹیوں کی ایک قطار اس میں گھسی جا رہی تھی۔"

بہت دیر تک شہباز کے دماغ کی رگیں کھنچتی، اینٹھتی اور ٹوٹتی رہیں، اس لیے نہ تو وہ کچھ سوچ سکا اور نہ یہ سُن سکا کہ اس کے وکیل نے جنت پر کیا جرح کی ہے۔ صرف جب وہ گواہوں کے کٹہرے سے نکلی اور اپنے بھائی کے قریب سے گزرنے کی کوشش میں شہباز کے قریب سے بھی گزری تو شہباز نے سوچا کہ یہ حرامزادی اتنی خطرناک گواہی دینے کے باوجود اسے خوبصورت کیوں لگے جا رہی ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ کوڑیوں والا سانپ بھی تو خوبصورت ہوتا ہے۔

اگر مقدمے میں نور اللہ بھی ماخوذ نہ ہوتا تو جنت کی گواہی پر شہباز کا پھانسی پر لٹک جانا یقینی تھا مگر اس کے وکیل نے نور اللہ کی موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ دیر تک یہ ثابت کرتا رہا کہ جنت نے جو گواہی دی ہے اس میں اپنے شوہر کے قاتل کو سزا دلوانے کی خواہش کم تھی اور اپنے سگے بھائی کو چھڑانے کی خواہش زیادہ تھی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ جنت سارا الزام بے چارے شہباز پر دھرے جو نہ لینے میں ہے نہ دینے میں، نہ تین میں ہے نہ تیرہ میں۔ آپ ہی غور فرمایئے کہ چار فٹ کا یہ جوان ساڑھے پانچ فٹ کی اس بھرپور جوانی والی عورت سے محبت کرنے کا حوصلہ بھی کر سکتا ہے؟"

اس موقع پر بھی شہباز کے دماغ میں یہ جذبہ کھولنے لگا کہ وہ اپنے وکیل کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے اپنے جرم کا اقبال کرے۔ مگر جنت سے انتقام لینے کی اُمنگ نے اس کی زبان روک لی۔ دوسرے گواہوں پر بھی اس کے وکیل نے ایسی ہی جرح کی اور آخر جب فیصلہ سُنایا گیا تو دونوں ملزم بری قرار پائے۔ اور اللہ دین کا قتل ضائع ہو گیا۔

شہباز کے ساتھ صرف اس کا باپ تھا جو خوشی سے رو رہا تھا۔ نور اللہ اپنے باپ کے ساتھ ایک طرف نکل گیا۔ جنت کی گواہی کے بعد دلبر نے عدالت میں آنا چھوڑ دیا تھا۔

جب بس شہباز کے گاؤں کی طرف روانہ ہوئی تو کئی بار شہباز کا دل چاہا کہ وہ بس سے اُترے اور بھاگنے لگے۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ بس سے بھی پہلے گاؤں پہنچ جائے گا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ بس کی سست رفتاری سے جنت کی زندگی خواہ مخواہ طول کھینچے جا رہی ہے۔

بس سے اُترتے ہی اسے ایک ہجوم نے گھیر لیا۔ لوگ اسے یوں عقیدت سے مل رہے تھے جیسے پیروں فقیروں سے ملتے ہیں۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ پستہ قد ہونا کچھ ایسی بُری بات نہیں۔ ہاتھوں پر انسانی خون کے چھینٹے ہوں تو دو دو گز کے جوان بھی بالشتیے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

اس ہجوم نے اسے فوری طور پر جنت کے گھر کی راہ اختیار نہ کرنے دی۔ وہ لوگوں میں گھرا ہوا اپنے گھر آیا تو روتی ہوئی ماں نے اسے پلنگ پر بٹھا کر تازہ کھانا اس کے سامنے رکھ دیا اور بولی "پہلے کھانا کھا لے بیٹا۔ تو جس دن یہاں سے گیا تھا، یہ کہہ کے گیا تھا کہ ابھی واپس آ کے کھانا کھائے لیتا ہوں۔" اس کی برادری نے صحن میں گوبے چھوڑے اور سوجی چینی اور خالص گھی کے دو کڑاہے بطور خیرات بانٹے گئے۔ رات گئے تک اس کے ہاں مردوں اور عورتوں کا تانتا بندھا رہا۔ اس ہجوم میں دلبر بھی آیا اور سب کے سامنے اس کے ہاتھ چوم کر چلا گیا۔

آدھی رات کو، جب شہباز کے ماں باپ سو رہے تھے، وہ گھر سے نکلا اور ایک کھیت میں جا کر ایک بیری کے نیچے زمین کھودنے لگا۔ پھر اس نے اپنے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی تبر نکالی۔ اسے ایک پتھر پر رگڑتا رہا اور پھر جنت کے گھر کی راہ لی۔

اسوج کے دن تھے جب دوپہر کو گرمی اور رات کو سردی لگتی ہے۔ جب کسانوں کے قول کے مطابق خون پانی ایک ہو جاتے ہیں اور پتھروں کے نیچے سے بھی بچھو نکل آتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا نے شہباز کے رشیمی کرتے میں گھس کر اسے پھلا دیا تھا اور چاندی کی زنجیر مسلسل بول رہی تھی۔ لیڈی ہملٹن کے تہبند کے پلو پھڑپھڑا رہے تھے اور اس کے نئے جوتے کے تلے چیخ رہے تھے۔ مگر تہبند کو سمیٹنے اور جوتے کو اتار کر ہاتھ میں لے لینے کی بجائے شہباز سوچ رہا تھا کہ وہ جاتے ہی جنت کو قتل کر دے یا پہلے اس سے لپٹ جائے، اسے پیار کرے۔ اسے سہلائے اور ٹٹولے اور جب وہ اس کے پہلو میں سو جائے۔ تو بڑی نرمی سے اس کی گردن کاٹ کر تھانے چلا جائے اور تھانیدار سے کہے کہ مجھے ہتھکڑی لگا لیجئے۔

بار بار اس کے دماغ۔ نے جنت کو زندہ رکھنے کے بہانے بھی گھڑے۔ ہو سکتا ہے وہ شہباز کے پہنچتے ہی اس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے اور اس کے قدموں پر آنسو گرا کر کہے کہ مجھے معاف کر دے شہباز۔ میں تو تیرے عشق سے ڈر گئی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ شہباز کو دیکھتے ہی اُٹھے اور کہے کہ مجھے تو پیارے، اسی گھڑی کا انتظار تھا۔ اب چل اور مجھے اپنی ساس کے پاس لے جا میری ساس جو تیری ماں ہے —— مگر ان سب بہانوں کی جڑوں کو جنت کے یہ الفاظ آرے کی طرح کاٹ ڈالتے کہ جب میں آدھی رات کو اللہ دین کی غوں غاہٹ کی آواز سے جاگی تو شہباز ہاتھ میں تبر لیے کھڑا تھا۔

جنت کے گھر کے پاس پہنچ کر اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے جوتے چیخ رہے ہیں اور تہبند پھڑپھڑا رہی ہے۔ اس نے جوتے بغل میں دبا لیے۔ تہبند کو لنگوٹ کی طرح کس لیا اور تبر کے دستے کو ہاتھ میں یوں جکڑ لیا جیسے جنت اس سے بس ایک ہی قدم کے فاصلے پر ہے۔ جنت کے کوٹھے کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس ٹھنڈی رات میں بھی اسے پسینہ آ گیا اور پسیجی ہوئی ہتھیلی میں سے تبر کا دستہ ایک بار پھسل سا گیا۔

مگر جنت کے گھر کے دروازے میں تو قفل پڑا ہوا تھا۔ ایکدم اسے خیال آیا کہ آخر نور اللہ بھی نو بری ہو کر آیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ میکے گئی ہو۔ وہ یوں بھاگ کھڑا ہوا جیسے جنت اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے اور وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ جنت کے میکے میں دو آدمی صحن میں کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔ مگر ان میں سے ایک جنت کی ماں تھی اور دوسری جنت کی چھوٹی بہن۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ گاؤں میں ایک ہی تو بس آتی ہے اور اس بس میں جنت کا بھائی سوار نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اپنے باپ کے ساتھ کچہری سے نکل کر بازار کی طرف جا رہا تھا۔ وہ تو شاید کل آئے مگر کیا جنت بھی اپنے باپ کے ساتھ اپنے بھائی کو لینے ضلع کے صدر مقام گئی ہوئی تھی!

وہ عدالت میں اپنے خلاف جنت کا بیان سُن کر بھی اتنا اداس نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت اداس تھا۔ اس کے سینے میں کچھ ایسا غبار سا جمع ہو گیا تھا کہ اگر اس وقت اسے جنت مل جاتی تو وہ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کے سامنے بچوں کی طرح رو دیتا۔ جنت کو غائب پا کر اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ دنوں سے بھوکا تھا اور بڑی دقت کے بعد اب جو نوالہ اس کے ہاتھ میں آیا تھا اسے کوئی جھپٹ کر لے اُڑا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اپنے گھر جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی قسم پوری نہیں کر سکا اور ایک نامی جوان کا خون کرنے کے باوجود وہ ہاتھ بھر کا ایک حقیر آدمی ہے۔

اس نے چوپال کی راہ لی۔ کچھ دیر تک ایک ٹوٹتے ہوئے کھٹولے پر بیٹھا رہا۔ پھر وہ چونک کر اُٹھا اور جیسے کچھ سننے لگا۔

جوتے وہیں چھوڑ کر، تہبند کے پلو سمیٹ کر اور تبر کو جسم سے چمٹائے وہ پنجوں کے بل اس کوٹھے کے دروازے تک آیا جہاں سے وہ آج سے چار مہینے پہلے ہتھکڑیاں پہنے نکلا تھا۔ چند لمحے تک وہ دروازے پر کان رکھے کھڑا رہا۔ پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر وہ دروازے کی طرف لپکا اور اپنے جسم کو کواڑوں پر پتھر کی طرح دے مارا۔ ایک کواڑ ٹوٹ کر اندر جا گرا اور اس کے ساتھ ہی شہباز بھی اندر جا گرا۔

اندر کڑوے تیل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور جنت جس نے اپنا کرتا اتار رکھا تھا، دلبر کی ران پر سر رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔ کواڑ کے ٹوٹتے ہی دونوں یوں اکڑ کر کھڑے ہو گئے کہ اپنے قدوں سے بھی لمبے لگنے لگے۔ اسی ایک لمحے میں شہباز نے اپنے جسم کو چٹان کی طرح اٹھایا اور دلبر کے پیٹ میں دے مارا۔ دلبر تیورایا تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے تبر اس کے پیٹ پر دے ماری۔ پہلے ہی وار سے دلبر کی آنتیں باہر اُبل پڑیں اور وہ ہوا میں کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

پلٹ کر اس نے جنت کی طرف دیکھا تو جنت نے چیخ ماردی اور پھر وہ ایک گوشے میں یوں تڑاخ سے جا گھسی جیسے پار نکل جائے گی۔

تبر کو فرش پر بچھی ہوئی گھاس سے پونچھتے ہوئے وہ بولا "میں تیرا خون نہیں کروں گا۔ تیرا خون میری تبر کے لائق نہیں ہے۔" پھر اس نے جنت کا کرتا اٹھا کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "لے اسے پہن لے۔ ننگی عورت لاش کے پاس کھڑی ہوئی بھلی نہیں لگتی۔"

اور جب جنت کرتا پہن رہی تھی تو وہ بولا "تجھے پیار کرنے کو بڑا جی چاہتا ہے، پر اب تو میں یہ پیار صرف اس طرح کر سکتا ہوں کہ تبر سے تیرے ہونٹ تیرے جسم سے الگ کر لوں اور پھر ان پر اپنے ہونٹ رکھ دوں۔ مگر میں ایسا بھی نہیں کروں گا۔ پھانسی پر چڑھنے سے پہلے میں اپنے ہونٹوں کو پلید نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو ————"

اچانک شہباز خاموش ہو گیا۔ مسجد میں صبح کی اذان ہونے لگی تھی۔

ہاتھ کا میل

خواجہ احمد عباس

جیسے پیرس کے کیفے ہیں، لوگ سڑک کے کنارے بیٹھ کر انگوری شراب پیتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح بمبئی کی پیورٹیشین ڈیری میں بھی باہر میز کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ مگر شراب بندی کے دور میں وسکی یا برانڈی یا شامپین یا بیئر کا دور نہیں چل سکتا۔ صرف کافی یا چائے کی پیالیوں پر پیالیاں لُنڈھائی جاتی ہیں۔

کتنے ہی برسوں سے میرا ہر شام کا مستقل پروگرام یہ ہے کہ میں ٹھیک چھ بجے پیورٹیشین ڈیری پہنچ جاتا ہوں۔ بیٹھنے کے لیے میں ہمیشہ کوئی ایسا کونہ ڈھونڈتا ہوں جہاں سمندر کی ٹھنڈی ہوا اور میرین ڈرائیو پر ٹہلتی ہوئی حسین لڑکیوں کے نظاروں سے لطف اندوز ہوسکوں۔ پہلے میں ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس منگاتا ہوں۔ پھر کافی کا آرڈر دیتا ہوں۔ شام کا اخبار نکال کر سامنے رکھتا ہوں۔ تاکہ اُس کی آڑ سے دوسری میزوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کا دیدار کرسکوں۔ کبھی کبھی اخبار میں کوئی بڑی سُرخیوں والی چٹ پٹی خبر ہو تو وہ بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ساڑھے چھ بجے تک میں دھیرے دھیرے اور مزے لے لے کر کافی پیتا ہوں۔ پھر بڑی رعب دار آواز میں "بوائے" کا نعرہ لگا کر ویٹر سے بل لانے کو کہتا ہوں۔ جب ویٹر آتا ہے تو میں اُس کی ٹرے پر سے بل اٹھاتا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ پیورٹیشین ڈیری میں کافی کی قیمت بارہ آنے ہی ہوتی ہے۔ روز روز اس کے بھاؤ میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں عینک لگا کر بغور معائنہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں ایک روپیہ کا نوٹ جیب سے نکال کر اس شان سے بل کے ساتھ ٹرے میں پھینکتا ہوں۔ جیسے وہ ایک روپے کا نوٹ نہ ہو سو روپے کا نوٹ ہو۔ پھر میں ویٹر کی واپسی کا انتظار کرتا ہوں۔ جب وہ بل پر "پیڈ" کی مہر لگوا کر واپس لاتا ہے تو میں ٹرے میں سے بل اٹھا لیتا ہوں اور جو چونی وہیں پڑی رہنے دیتا ہوں اور ویٹر کو ایک ایسی نظر سے دیکھتا ہوں جیسے میں حاتم طائی کا باپ ہوں اور وہ صرف علی بابا کا گدھا، وہ مجھے "سیلیوٹ" مار کر کہتا ہے "سلام صاحب" اور میں لقے کبوتر کی طرح سینہ تانے باہر سڑک پر آجاتا ہوں۔

اب میں بنارسی پان والے کے پاس آتا ہوں اور اُسے اپنا سپیشل مگھئی پان بنانے کا آرڈر دیتا ہوں۔ اتنے وہ پان بناتا ہے میں پالش والے چھوکرے سے جوتا پالش کرواتا ہوں۔ اُسے دس نئے پیسے کے بجائے دوتی یعنی بارہ نئے پیسے دیتا ہوں۔ اتنے میں پان کا بیڑا تیار ہو جاتا ہے۔ مگھئی پان منہ میں ڈالتے ہی آئس کریم کی طرح گھُل جانا اور کیوڑے کی خوشبو سے میرا دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ میں بڑی لاپرواہی سے پان والے کی تھالی میں چونی پھینکتا ہوں اور پیتل پر چاندی کی چوٹ سے جو دھیمی

جھنکار پیدا ہوتی ہے وہ میرے کانوں میں ایسے گونجتی ہے جیسے وہ دنیا کا سب سے مدھر سنگیت ہو۔ اور میرا رُواں رُواں اُس میٹھی جھنکار سے اس طرح تھرا اُٹھتا ہے جیسے ستار کے تاروں کو کسی ماہر فن کی مضراب نے چھُو لیا ہو۔

اور اب میں میرین ڈرائیو پر سیر کرنے کے لیے نکل آتا ہوں۔ اُس وقت سامنے سمندر میں ڈوبتا ہوا سورج ایسا لگتا ہے جیسے ایک سونے کی اشرفی نیلے مخمل کے بٹوے میں رکھی جا رہی ہو۔ (جیسا آپ کو شاید اندازہ ہوا ہوگا۔ میرا تخیل بڑا شاعرانہ ہے لیکن نہ جانے کیوں جتنی تشبیہیں مجھے سوجھتی ہیں وہ روپے پیسے سونے چاندی سے متعلق ہوتی ہیں۔ شاید اسی لیے کہ میں پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتا ہوں) ہاں تو اس وقت غروب آفتاب کا نظارہ دیکھنے رہتے ہیں۔ مانا کہ قدرت بڑی حسین ہے لیکن انسان کی زندگی میں اور بھی تو کتنی حسین چیزیں ہیں۔ مثلاً یہ رنگ برنگی موٹریں جن کا لامتناہی سلسلہ میرین ڈرائیو سے ساری شام گزرتا رہتا ہے۔ سیاہ کاریں۔ لال موٹریں۔ ہری۔ نیلی پیلی موٹریں۔ کوئی مچھلی کی طرح ستواں اور سڈول۔ کوئی اُڑتے پنچھی کی طرح پر پھیلائے ہوئے۔ کوئی اتنی لمبی چوڑی جیسے پورا مکان چار پہیوں پر چلا جا رہا ہو۔ کوئی اتنی مختصر اور پتلی جیسے مچھلی ٹریفک کی لہروں میں ڈولتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔

اور میں (جو ایک کمپنی میں کام کرتا ہوں جہاں موٹروں کی خرید فروخت کا دھندا ہوتا ہے) اُن کو دیکھ کر دل ہی دل میں حساب لگاتا رہتا ہوں۔ یہ فیٹ ہے بارہ ہزار کی آتی ہے۔ یہ ہندوستان ایمبیسڈر ہے۔ چودہ ہزار۔ یہ جرمنی کی بنی ہوئی مرسیڈیز ہے جو صرف کسی غیر ملکی سفارت خانے سے سیکنڈ ہینڈ خریدی جا سکتی ہے۔ قیمت کوئی تیس چالیس ہزار۔ یہ اسی ہزار کی بڑی شیورلیٹ امپالا ہے جو صرف چھوٹے فلم سٹار اور بڑے سرمایہ دار ہی خرید سکتے ہیں۔

اور اسی طرح میں وہاں سے گزرنے والی لڑکیوں کے بارے میں بھی دل ہی دل میں حساب لگاتا رہتا ہوں۔ یہ جینز پہنے ہوئے کٹے بالوں والی لڑکی جو اپنے کُتّے کو ٹہلا رہی ہے۔ کسی امریکن تیل کمپنی کے افسر سے بیاہی جائے گی۔ جس کی تنخواہ کم سے کم تین ہزار روپے ماہوار ہوگی۔ یہ کتابیں بغل میں دبائے آنکھوں پر چشمہ لگائے سترہ روپے والی وائیل کی ساڑھی اور چپل پہنے ہوئے جو پیلی سی دُبلی سی لڑکی آ رہی ہے۔ یہ کسی شاعر یا ادیب سے عشق کر کے اُس سے شادی کرے گی۔ اور پھر عمر بھر پچھتائے گی۔ یہ تیلی چھری کی شلوار اور فراک کی طرح چُست قمیص پہنے لپ سٹک کا چلتا پھرتا اشتہار بنی جو آ رہی ہے یہ یا تو فلم سٹار بنے گی یا کسی بہت بڑے بزنس مین کے سب سے چھوٹے اور نکھٹو بیٹے سے شادی کرے گی۔

اُس دن میں اسی طرح میرین ڈرائیو پر گزرنے والی موٹروں اور لڑکیوں کا مول تول کر رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز آئی جس نے میرے موڈ کا بالکل ستیاناس کر دیا۔

"بابو جی۔ ڈیڑھ روپیہ دلوا دو بابو جی۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا"

میں نے سوال کرنے والی کی طرف اپنی پرکھنے والی نظروں سے دیکھا۔ بیس بائیس سال کی سانولی سی چھوکری جس کا بدن میلی اور پھٹی ہوئی چولی میں سے اپنی جوانی کا اعلان کر رہا تھا۔ اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر لپ سٹک کے بجائے پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اُس کے ننگے پیروں پر دھول اٹی ہوئی تھی۔

"بھکارن!" میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ "آوارہ بھکارن!"

مجھے دنیا میں کسی سے نفرت ہے تو بھکاریوں سے ۔ یہ لوگ ہمارے دیش کے ماتھے کا کلنک ہیں ۔ نکمّے کام چور کہیں کے ۔ شریف آدمیوں کی رحمدلی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ پیسہ پیسہ مانگ کے ہزاروں روپے جمع کرتے ہیں ۔ جان بوجھ کے اپنے ہاتھ پاؤں توڑتے ہیں تاکہ بھیک مانگنے کا بہانہ مل جائے ۔ سڑک کے کنارے بیٹھ کر اپنے کوڑھ اور زخموں کی نمائش کرتے ہیں ۔ غیر ملکوں سے آنے والے ٹورسٹوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر ہمارے ملک کو بدنام کرتے ہیں ۔ مجھے ان بھکاریوں سے نہ صرف گھن آتی ہے بلکہ مجھے ان سے سخت نفرت ہے ۔ اگر میرا بس چلے تو میں ان سب کو گولی سے اُڑا دوں ۔

بھکاریوں سے زیادہ مجھے کسی سے نفرت ہے تو وہ بھکارنیں ہیں ۔ اس لیے کہ وہ کام چور ، نکمّی اور بے شرم ہی نہیں بدکار اور بے حیا ہوتی ہیں ۔ کس بے حیائی سے شریف آدمیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پیسہ مانگتی ہیں ۔ کوئی کرائے کے بچے کو گود میں اٹھائے دودھ کے لیے پیسے مانگتی پھر رہی ہے ، کوئی بے سہارا شرنارتھی ہونے کا ڈھونگ رچا رہی ہے ، کوئی بھیک مانگنے کے بہانے بیچ بازار میں اپنے جسم کا سودا کرتی گھوم رہی ہے ۔

اس لیے میری زندگی کا اصول ہے کہ میں بھکاری ہو یا بھکارن کسی کو بھیک نہیں دیتا ۔ پیریشین ڈیری کے ویٹر کو چونی بے شک ٹپ دے دوں ، پالش والے چھوکرے کو دو نئے پیسے بخشش کر دوں یا پان والے کو پندرہ نئے پیسے کے پان کے لیے چونی دے دوں مگر کسی بھکاری کو ایک پیسہ دینا بھی پاپ سمجھتا ہوں ۔ میں جانتا ہوں کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے مگر میں ہر وقت اور ہر جگہ ہاتھ دھونا پسند نہیں کرتا ۔

جب اُس بھکارن نے نہ اکنی نہ چونی پورے ڈیڑھ روپے کا سوال کیا تو میں حیران رہ گیا ۔ میں نے دل میں سوچا اب ان بھکاریوں نے بھی اپنی قیمت بڑھا دی ہے ۔

سو میں نے سختی سے جواب دیا " ڈیڑھ روپیہ چاہیے ! ڈیڑھ روپیہ ہی کیوں دو روپے کیوں نہیں ؟ "

اُس نے جواب دیا مگر دوسری بھکارنوں کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں بلکہ نظریں جھکا کر " بابا کیلئے واری جاتی ہے بابو "

میں نے سوچا یہ بھکارن تو سدھی سدھائی ایکٹریس ہے ۔ واہ واہ کیا ایکٹنگ کی ہے اور ڈائیلاگ بھی اچھا یاد کیا ہے ۔ بابا کے لیے واری جاتی ہے ! بھلا اب کون شریف اور رحمدل آدمی انکار کر سکتا ہے ۔ دو چار گھنٹے میں نہ جانے کتنے ہی ڈیڑھ ڈیڑھ روپے جمع ہو جائیں گے ۔ دیکھنے میں بھی تو بُری نہیں ہے ۔ کتنے ہی شوقین مزاج تو اُس سے ڈیڑھ منٹ بات کرنے کا ہی ڈیڑھ روپیہ دے دیں گے ۔ اور کون جانتا ہے رات ہوتے ہوتے کوئی من چلا اُسے ٹیکسی میں بٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے جائے ۔ اور صبح ہوتے ہوتے ڈیڑھ روپے کے بجائے پندرہ بیس کا انتظام ہو جائے ۔ مگر اس بھکارن کو یہ نہیں معلوم کہ میں اُن بیوقوفوں میں سے نہیں ہوں جو طوائفوں یا بھکارنوں سے بیماریاں خریدتے پھرتے ہیں پینتیس برس کی عمر میں بھی غیر شادی شدہ ہوں مگر میں تو ان آوارہ گندی اور زہریلی ناگنوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتا ۔ دن بھر دفتر میں کام کرتا ہوں ۔ رات گئے تک میرین ڈرائیو پر سیر کرتا ہوں ۔ گھر جا کر کھانا کھاتا ہوں ۔ پھر پلنگ پر لیٹ کر لائبریری سے کوئی چٹ پٹا ناول پڑھتا ہوں یا کباڑی کے ہاں سے چونی میں خریدا ہوا کوئی رسالہ اٹھاتا ہوں اور اُس کی تصویریں دیکھتا دیکھتا سو جاتا ہوں ۔ بھلا ہو

ان چکنے کاغذ والے بدیشی رسالوں کا کیسی کیسی خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں چھاپتے ہیں اور وہ بھی تقریباً ننگی۔ رنگین تصویروں میں اُن کے گورے گورے گلابی گلابی جسم۔ بالکل ایسے لگتے ہیں جیسے پھل والے کی دوکان پر سیبوں، سنترُوں، ناشپاتیوں اور اناروں کے ڈھیر لگے ہوں۔ تازہ رس بھرے۔ جن کو دیکھ کر ہی منہ میں پانی بھر آئے۔ اور بن کھائے بھوکا پیٹ بھر جائے۔

سو میں نے اُسے دھتکار دیا۔ "جا جا اپنا راستہ لے۔ یہ ڈھونگ کسی اور کو دکھانا۔ میں دس برس سے بمبئی میں رہتا ہوں۔ ایسے ایسے ڈرامے بہت دیکھے ہیں۔"

اُس نے ایک پل کے لیے اپنی بڑی بڑی آنکھوں پر سے پلکیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا، اُس کے موٹے موٹے پپڑیوں جمے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے اور پھر کہے بغیر بند ہو گئے۔ پھر وہ وہاں سے قریب ہی روشنی کے کھمبے کے سہارے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے کیوں میں وہیں بیٹھا رہا اور کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد مجھے اُس لڑکی کے ڈھونگی ہونے کا آخری ثبوت بھی مل جائے گا۔

ابھی وہ وہاں جا کر کھڑی ہوئی تھی کہ ایک ادھیڑ سی عمر کا آدمی وہاں آیا۔ میں اتنی دُور سے سڑک کی روشنی میں اُس آدمی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اُس کے تیل سے چپڑے ہوئے بال اُس کے گلے میں بندھا ہوا رومال۔ اُس کے کان پر رکھی ہوئی بیڑی اور اُس کے چلنے کا انداز ہر چیز چلّا چلّا کر اُس کے پیشے کا اعلان کر رہی تھی۔

وہ اُسے چُپکے چُپکے کچھ سمجھا رہا تھا جو میں سُن نہیں سکتا تھا مگر وہ کیا کہہ رہا تھا اُس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ وہ جواب میں صرف سر ہلا کر نہیں کہہ رہی تھی۔ دلال نے بات کرتے کرتے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا لیکن وہ فوراً ہٹ کر دُور کھڑی ہو گئی جہاں دلال کا ہاتھ اُس تک نہ پہنچ سکے۔ اور اب وہ چلّا کر بول پڑا "بڑے نخرے کرتی ہے۔ بچ کے جائے گی کہاں۔" اور اس نے دو تین موٹی موٹی گالیاں دیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں نہ اپنی بہن کی عزت ہے نہ اپنی بیٹی کی محبت۔

اور اب وہ بھکارن بوکھلائی ہوئی سی اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ کبھی اس کے آگے ہاتھ پھیلاتی کبھی اُس کے سامنے۔

ایک موٹے بوڑھے آدمی نے جو ابھی ابھی ایک موٹی تازی موٹر میں سے اپنی توند سنبھالتا ہوا اُترا تھا اُسے شاید پانچ نئے پیسے کا سکہ دیا اور وہ گڑگڑاتی ہی رہی "ڈیڑھ روپیہ چاہیے سیٹھ جی۔ بس ڈیڑھ روپیہ۔ عمر بھر آپ کی جان مال کو دعا دونگی بھگوان آپ کو لاکھوں کروڑوں دے سیٹھ جی۔"

مگر سیٹھ جی اپنی توند سنبھالتے ہوئے سمندر کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ جہاں دُور کالے اندھیرے، ٹھہرے ہوئے پانی میں چوپاٹی کی روشنیاں ڈوبی ہوئی تھیں۔

پھر اُس نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے سامنے ہاتھ پھیلایا جو ریشمی ساڑھی پہنے گلے میں موتیوں کا ہار ڈالے، اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ ایک لڑکی سلیکس پہنے ہوئے تھی۔ اور دوسری گھٹنوں تک اونچا فراک۔ اُن کے اُونچی ایڑی کے سینڈل فٹ پاتھ کے پتھروں پر کھٹاک کھٹاک بول رہے تھے۔ بھکارن دُور تک اُن کے پیچھے ڈیڑھ روپے کا رونا روتی چلی گئی لیکن اُن تینوں نے ایک بار بھی نہ اُس کی طرف مڑ کر دیکھا نہ اُس کی بات کا کوئی جواب دیا۔ اور میں نے سوچا ان بھکاریوں کا یہی علاج ہے کہ ان کا نوٹس ہی نہ لیا جائے جیسے اُن کی ہستی ہی نہیں ہے۔

اور اب وہ ایک نوجوان جوڑے کے سامنے اپنا رونا رو رہی تھی۔ یہ دونوں ابھی ابھی پیریشین ڈیری سے نکلے تھے۔ لڑکے نے کی دوکان سے لڑکے نے ایک بڑھیا سگرٹ کا ڈبہ خریدا تھا اور اب سمندر کے کنارے میرے قریب ہی کھڑا ہوا اُسی میں سے پہلا سگرٹ سلگا رہا تھا۔ اور لڑکی اپنے بیگ میں سے چھوٹا سا گول آئینہ نکال کر مرکری کی روشنی میں اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ اور ان دونوں میں سے یوڈی کولون، فرانسیسی سینٹ، بڑھیا کافی، مہوے کے پان، خوشحالی اور محبت کی ملی جلی خوشبو کا بھبکا اُٹھ رہا تھا کہ اُس بھکارن کے پسینے، میل اور غریبی کی بدبو نے اُن کو گھیر لیا۔ لڑکی نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ بھکارن کی طرف ڈالی، صرف "اُنہہ" کہا اور اپنے ساتھی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر چل کھڑی ہوئی اور بھکارن کھڑی رہ گئی۔

میں نے دل ہی دل میں اُسے کوسا کتنے خوبصورت رومانٹک موڈ میں تھے وہ دونوں پریمی، لیکن اس کمبخت نے اپنا منحوس چہرہ دکھا کر اُن کا سب مزا کرکرا کر دیا۔ نکمی۔ کام چور۔ آوارہ۔ چھنال کہیں کی۔

اور اب وہ چھنال آخرکار اُس دلال کے ساتھ جا رہی تھی۔ اور میں اُن کا پیچھا کر رہا تھا۔ کیوں؟

اس لیے کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایسے بھکاریوں اور بھکارنوں کے ڈھول کا پول کھول کر سماج کو اُن کے ہتھکنڈوں سے بچاؤں گا، اخباروں میں مضمون نہیں، تو کم سے کم ایڈیٹروں کے نام خط لکھوں گا اور ساری دنیا کو بتاؤں گا کہ اُن کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اپنے باپ کی دارو کے لیے ڈیڑھ روپیہ مانگنے والی بھولی بھالی بھکارن اصل میں ایک گندی اور گھٹیا طوائف کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

بڑے پوسٹ آفس کے پیچھے ایک اندھیری گلی میں دلال اُسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ اور میں سامنے والے فٹ پاتھ پر پیپڑ کی آڑ میں کھڑا انتظار کرتا رہا۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ نکلی۔ دلال نے اُسے ایک نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا "یہ لے پانچ روپے اب کوئی پھکر نہیں ہے جب ضرورت ہوا کرے سیدھی میرے پاس آ جایا کرو۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دلال بیڑی سلگاتا وہیں کھڑا رہ گیا اور وہ بوری بندر سٹیشن کی طرف چل دی۔ اُس نے وڈالا کا ٹکٹ خریدا تھرڈ کلاس کا۔ میں نے بھی وڈالا کا ٹکٹ خریدا۔ فرسٹ کلاس کا۔ اس ڈرامے کا آخری سین لکھنے کے لیے مجھے اس کے گھر جا کر اس کے باپ سے ملنا ہی پڑے گا۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ اُس کا نہ کوئی باپ ہے نہ کبھی تھا۔

وڈالا کے اسٹیشن سے نکل کر وہ ریل کی پٹریوں کے پار ایک جھونپڑی کے پاس رُکی۔ دھیرے سے کسی کو پکارا "بھیکو۔ ارے بھیکو۔"

"کیا ہے؟" اندر سے ایک نیند بھری آواز سنائی دی اور اندھیرے میں ایک دُھندلا سا سایہ جھونپڑی کے دروازے میں اُبھر آیا۔

"تین نوٹانک دے دے۔"

"ڈیڑھ روپیہ ہے؟"

"یہ لے۔ مگر جلدی کر۔"

وہ دیسی شراب کی بوتل لے کر دوسرے کنارے کی طرف چل پڑی۔ میں سائے کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میرے من میں غصہ اور نفرت کا ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔ کمبخت نہ صرف طوائف نکلی بلکہ شرابی بھی۔ اس تین ٹکے کی نوٹنکی کیلئے یہ کمبخت ہر شام کو اپنی عزت آبرو بیچتی ہے، بھیک مانگنے کا ڈھونگ رچا کر گاہک تلاش کرتی ہے۔ پھر اس پاپ کی کمائی سے زہر کی یہ بوتل خریدتی ہے۔ اور اس دھندے میں نہ جانے کتنے شریف آدمیوں میں اپنے گندے جسم کی بیماریاں تقسیم کرتی ہوگی۔ یہ ایک بے شرم بھکارن ہی نہیں ہے یہ ایک بدچلن عورت ہی نہیں ہے۔ یہ عورت کے روپ میں ایک زہریلی ناگن ہے۔ یہ انسان کی شکل میں شیطان ہے جو انسان کو گناہ اور گندگی کے راستے پر لے جاتی ہے۔ یہ وہ خوبصورت بلا ہے، یہ وہ خوبصورت ناگن ہے، یہ وہ خطرناک دھوکا ہے جس سے ہر شریف آدمی کو بچانا میرا فرض ہے۔

وہ ایک نہایت ہی بوسیدہ جھونپڑی کے پاس جا کر رُک گئی۔ جھونپڑی کی چٹائی کے سوراخوں میں سے چراغ کی روشنی جھلک رہی تھی۔ جیسے ہی وہ رُکی میں بھی ٹھٹک کر رُک گیا۔ میرا جوتا ایک پتھر سے ٹکرایا اور اُس کی آہٹ سنتے ہی وہ چونک پڑی۔ پلٹ کر دیکھا تو میں اُس کے سامنے ہی تھا۔

"تم کون ہو؟" وہ سہم کر دھیرے سے بولی، جیسے اُسے ڈر ہو کہ آواز اُونچی کی تو بستی بھر کے لوگ اکٹھے ہو جائیں گے "کون ہو تم؟ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"

"اتنی جلدی بھول گئیں!" میں نے بھی آہستہ سے جواب دیا "تم نے پہلے مجھ سے ہی تو ڈیڑھ روپیہ مانگا تھا۔ اور اب تو تمہیں ڈیڑھ روپے کے بجائے پانچ روپے مل چکے ہیں۔"

اندھیرے میں بھی ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا چہرہ غصے اور شرم سے تمتما اٹھا ہو۔ بڑے ہی کڑوے انداز میں بولی "تم نے تو انکار کر دیا تھا، بابو۔ اب یہاں کیوں آئے ہو؟"

"یہ دیکھنے کہ وہ کونسا ڈاکٹر ہے جس نے تمہارے بابا کے لیے یہ زہر کی بوتل لانے کے لیے کہا ہے۔"

وہ بولی "بابا بہت بیمار ہے، بابو۔ اُسے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ دارو اُسے نہ دوں تو درد کے مارے رات رات بھر چلاتا ہے۔"

"جھوٹی کہیں کی!" میں نے سوچا مگر اُسے جھٹلانے کے لیے کہا "بیمار ہے تو ہسپتال کیوں نہیں لے جاتی۔ اس زہر کے بجائے وہاں کوئی دوا دیتے اُسے۔"

"ہسپتال لے گئی تھی، بابو۔ پر وہ کہتے ہیں کہ اس روگ کا اب کوئی علاج ہی نہیں ہے۔"

"کیا بیمار ہے تمہارا بابا؟"

"کوئی بہت بھیانک بیماری ہے، بابو...... انتڑیوں کی کینسر کہیں ہیں۔ ولایت میں بھی اس کی کوئی دوا نہیں ہے۔"

اور مجھے وہ سب جھوٹ یاد آ رہے تھے جو عمر بھر میں بھکاریوں سے سنتا آ رہا ہوں۔ سرکار میرے ننھے ننھے بچے تین دن سے بھوکے ہیں۔ سیٹھ صاحب۔ میرا سامان ریلوے اسٹیشن پر چوری ہو گیا ہے۔ واپسی کے کرائے کے لیے دس روپے مل جائیں تو بڑی کرپا ہوگی۔ حضور۔ میرے باپ کی لاش سویرے سے پڑی ہے کریا کے لیے بیس روپے چاہئیں۔ جھوٹ۔ جھوٹ۔

جھوٹ۔ اور اب یہ بھکارن میرے سامنے کھڑی جھوٹ بول رہی ہے کہ اُس کا باپ کینسر سے مر رہا ہے۔ جھوٹ ہی تو ان بھکاریوں کا سرمایہ ہے۔

اُس نے شاید میرے شبہوں کو بھانپ لیا۔ بولی "بابو یقین نہیں آتا تو اندر چل کر دیکھ لو۔"

بے اختیار میرا ہاتھ بش شرٹ کی جیب پر گیا جس میں (اسی دن تو تنخواہ ملی تھی) تین سو سو روپے کے نوٹوں کی کرکراہٹ میرے سینے کو گدگدا رہی تھی۔ خالی جھونپڑی میں اس نوجوان بھکارن کے ساتھ جانے کا نتیجہ کیا ہوگا میں سمجھ گیا ایسے ایسے کتنے ہی واقعات میں نے جاسوسی ناولوں میں ہی نہیں روزانہ اخباروں میں بھی پڑھے ہیں۔ کم سے کم بلیک میل۔ اور زیادہ سے زیادہ میرا خون۔ ایک بار تو میں کانپ ہی اُٹھا۔ اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ میں خواہ مخواہ خدائی فوجدار بن کر یہاں اس ویران بستی میں کیوں چلا آیا۔ مگر میں نے اپنا خوف ظاہر نہ ہونے دیا۔ زور سے بولا "مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تمہارا باپ اندر ہے تو اُس کو آواز دو۔ پھر میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اندر کوئی نہیں ہے۔"

"بابا!" وہ چلا پڑی۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

"بابا!" وہ پھر چلائی اور سناٹے میں اُس کی اپنی آواز ہی گونج کر لوٹ آئی۔

"بابا!! بابا! جواب کیوں نہیں دیتے؟"

میں نے اُس کا جواب دیا "اس لیے کہ تمہارے بابا ہیں ہی نہیں۔ بس اب یہ ڈھونگ رہنے دو۔ تمہارے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ اب جاؤ اور یہ تین نوٹانک زہر پی کر سو جاؤ۔"

وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی جھونپڑی کے اندر گئی اور میں اندھیرے میں واپسی کے لیے راستہ تلاش کرنے لگا۔ ابھی میں چند قدم ہی گیا ہوں گا کہ ایک دل دہلانے والی چیخ سنائی دی اور میں بنا کچھ سوچے سمجھے احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر جھونپڑی کی طرف دوڑ پڑا۔

وہ جھونپڑی کے دروازے میں کھڑی تھی۔ کالے پتھر کی مورتی کی طرح۔ اندر کے چراغ کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں اُس کے پریشان بالوں نے اُس کے چہرے کے گرد ایک روشن ہالا سا بنا رکھا تھا۔

"بابو۔ آپ ٹھیک کہتے تھے۔ بابا نہیں ہیں۔"

اندر کی ایک جھلنگی کھاٹ پر ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ مردہ پڑا تھا۔ آنکھیں اب تک کھلی ہوئی تھیں، جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک ہاتھ جو شاید درد کو دبانے کے لیے پیٹ پر رکھا تھا وہیں اکڑ کر رہ گیا تھا۔ دوسرا ہاتھ پھیلا ہوا تھا اور اُس کی اینٹھی ہوئی انگلیاں اُس کونے کی طرف اشارہ کر رہی تھیں جہاں کئی خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔

میرے منہ سے آواز نکلی جو میرے کانوں کو میری اپنی آواز نہ معلوم ہوئی "یہ تھیں اور پیسوں کی ضرورت ہوگی شاید۔ ..... یہ لو" آپ سے آپ میرا ہاتھ اُٹھا مگر اُس جیب میں نہیں گیا جہاں تین سو کے نوٹ میرے سینے کو گرما رہے تھے دوسری جیب میں گیا جہاں کچھ ریزگاری پڑی تھی۔

اُس نے میری ہتھیلی پر پڑے ہوئے سکّوں کو اپنی بڑی بڑی آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا، دل ہی دل میں شاید انھیں گِنا اور پھر اُس کی گردن کے اشارے نے خاموشی سے نہیں کہہ کر بہت کچھ کہہ دیا۔ اور میں وہاں سے چلا آیا۔

گھر آکر کپڑے اُتار رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ اب تک میری مُٹھی بند ہے۔ مٹھی کھولی تو میں نے دیکھا کہ میری ہتھیلی پر دو اٹھنیاں، ایک چوّنی اور پچیس نئے پیسے پڑے ہیں۔ پورا ڈیڑھ روپیہ۔ میں نے جلدی سے اُن سکّوں کو ایسے جھٹک دیا جیسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ اور دیر تک اپنی خالی ہتھیلی کو دیکھتا رہا۔ جہاں ایک پیلا سا سُرخی مائل داغ لگا ہوا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر سُونگھا تو اُس میں سے ایسی بُو آئی جیسے خون کی۔

واش بیسن پر جا کر میں نے لکس سوپ سے ہاتھ دھوئے مگر داغ نہ گیا۔ پھر کاربالک صابن سے دھوئے پھر بھی وہ داغ نہ مِٹا۔ پھر جھانویں سے رگڑا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اور اس دن سے آج تک ہر روز کئی بار صابن سے ہاتھ دھوتا ہوں، جھانویں سے رگڑتا ہوں تولیے سے پونچھتا ہوں مگر وہ پیلا سا سرخی مائل داغ جس میں سے خون کی بُو آتی ہے آج تک میری ہتھیلی پر اُسی طرح موجود ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں شاید یہ کوئی نئی قسم کی کوڑھ ہے لیکن میں جانتا ہوں یہ ہاتھ کا میل ہے۔

منٹو کے خطوط

(احمد ندیم قاسمی کے نام)

۱۲- محمد جعفر ہاؤس
لیڈی جمشید جی روڈ
ماہم ——— بمبئی
(۲۳- ستمبر ۱۹۴۰ء)

برادرِ مکرم!

آپ کے دونوں محبت نامے مجھے مل گئے تھے۔ میری طبیعت چونکہ ناساز تھی اس لیے میں اُن کی رسید نہ بھیج سکا۔ کچھ تو یہاں کی آب ہوا نے مجھ پر اثر کیا ہے اور کچھ ناموافق واقعات نے۔ خصوصاً والدہ صاحبہ کی اچانک موت نے جسمانی اور روحانی طور پر مجھے بہت ہی صدمہ پہنچایا ہے۔ پرسوں مجھے ایک سو پانچ درجے کا بخار تھا۔ آج درجہ حرارت ننانوے ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ بخار بدستور موجود ہے۔

چار پانچ روز ہوئے میں نے یہاں ایک بڑے ڈاکٹر سے مشورہ لیا تھا۔ اُس نے بتایا ہے کہ میرے ABDOMEN میں خرابی ہے۔ اس خرابی کا باعث صرف میرے جسم کی ساخت ہے۔ میرا پیٹ نیچے سے بہت تنگ ہے جس کی وجہ سے انتڑیاں ٹھیک طور پر پھیل نہیں سکتیں۔ ڈاکٹر نے ایک خاص قسم کی پیٹی باندھنے کو کہا ہے جس کو آج کل میں استعمال کر رہا ہوں۔ بارہ روپے میں خریدی ہے، اس کا یہ فائدہ ہو گا کہ انتڑیاں اُوپر کو اُٹھی رہیں گی ——— بخار اس کے علاوہ ہے جس کے متعلق کل پھر اُس سے بات چیت کروں گا۔ آپ بے فکر رہیں، مجھے ابھی زندہ رہ کر بہت سے تماشے دیکھنا ہیں۔

عارف اب پہلے سے اچھا ہے، امید ہے کہ خدا کے فضل سے وہ دن بدن تندرست ہو جائے گا۔ صفیہ بھی خیریت سے ہے۔

اس سے قبل میں آپ کو ایک ایکسپریس چٹھی بھیج چکا ہوں۔ اُمید ہے مل گئی ہو گی۔

آپ کا خط پڑھ کر معلوم ہوا کہ پنڈت کرپا رام نے آپ کو میرے متعلق ایک مفصل خط لکھا ہے۔ اُن کی بڑی مہربانی ہے کہ آپ کو انھوں نے میرا دوست سمجھا اور مجھے اس بات سے بھی حوصلہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مجھے فراموش نہیں کیا۔ پنڈت جی سے میرا تعارف مسٹر نذیر کی معرفت ہوا تھا۔ مصور سے علیحدہ کر دیے جانے پر مجھے اس بات کا اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ پنڈت جی بھی مجھ سے چھن گئے ہیں۔ ایک بار خلش صاحب سے مسٹر نذیر کے تعلقات خراب ہو گئے تھے تو اسی بنا پر پنڈت جی نے خلش صاحب کو ایک نچوڑی ہوئی ہڈی سمجھ کر پھینک دیا

تھا میرے دل میں ایسا خیال کیوں پیدا ہوا اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آج کل جبکہ مسٹر نذیر سے خلش صاحب کا ملاپ ہو گیا ہے جو کہ اُتنا ہی حیرت خیز ہے جتنا کہ رُوس اور جرمنی کا سیاسی اتحاد ہے، پنڈت جی کے دوستانہ تعلقات پھر سے خلش صاحب کے ساتھ قائم ہو گئے ہیں۔ اس کے لیے میں پنڈت جی کو موردِ الزام قرار نہیں دیتا کیونکہ وہ دوستی کو گزوں سے ناپتے ہیں۔ میری دوستی، نذیر صاحب کی دوستی کے مقابلے میں کئی میل کم تھی اس لیے میں سمجھا کہ پنڈت جی نے ایک ہی جھٹکے میں میری دوستی کی گردن علیحدہ کر دی ہو گی مگر آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ میں ابھی تک اُن کے اندر زندہ ہوں —— یہ میرے حقیر اخلاص کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے ورنہ پنڈت جی کے سینے میں تو ایک قبرستان آباد ہو گا۔

پنڈت جی فوج میں رہ چکے ہیں اس لیے وہ ہر شے کو فوجی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جب وہ کسی سے دوستی کرتے ہیں تو فوجی خطوط پر اور جب کسی سے دشمنی اختیار کرتے ہیں تو اُن کے دماغ میں مورچہ بندی کا خیال آجاتا ہے۔ وہ بے قصور ہیں اور میں بھی بے قصور ہوں۔ میں نے اُن کو اپنا دوست نہیں سمجھا اس لیے کہ وہ ان حدود سے گزر چکے ہیں۔ جبکہ میری عمر کے آدمی اُن کو اپنا دوست بناتے۔ میں نے اُن کو اپنا رہبر قرار دیا۔ ایک بار جب انھوں نے والدہ مرحومہ سے کہا تھا "سعادت میرا بچہ ہے۔" تو میں وہاں سے اٹھ کر بالکونی میں چلا گیا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میری کمزوری کا اُن کو پتہ چل جائے گا۔ میں دل ہی دل میں ایک خاص قسم کا سرور محسوس کرتا تھا۔ مجھے اُن کی بہت سی باتوں سے اختلاف رہتا تھا مگر میں نے ہمیشہ جبر کیا اور اپنے دل کی سلطنت پر اُن کو ڈکٹیٹر بنا کر بٹھا دیا۔ دنیا جانتی ہے کہ پنڈت کرپا رام صاحب مجھے عزیز تھے اور اب بھی عزیز ہیں۔ لیکن ایک حادثے سے میرے اندر ایک انقلاب سا برپا ہو گیا ہے اور میں خود کو کسی قدر تبدیل کر چکا ہوں۔ یہی تبدیلی شاید پنڈت جی کو پسند نہیں آئی۔

"مصور" سے میں چار برس تک منسلک رہا۔ اس دوران میں ہر کام میں نے ایماندارانہ طور پر کیا۔ مسٹر نذیر یا پنڈت کرپا رام جی ان چار برسوں کے ڈھیر میں سے ایک دن بھی ایسا کرید کر نہیں نکال سکتے جس کے ساتھ میرا اخلاص چمٹا ہوا نہ ہو۔ مصور کو میں نے اپنا سمجھا۔ نذیر صاحب کو بھی میں نے اپنے دل میں جگہ دی، لیکن ایکا ایکی مجھ سے بات چیت کیے بغیر مجھے تحریری نوٹس ملا جس نے کئی راتوں کی نیند مجھ پر حرام رکھی۔ یہ نوٹس ملنے پر میرے دل و دماغ میں کیسا ہلڑ مچا، میں بیان نہیں کر سکتا۔ فلموں کی کومنٹری لکھنے کا کام مجھے نذیر صاحب نے دلوایا تھا وہ بھی مجھ سے چھین لیا گیا۔ ایک سو بیس روپے ماہوار کی آمدن مجھ سے کسی نامعلوم گناہ کے باعث علیحدہ کر دی گئی۔ میں نے ہوش سنبھالا اور بابوراؤ پٹیل کے پاس گیا۔ اُس کو میں نے نوٹس دکھا کر کہا "تمھیں ایک ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ میں اس وقت بیکار ہوں، کیا تمھیں میری خدمات درکار ہیں؟ میں ساٹھ روپے مہینے پر کام کروں گا۔" سودا منظور ہو گیا۔ اس کے بعد کرپا رام جی سے میری ملاقات ہوئی۔ اُن کے یہ الفاظ بسترِ مرگ پر بھی مجھے یاد رہیں گے۔ "میرا خیال تھا کہ نوٹس ملتے ہی تم اور صفیہ میرے پاس آؤ گے اور ہم کوئی مصالحت کی صورت پیدا کر لیں گے مگر تم نہ آئے اور بابوراؤ پٹیل کے پاس چلے گئے۔" خدا کرے کہ پنڈت جی کا وقار قائم رہے۔ اُن کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک سو بیس روپے کھو دینے پر بھی بھیک نہیں مانگتے۔ مجھے جب زبانی پیغام دینے کے بجائے نوٹس دیا گیا تو میں کیوں کسی کے پاس جاتا۔ جب میرے جذبات کی قدر ہی نہیں کی گئی تو میں کیوں انھیں اور پامال کراتا ——

پنڈت جی مجھ پر تمام عمر کوئی جُرم عائد نہیں کر سکتے اس لیے کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ مجھے اس بات کا دعویٰ ہے کہ اگر وہ میرے سامنے بیٹھ کر گفتگو کریں تو گفتگو کے بعد وہ مجھے اٹھا کر چُوم لیں —— خدا کی قسم میں اُن کو رُلا سکتا ہوں۔ مجھ میں انتقام کی آگ اتنی

زیادہ بھڑک رہی ہے کہ میں انھیں ایک روز ضرور اپنے سامنے بٹھاؤں گا اور اتنا بولوں گا اتنا بولوں گا کہ اُن کے کان بہرے ہو جائیں۔ انھوں نے مجھے بہت دُکھ دیا ہے۔ وہ بہت سمجھدار بنتے ہیں مگر اُن کی عقلمندی ملاحظہ ہو کہ خلش سے مجھے نوٹس ملنے کے دوسرے روز ہی کہتے ہیں "بھئی مجھے سعادت کے بیس روپے دینا ہیں" ــــ یہ کیا ہے؟ ــــ اس ایک بات نے میرے دل پر نہایت ہی بُرا اثر کیا۔ پنڈت جی کے دل میں روپوؤں کا خیال مصوّر سے میری علیحدگی پر کیوں آیا؟ ــ کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ اُن کا ضمیر مجھ سے ہٹ چکا تھا۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی اور میرے درمیان دوستی کا جو رشتہ تھا وہ صرف مصوّر ہی کے صفحات پر تھا۔ مصوّر سے میں علیحدہ ہوا اور وہ بھی مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔

میں نذیر صاحب سے پوچھ چکا ہوں۔ وہ بتا نہیں سکے کہ انھوں نے مجھے کیوں علیحدہ کیا لیکن انھوں نے اتنا ضرور کہا ہے کہ میرے اخلاص پر انھیں کامل بھروسہ ہے۔ اب کرپا رام جی سے پوچھوں گا کہ بھئی آپ نے میری دوستی کو کس بنا پر طلاق دی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ وہ وجہ نہیں بتا سکیں گے اس لیے کہ کوئی وجہ ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ اتنی مبہم ہے جو صرف کرپا رام جی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میں آپ سے کیا عرض کروں ــــ اتنے واقعات ہیں کہ خط میں درج نہیں کئے جا سکتے جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں پنڈت جی سے مجھے عقیدت تھی، میں نے کبھی یہاں رہ کر خود کسی کام کے لیے کوشش نہیں کی بلکہ مسٹر نذیر اور مسٹر کرپا رام پر بھروسہ رکھا۔ اب کہ میں بالکل اکیلا ہوں کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں کچھ نہ کروں اور ڈوب کے مر جاؤں۔ اگر میں نے شادی نہ کی ہوتی تو بخدا میں اُن کو خوش کرنے کے لیے یہ بھی کر دیتا اور ہمیشہ کے لیے اپنی موت کی تختی اُن کے گلے میں لٹکا دیتا مگر میں مجبور ہوں۔

کرپا رام جی کبھی تخلیے میں سوچیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کسی سے بُرائی کر ہی نہیں سکتا۔ البتہ وہ کر سکتے ہیں، وہ اس کے اہل ہیں۔ وہ اپنی طبیعت خوش کرنے کے لیے جس کا چاہے گلا گھونٹ سکتے ہیں ــــ میں نے ابھی اتنا تجربہ حاصل نہیں کیا جتنا کہ پنڈت جی کر چکے ہیں، ممکن ہے کہ دس بارہ برس کے بعد مجھ میں بھی یہ بات پیدا ہو جائے۔ اس وقت میں اُن سے زیادہ اچھی طرح بات کر سکوں گا مگر اب کہ میرے اندر صرف جذبات ہی جذبات ہیں میں سوائے آنسوؤں کے اُن کی خدمت میں اور کچھ پیش نہیں کر سکتا۔ یہ آنسو انہی کے عنایت کردہ ہیں۔

مجھ سے بعض لوگوں کے خلاف لکھنے کے لیے کہا گیا، میں نے لکھا اس لیے کہ وہ مجھے خود بھی ناپسند تھے، لیکن میں اب دیکھتا ہوں کہ پنڈت جی اُن کے ساتھ گھُل مل کر رہتے ہیں۔ میں اُن لوگوں کا دشمن ہوں مگر وہ دوست ہیں۔ میں اِس پر رشک نہیں کرتا بلکہ افسوس کرتا ہوں۔ وہ یوں اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں اور میں....... پنڈت جی سے کہئے کہ وہ کبھی میری پوزیشن پر بھی غور کریں۔ میں اگر چاہوں تو اُن بیوقوفوں کو اتنا خوش کر سکتا ہوں کہ پنڈت جی ساری عمر میں نہیں کر سکتے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں خود عبرتناک حد تک بیوقوف ہوں۔

میں نے اگر دورنگی زندگی بسر کرنا شروع کی تو مجھے یقین ہے کہ میں زیادہ کامیاب رہوں گا کیونکہ میں یہ کام بھی اخلاص کے ساتھ کروں گا مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ دن ہی نہیں آتا جب ایسی زندگی بسر کرنے کی خواہش میرے اندر پیدا ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نذیر صاحب یا کرپا رام صاحب مجھ پر ناراض کس وجہ سے ہیں۔ کیا میں نے اُن کی کوئی جائداد غصب کر لی ہے یا میں نے کبھی اُن کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میرا کوئی جُرم بھی ہو۔ گو میں یہ پسند نہیں کرتا کہ خود کو عدالت کے

کٹہرے میں کھڑا کر دوں۔ مگر میں یہ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چلیے میں مجرم ہی سہی، اب کرپا رام جی اور اُن کے دوست کرسیوں پر بیٹھیں اور مجھ پر جرم ثابت کریں۔ کیا اُن میں اتنی جرأت ہے؟ —— اُن سے پوچھیے۔

وہ میرے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اگر وہ کچھ کہہ سکتے ہیں تو صرف یہ کہ سعادت شراب پیتا ہے اس لیے کہ شراب صرف میرے جسم کو نقصان پہنچاتی ہے روح کو نہیں۔ کرپا رام جی نے تو میری رُوح کو تکلیف پہنچائی ہے۔

میں بے حد ذکی الحس ہوں۔ میں نے سارے کا سارا سعادت اُن کی میلی جھولی میں ڈال دیا مگر اس کے بدلے میں انھوں نے کرپا رام کا صرف ایک ٹکڑا مجھے دیا۔ مجھے اس کا گلہ ہے۔ جب میں کسی سے دوستی کرتا ہوں تو مجھے اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنا آپ میرے حوالے کر دے گا۔ دوستی کرنے کے معاملے میں میرے اندر یہ ایک زبردست کمزوری ہے جس کا علاج مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب آپ نے اپنی دوستی کا ہاتھ میری طرف بڑھایا تھا تو میں نے آپ سے کئی بار کہا تھا کہ آپ مجھے دوست نہ بنائیں صرف اسی کمزوری کے باعث میں نے آپ سے درخواست کی تھی۔ اب بھی میری آپ سے یہی درخواست ہے۔ ندیم صاحب معاف فرمائیے گا مصور سے ایکا ایکی (غیر ضروری بالوں کی طرح) علیحدہ کر دیے جانے پر اب میرے دل میں بہت تلخی پیدا ہو گئی ہے، میں اب ہر وقت سہما سہما رہتا ہوں کہ ممکن ہے کسی روز آپ بھی میرے ساتھ یہی سلوک نہ کریں —— مجھے تو یہ بھی ڈر رہتا ہے کہ کہیں میرے اپنے ہاتھ پاؤں مجھ سے باغی نہ ہو جائیں۔ اللہ رحم کرے۔

مجھے معلوم نہیں پنڈت جی نے آپ کو کیا لکھا ہے، لیکن اگر دنیا میں ایمان واقعی کام کی چیز ہے تو اس سے کام لے کر آپ انھیں بتائیے کہ میں نے اُن کے بارے میں آپ کو کبھی کچھ لکھا ہے —— جو کچھ انھوں نے آپ کو لکھا ہے مجھے ہرگز نہ بتائیے گا۔ میں اپنے آپ کو اور دکھی کرنا نہیں چاہتا۔ کرپا رام جی میں اتنا دل گردہ نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر میرے دُکھ اُٹھا کر اپنے کاندھے پر رکھ لیں۔ خدا اُن کو ہمیشہ سکھی رکھے اور اگر وہ مجھے مشکلات میں دیکھ کر ہی خوش رہ سکتے ہیں تو میری دُعا ہے کہ میں ہمیشہ مشکلات میں پھنسا رہوں لیکن کرپا رام جی سے میں کبھی بھیک نہیں مانگوں گا۔

میں ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ مجھے نہ کرپا رام جی سے دشمنی ہے اور نہ مسٹر نذیر سے۔ میں اوّل تو اُن کو نقصان پہنچا ہی نہیں سکتا اس کا خیال تک میرے دماغ میں نہیں آئے گا، لیکن میں اُس بھونڈے سلوک کا تذکرہ یقیناً کرتا رہوں گا جو نذیر صاحب اور پنڈت کرپا رام جی نے میرے ساتھ کیا۔ دُنیا کی کوئی طاقت مجھے یہ سچی بات کہنے سے نہیں روک سکتی۔

کرپا رام جی مجھے اپنی زبان سے بیٹا کہہ چکے ہیں کیا انھوں نے اپنے دوست نذیر صاحب سے یہ پُوچھنے کی زحمت گوارا کی کہ سعادت کا قصور کیا ہے اور اگر انھوں نے پوچھا تو کیا نذیر صاحب نے سچّی بات اِن سے کہی؟

مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیا لکھ رہا ہوں لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ پنڈت کرپا رام جی میرے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ وہ مجھے بالکل نہیں سمجھ سکے۔ میں اُن کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

میں نے پنڈت جی کے بارے میں اب تک جو کچھ بھی "کارواں" میں لکھا ہے خدا کی قسم کسی شخص کی اکساہٹ پر نہیں لکھا۔ کرپا رام صاحب سے پوچھیے کہ وہ ناکام ڈائرکٹروں کا راگ کیوں الاپ رہے ہیں۔ اس کے پیچھے کونسا جذبہ کارفرما ہے؟ —— مجھے اس بات کا دعویٰ ہے کہ وہ اگر اپنی تمام طاقتیں صرف کر دیں تو بھی وہ مضامین کے ذریعے یا زبانی ہرگز ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ ناکام

ڈائرکٹروں کے خلاف لکھ رہے ہیں، کیونکہ ناکام ڈائرکٹر خود اُن کے دوست ہیں جن کی حمایت میں وہ آئے دن "مووِیز" کے کالم بھرتے رہتے ہیں۔ وہ کیوں خواہ مخواہ ایک ایسی چیز پر قلم اُٹھاتے ہیں جس میں وہ خود کو حق بجانب ثابت ہی نہیں کر سکتے۔ انڈسٹری کا درد اُن کے دل میں اتنا ہی ہے جتنا کہ بابوراؤ پٹیل کے دل میں۔ یہ صاف باتیں ہیں اور پنڈت جی اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

درد مجھ ایسے آدمی کے دل میں ہو سکتا ہے جس کی زندگی کا سارا دارومدار صرف مشقت پر ہے۔ میں محنت کرتا ہوں۔ سیاسی پہلوانی نہیں کرتا۔ پنڈت کرپا رام جی اور مسٹر نذیر دونوں سیاسی پہلوان ہیں۔ میری بات یاد رکھئے گا۔ اُن دونوں میں ایک نہ ایک روز ضرور کُشتی ہو گی ـــ میں اس اکھاڑے سے باہر ہوں اور کوشش کروں گا کہ ہمیشہ باہر ہی رہوں۔

آخر پنڈت جی مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ ـــ کیا میں محنت نہ کروں ـــ کیا میں بھیک مانگنا شروع کر دوں۔ کیا میں اپنے گلے میں غلامی کا طوق ڈال لوں؟ ـــ کیا میں سارا دن ایک در سے دوسرے در تک پھرتا رہوں ـــ مجھے بتائیں تو سہی کہ میں کیا کروں؟

کرپا رام جی کی ایک اور طفلانہ حرکت ملاحظہ ہو۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے آپ میرے بہت قائل تھے۔ ایک صاحب سے جو کہ اپنی اسٹوری کا منظر نامہ لکھانا چاہتے تھے آپ نے میری سفارش کی اور بہت سا روپیہ دلوانے کا وعدہ کیا مگر اب انھوں نے خلش صاحب سے کہا ہے "منٹو کو اب میں کام نہیں دے رہا ـــ فلاں شخص کو دوں گا" ـــ بھئی پنڈت جی آپ کسی کو بھی دیں مگر خلش صاحب کو یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب مسٹر نذیر نے خلش صاحب کو اپنے پاس بُلا لیا تھا تو میں خوش ہوا تھا۔ اب اگر وہ کام کسی اور کو دے دیں گے تو مجھے رنج نہیں ہو گا البتہ رنج اس بات کا ہے کہ انھوں نے ایسی بات کہی۔

وہ مجھے روپے پیسوں میں کیوں تولتے ہیں؟ ـــ مجھے اُن سے اتنی محبت نہیں ہے جتنی کہ مجھے اُس تخیّل سے ہے جو کہ دوستی کے متعلق میرے دماغ میں موجود ہے۔ وہ جو چاہیں کریں، میرے رویے میں ہرگز ہرگز فرق نہیں آئے گا۔ میں اپنے آپ کو ذلیل بنانا نہیں چاہتا۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر کرپا رام جی کو کوئی بات ناگوار گزرتی ہے تو کیا کسی دوسرے کو نہیں گزر سکتی۔ اگر وہ کسی شے کو ناپسند کرنے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتے ہیں تو کیا دوسرا نہیں کر سکتا۔ اگر وہ کسی آدمی کے خلاف زہر اُگل سکتے ہیں تو کیا دوسرا نہیں اُگل سکتا۔ اگر پنڈت جی خاص مصلحتوں کے پیشِ نظر کسی کو بانس پر چڑھا سکتے ہیں تو کیا دوسرا نہیں چڑھا سکتا ـــ کیا وہ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اُن کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

میں نے اب تک اُن کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے آپ کی نظروں سے گزرا ہو گا۔ بتائیے اُس میں کیا بُرائی ہے۔ میں اُن کی کسی بات سے اختلاف نہیں رکھتا لیکن بات صرف یہ ہے کہ وہ خود محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اخلاص پر مبنی نہیں ہے۔ یہی احساس ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ میرے خلاف لوگوں سے کچھ کہیں اور اسی احساس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ آپ کو خط لکھیں۔

وہ دنیا سے کسی قسم کا بھی سلوک کریں مجھے اس کی پروا نہیں۔ وہ جانیں اور اُن کا کام۔ لیکن میرے ساتھ انھیں امتیازی سلوک روا رکھنا ہو گا اس لیے کہ وہ اپنے منہ سے مجھے بیٹا کہہ چکے ہیں۔ میں بہت ضدّی بچہ ہو گیا ہوں۔ طفل تسلیوں سے اب میں نہیں بہلوں گا۔ انھیں اپنے قصور ماننا ہوں گے تاکہ مجھے اطمینان نصیب ہو اور میرے اندر جو انقلاب کا طوفان پیدا ہو رہا ہے۔ ٹھنڈا ہو جائے۔ اُن کی بے رُخی نے

مجھے بہت دُکھ پہنچایا ہے بخدا بہت دُکھ پہنچایا ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خدا میری اور اُن کی دونوں کی حالت پر رحم کرے۔

کرپا رام جی سے کہیئے کہ وہ مجھ سے ملیں۔ اُن کی شان میں فرق نہیں آئے گا۔ یا مجھ سے کہیں میں اُن سے ملاقات کروں، مگر ایسی جگہ جہاں دس پندرہ آدمی موجود ہوں تاکہ سب کے روبرو ہم باتیں کر سکیں۔

مجھے افسوس ہوا کہ آپ مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ دیکھئے میں یہاں کوشش کرتا ہوں۔ آپ کو ایک دو روز میں نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔

آپ کی باقی باتوں کا جواب پھر لکھوں گا۔ میں اب زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ یہ خرافات لکھ کر میرا دماغ پریشان ہو گیا ہے۔ ایسا بے ربط خط شاید ہی میں نے کبھی لکھا ہو۔

اگر ہو سکے تو "مجھے شکایت ہے" کی تائید میں ایک مضمون ضرور لکھ کر بھیجئے۔

صفیہ آداب عرض کرتی ہے۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۲۔ محمد جعفر ہاؤس

لیڈی جمشید جی روڈ

ماہم۔ بمبئی (ستمبر ۱۹۴۰)

برادرِ مکرم

میرا طول طویل خط جس میں نہ جانے کیا کیا لکھا گیا ہے آپ کو مل گیا ہوگا۔ اُس خط کو بھول جایئے مگر یہ یاد رکھئے کہ میرا خیال بالکل درست تھا کہ نذیر صاحب اور کرپا رام صاحب میں ایک روز ضرور چخ ہو گی۔ کل مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اُن دونوں میں جھگڑا ہو گیا ہے ——— اِنّا للہ وانا الیہ راجعون۔

کل رات کو رفیق صاحب کے مکان پر ہم دیر تک آپ کی باتیں کرتے رہے۔ آپ کا نیا افسانہ "طلائی مہر" میں نے پڑھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ رفیق نے اس کے حصے ڈاگا صاحب کو پڑھ کر سنائے۔ ہم سب سمندر کے پاس شام کے وقت بیٹھے بیئر پی رہے تھے اور ڈاگا صاحب آپ کا ایک شعر بار بار پڑھ رہے تھے۔ ڈاگا دولتمند ہے، اُس کے پاس اتنی دولت ہے کہ ختم ہی نہیں ہو سکتی مگر حیرت ہے کہ اُس کا دل مٹی کا ہے۔ وہ آرٹسٹ ہے۔ واللہ بڑا پیارا انسان ہے۔ آپ اُسے چوم لیں گے۔

ڈاگا صاحب کی خواہش ہے کہ آپ بمبئی چلے آئیں۔ وہ آپ کو اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار ہیں۔ آخر آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ بھئی میں مانتا ہوں کہ آپ کے ذمے بہت سے فرائض ہیں مگر حضرت آپ کو بھی تو کچھ کرنا ہے۔ آپ کب تک اپنے آپ کو قید رکھیں گے۔ کیا یہ مناسب ہے؟ ہندوستان میں نوکری ایک لعنت بن کے رہ گئی ہے۔ میں خود اس لعنت سے بری نہیں لیکن اب مجھ میں بیداری پیدا ہو رہی ہے۔

ہاں مجھے آپ سے یہ بھی کہنا تھا کہ میں "غالب" نام سے ایک فلمی کہانی لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ آپ شاعر ہیں، اگر آپ یہاں ہوتے تو مجھے کتنی مدد ملتی۔ میں نے غالب سے متعلق بہت سی کتابیں اکٹھی کر لی ہیں۔ اور کتابیں بھی جمع کر رہا ہوں۔ اگر آپ کے پاس کوئی ایسا رسالہ ہو جس میں غالب کی زندگی کے متعلق کوئی مضمون چھپا ہو تو مجھے فوراً بھیج دیجئے۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک دو مہینے کے لیے اپنے آپ کو بیمار یا قریب المرگ ظاہر کر کے چلے آئیں۔

خدا کے لیے ضرور آئیے۔ زندگی میں انسان کو ہر روز موقعے نہیں ملتے۔

کل رات میری طبیعت اچانک طور پر خراب ہو گئی تھی۔ خیال تھا کہ ہیضہ ہو گیا ہے مگر خدا کا فضل رہا۔ اب ٹھیک ہوں۔

آپ یہ لکھئے کہ "بغیر عنوان کے" کیسا ہے؟ اس کی دوسری قسط غور سے دیکھئے گا۔ تیسری قسط ابھی نہیں لکھی۔ کل لکھنا شروع کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ آٹھ دس قسطوں میں چھپے گا۔

صفیہ آداب عرض کرتی ہے۔

عارف رو رہا ہے۔ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ پیشاب کرے مگر وہ کسی کے کہنے پر پیشاب کرنا پسند نہیں کرتا۔ اب چپ ہو گیا ہے۔

آپ کا بھائی
سعادت حسن منٹو

منشی جی فیض اللہ

ابوالفضل صدیقی

گولڈاسمتھ کی شہرۂ آفاق نظم DESERTED VILLAGE کے متعلق ناقدین خواہ کچھ کہیں مگر شاعرِ موصوف نے اس میں جو خاکہ "ولیج اسکول ماسٹر" کا پیش کیا ہے وہ اتنا جامع اور پُرخلوص ہے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ شاعرِ موصوف کے ذاتی تجربہ کا عکس ہے کیونکہ ہمیں بھی زندگی کے ایک حصہ میں، بلکہ اس حصہ میں جسے عرفِ عام میں زندگی کا شاہانہ دور کہا جاتا ہے کچھ ایسی ہی صورت سے دوچار ہونا پڑا تھا جس کے نقوش آج بھی قلب و دماغ پر ویسے ہی جوں کے توں مرتسم ہیں جیسے ان کے زمانۂ شاگردی میں ابھرے تھے اور چالیس سال کی پیہم رگڑ کے باوجود کہیں پر ایک ادنیٰ سا شوشہ بھی دھندلا نہیں ہوا ہے۔

جب منشی جی فیض اللہ کا خیال کرتا ہوں تو آج بھی ایک مرعوب کن سا احساس شعور کے نہاں خانہ میں بجلی کے کوندے کی طرح لہرا جاتا ہے۔ وہ میرے اس عمر کے استاد تھے جب میں آدمی نہیں بلکہ آدمی کا ماڈل تھا اور یہ آدمی کا ننھا منا ماڈل سچ مچ آدمی بننے کے لیے ہمہ وقت بے تابی کے ساتھ اچکتا سا ہے اور ہر نگاہ میں جیسے کچھ ٹٹولتا رہتا ہے اور ہر معمولی چیز میں ریسرچ کرتا ہے چنانچہ اس دور کی یادیں دائمی اور اثرات بڑے رائخ ہوا کرتے ہیں۔ اللہ بخشے مرحوم درجہ الف سے درجہ چار تک میرے استاد رہے اور استاد بھی آج کے متمدن دور کے نہیں جبکہ شاگردی اور استادی کے مسائل "PROTEST" — "STRIKE" — "DECLARATORY SUIT" "پرچہ پھاڑ" — اور "کاپی پھینک" وغیرہ کے ذریعہ طے ہوتے ہیں بلکہ اس زمانہ کے استاد جبکہ "جورِ استاد بہ ز مہرِ پدر" پر عام معاشرہ کا یقین تھا اور ماں باپ اور استاد کے درمیان "گوشت پوست استاد کا اور ہڈی ماں باپ کی" کے معاہدہ پر معاملہ گویا طے شدہ تھا۔

منشی جی فیض اللہ میرے آبائی وطن، عارف پور نوادہ میں پرائمری کے ہیڈ مدرس تھے۔ عارف پور نوادہ شہر بدایوں کی چنگی سے باہر صرف تین فرلانگ کے فاصلہ پر مضافاتی گاؤں ہے اور اسی لیے وہاں پرائمری سکول تھا۔ سازگاری حالات کے تحت ہمارے منشی جی سرکاری ملازمت میں جمنے کا ریکارڈ قائم کر گئے اور "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" تیس سال ملازمت اور پانچ سال توسیع سروس کی عمر کے پورے پینتیس سال؛ برخاستگی یا معطلی تو در کنار تبادلے سے بھی بے نیاز رہے۔ گویا ہمارا مدرسہ ان کا مالِ غیر منقولہ اور وہ ہمارے مدرسہ کا مالِ منقولہ تھے۔ سات روپیہ ماہوار سے شروع کر کے بیالیس روپیہ ماہوار پر ریٹائر ہو گئے اور اکیس روپیہ ماہوار پنشن پا گئے جو منشی جی نے پورے پچیس سال وصول کی اور پچیس سال بعد ملک الموت نے ان کے پنجہ سے محکمہ تعلیم کی گردن چھڑائی ورنہ جس طرح وہ عارف پور نوادہ کے مدرسہ کو چمٹ گئے تھے اس سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ محکمہ پر ناخن گاڑے ہوئے تھے لہٰذا ظاہر ہے کہ استادی اور شاگردی

دونوں کی زنجیر لمبی ہوتی رہی چنانچہ منشی جی اپنی ملازمت کے شروع سالوں میں میرے تایا صاحب قبلہ کے استاد رہے پھر والد صاحب قبلہ کو شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد بڑے بھائی نے زانوے ادب تہ کیا اور بہت اخیر سالوں میں مجھے ان سے پالا پڑا۔

شروع جوانی میں جب منشی جی ورناکیولر مڈل پاس کرکے اس مدرسہ پر تعینات ہوئے تو سنتے ہیں کہ کچھ گداز بھی رہے تھے مگر میری استادی کے زمانہ میں جب وہ سرٹیفکیٹ کے حساب سے پچاس سے اوپر تھے اور سرکاری عمر یا دن تہ بچپن کی تھی اور گھر کی عمر ساٹھ کے ارد گرد رہی ہوگی، بڑے لمبے تن و توش کے حامل تھے اور کسی کھونٹ بوڑھے نہ تھے۔ ان کے قد و قامت میں گوشت کو کوئی دخل نہ تھا اور ہڈیوں کے بجائے جیسے کچھ "ہاڑ" کی متناسب چوڑائی میں ان کا چھ فٹ ایک انچ لمبا قد ایسی موزونیت کے ساتھ کھپا ہوا تھا کہ بغور دیکھنے پر بھی منشی جی دراز قد نہ معلوم پڑتے تھے ——— چمکدار سیاہ جیسے آبنوس کا لٹھا سا وجود، چہرے سے زیادہ سیاہ ترچھے ترچھے کھنچے ہوئے سے ہونٹ جن کے اندر پنج وقتہ وضو کے ساتھ مسواک سے رگڑے ہوئے چمکدار سفید دانت کلیجی کے رنگ کے مسوڑھوں میں جڑے ہوئے، جو ساری عمر کبھی مسکرانے میں چمکتے ہوئے یاد نہیں البتہ اندازِ تحکم میں وقتاً فوقتاً شیر کی طرح نمایاں ہوتے رہتے۔ مشرع منڈی ہوئی مونچھوں والے ترچھے ترچھے دہن پر ہمہ وقت اپنے پیشہ کے بہیم شاہانہ احساس اور پیشانی کے مستقل بلوں میں استادانہ جلال کی نشانیاں اتنی راسخ تھیں کہ شاگردوں کی اگلی پچھلی تینوں پشتوں میں سے کسی فرد کو منشی جی فیض اللہ اپنے فطری تیوروں اور اصلی شکل میں کبھی دیکھنا نصیب ہی نہ ہوئے اور میں کیا میرے باپ، تایا، بھائی کسی کے کان میں بھی منشی جی کے قہقہہ کی آواز تو کبھی گئی ہی نہ تھی۔ تن و توش کے مطابق نہایت موزوں بلکہ یوں کہئے کہ "فٹ" داڑھی جو کبھی کالی رہی ہوگی تو نہ معلوم کیا معلوم ہوتا ہوگا، میرے زمانہ میں بھی جبکہ آدھم ادھا کھچڑی تھی سیدھی سادی نیچے کو کھڑی ہوتے ہوئے بھی چہرہ پر ایسی معلوم پڑتی جیسے اٹھارھویں صدی کے کسی مطلق العنان راجپوت کے گل مچھے ہیں۔ سر پر پٹے جو نہایت اہتمام سے بیچ کی مانگ کے ساتھ پیچھے کو کھڑے ہوتے تھے۔ پیشانی کی چمکدار سیاہی میں ٹیالا مٹیالا نماز کا سیاہ گٹا ——— اور منشی جی کی آنکھیں! الامان والحفیظ!! اس وقت بھی تصور کرتا ہوں تو خوف کے مارے جھرجھری سی آجاتی ہے حالانکہ کبھی چار کرکے دیکھنے پر تو قادر ہی نہ ہو سکے۔ کبھی دھوکے سے جھلکی سی نظر جا ملی یا کنکھیوں سے دیکھ لیا۔ تحکم اور جبروت کے دو ڈائنمو ——— بڑی بڑی دہکتی چنگاریاں سی چھوڑتیں، جیسے ہمہ وقت ڈانٹتی سی ——— پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس جلال کے پردہ میں زہد و اتقا کے جمال کی خشک نشانیاں بھی بڑی واضح جھلکتی تھیں اور منشی جی کے تیور جلال در جلال کے مظہر تھے۔ سر پر ذرا ڈھیلی اور قدرے بے ترتیب بندش والا سفید عمامہ، بدن پر کورے لٹھے کا خوب نیچا سا کرتا، اور اسی لٹھے کا ٹخنوں سے اونچا شرعی مغلئی پائجامہ، پاؤں میں لال نری کا منشی جی کے مزاج کی طرح کرخت جوتا ——— پائجامہ کی سفید مہریاں، پنڈلیوں اور ٹخنوں کی سیاہی جس پر ایک جانب ٹخنے کے ساتھ تانہ کی بھوری ٹھیٹھ بھی ابھری ہوئی تھی اور اس کے نیچے سرخ نری کا جوتا اوپر سے نیچے فٹ بھر کے اندر ہی سیاہ، سپید اور سرخ رنگوں کا بڑا عجیب امتزاج پیش کرتے تھے۔ آواز میں مدرسہ کے اندر نظم و نسق اور درس و تدریس کے وقت شیر کی گرج کا زیر و بم سنائی پڑتا تھا اور ڈرل کے وقت میدان میں بادل سا گرجتا تھا اور تخاطب کے وقت خواہ منشی جی لب بلیں یا نہ بولیں گردن اور آنکھوں کی خطر حرکت کے ساتھ ایک "غوں" سی نکلتی جیسی بالعموم تیندوے کے منہ سے جب اس کا شکار یقینی نظر میں ہوتا ہے حملہ سے عین پیشتر نکلتی ہے ——— اور کبھی کبھی جب دیر ہو جاتی اور منشی جی سب طلباء کو اپنی امامت میں مدرسہ کے میدان پر مغرب کی نماز پڑھاتے تو یہی آواز ہرگز از

قرأت میں لہراتی سی سنائی پڑتی۔ مستقل بنا ہوا تر چھا بلند و بالا قد، اکڑی ہوئی گردن جیسے سب کچھ سیدھا ہو جاتا۔ چوڑائی سکڑی سکڑی سی لمبائی منتھی بھر گھٹی سی، اور ڈھیلا کتا واقعی ڈھیلا معلوم ہونے لگتا اور چہرہ کا حال خدا جانے، ہم تو پیچھے ہونے مگر پیچھے سے تصور میں منشی جی فیض اللہ کا چہرہ نہیں جیسے کسی اور کا نرم چہرہ دکھائی پڑتا۔

شروع زمانہ طالب علمی میں میں نے اپنے شہر کے اسلامیہ اسکول کی اسٹرائک میں حصہ لیا اور بڑے سخت گیر ہیڈ ماسٹر سے آنکھ سے آنکھ ملا کر مطالبہ کیا۔ اب سے بتیس سال قبل مجھے خالص انگریزی اسکول میں بورڈر کی حیثیت سے داخل کیا گیا تو میں نے محسوس کیا کہ اسکول کے پانچ سو طلباء میں ہم چند کالے ہندوستانی ہیں اور ہمارے ساتھ ادارہ کا عملہ اور گورے اور نیم گورے طلباء مغارانہ اور رنگ گونہ ہتک آمیز برتاؤ کرتے ہیں۔ میں نے اس احساس کو اپنے چند کالے ساتھیوں میں تیز کیا اور اس کے خلاف آواز اٹھائی اور کالے گوروں کا محاذ قائم کرا دینے کے الزام میں جب مجھ سے میرے سفید فام اسکاٹ النسل پرنسپل نے جواب طلبی کی تو میں نے صاحب موصوف کی بھوری بھوری آنکھوں میں اپنی کالی آنکھیں ڈال کر بات کی جس کے نتیجہ میں مجھ کو پہلے ہوسٹل سے اور پھر درسگاہ سے نکالا ملا۔ میں جیوری کا ممبر تھا بعض سیشن کے مقدمات میں میں نے بڑے سخت گیر ججوں کی رائے سے نہایت ترچھے تیوروں کے ساتھ اختلاف کیا۔ قومی حکومت کے دورِ جلال میں اور انگریزی حکومت کے دورِ شباب میں میرے ضلع کے دو تین کلکٹر اور ایس پی ایسے گزرے جو خون کے پیاسے کی حد تک میرے دشمن رہے مگر جب رُو در رُو موقع آیا تو میں نے ان سے ایسے انداز میں بات کی جس کے وہ عادی نہ تھے لیکن نہ کر سکا تو میں منشی جی فیض اللہ کے سامنے آنکھ اونچی ——— میں شکاری ہوں، عمر میں دو تین مرتبہ مجھ پر زخمی تیندوے نے چارج کیا ہے مگر میں نے اس کی غوں غوں کو بڑی استقامت کے ساتھ سنا ہے اور نہایت چابکدستی سے بندوق اٹھا کر اس کے حملہ کو روکا ہے لیکن منشی جی فیض اللہ کی گھڑکی پر ہمیشہ اعصاب کا نظم و نسق کھو بیٹھا ہوں۔

مشہور بات ہے کہ جیل، تھانہ، اسکول اور فوج میں سو کن سے لے کر لارڈ میکالے تک کوئی کُلّی قانون معین نہ کر سکے، وقت اور موقع کے مطابق حاکم کی مرضی ان جگہوں میں قانون ہوا کرتی ہے اور دیہاتی افسر مدرس کے تو منہ کا نکلا ہوا ایک ایک لفظ اٹل قانون کا حکم رکھتا ہے اور پھر ہمارے منشی جی تو خود اٹل تھے ——— تبادلہ کی شق سے بے نیاز، تندرست ایسے کہ کبھی سر نہ دُکھا اور نہ کبھی بجز اسکول میں پڑھانے کے کوئی اور کام پڑا جس کے لیے بندۂ خدا ایک دن کی بھی چھٹی لیتے اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ علاوہ افسر مدرس ہونے کے منشی جی قصبہ کے ڈاک گھر کے ڈاک منشی بھی واقع ہوئے تھے اور یہ ہمیں اسی زمانہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ دنیا میں ہر جگہ تعطیل ہوتی ہے مگر پوسٹ آفس اتوار کو بھی بند نہیں ہوا کرتا لہٰذا مدرسہ کی تعطیل کے دن بھی منشی جی ڈاک کھولنے بند کرنے آیا کرتے۔ ویسے خدا کا شکر ہے کہ منشی جی کا گھر ہمارے گاؤں سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا اور ظہر کی نماز پڑھ کر آیا کرتے اور بالعموم عصر کی اور کبھی کبھی مغرب کی نماز پڑھ کر جایا کرتے۔ جاگتے گھنٹوں میں منشی جی گاؤں کے ہر لڑکے کے اعصاب پر سوار رہتے اور جب ہم لوگ اپنے بستروں پر لیٹ جاتے تو بھوت مسان کے اکڑے ہوئے بچے کی طرح خائف سویا کرتے۔

مبلغ پانچ روپیہ ماہوار اسپیشل الاؤنس کے علاوہ صبح ہی صبح ایک پاؤ خالص دودھ اور دو روغنی ٹکیاں ناشتہ میں اور دوپہر کو گوشت، دال ترکاری اور گیہوں کی بارہ چپاتیاں (جو منشی جی کی ایک وقت کی خوراک تھیں اور پورے آدھ سیر آٹے کی پکتی تھیں) اور دن بھر میں درجنوں چلم تمباکو میرے یہاں سے پاتے۔ پھر مدرسہ کی جائے وقوع میرے حق میں بڑی بے ڈھب تھی۔

زنانہ مکان کا پیش دروازہ اور مدرسہ کا میدان ایک ہی چیز تھا اور مدرسہ کی عمارت اور میرے نوکروں کی کوٹھریاں بالکل ملحق تھیں لہٰذا پڑوس کا حق علیحدہ، اور رات صبح کے دودھ کے گھونٹوں اور پراٹھوں کے نوالوں سے چل کر دوپہر کے خوان سے گزرتی اور رڈیڑھ پاؤ تمباکو کے دھوئیں میں سے ہوتی مہینہ کے مہینہ پانچ روپیہ تک جا پہنچا کرتی اور فصل کے فصل ہر قسم کے پھل آم، امرود، سنگھاڑہ، خربوزہ، تربوز اور اجناس گھی، دہی، دودھ غرض ہر اس تحفہ کے گرد گھوما کرتی جو دیہاتی زمینداروں کے یہاں پیدا ہوتے ہیں لہٰذا ہماری پوزیشن کا امتیاز اسکول میں اظہر من الشمس تھا اور اس سب کے صلہ میں تعطیلات کے علاوہ روزانہ کی حاضری میں ہم سب سے پہلے آنے والے اور سب سے پیچھے جانے والے طلبا میں تھے اور ساتواں دن اتوار کا (خوش قسمتی سے نصف کیونکہ ڈاک خانہ بند کر کے منشی جی دوپہر کا کھانا کھا کر بارہ بجے چلے جایا کرتے تھے) آموختہ دہرانے کے لیے مخصوص تھا۔ خصوصاً حساب کے سوالوں کی کوئی حد ہی نہ تھی یعنی تیسری اور چوتھی جماعت میں قاعدہ وار یا نمبروار سوال نکالنے کی گنتی ہمارے یہاں نہ ہوتی تھی بلکہ نمبری وار ایک طرف سے اوّل تا آخر اس طرح اُترتے چلے جاتے جیسے کوئی دلچسپ ناول پڑھا جاتا ہے۔ منشی جی کو حساب کے سوالوں کی مشق کرانے کی لت تھی۔ اکثر چار چار پانچ پانچ گھنٹہ ان کے شاگردوں کو سلیٹوں پر جھکا رہنا پڑتا اور منشی جی کی سخت گیر طبیعت اور سنگین جبلت کا شاید ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ وہ علم الحساب پر زیادہ توجہ دیتے تھے اور کبھی کبھی تو دماغ اتنا تھک جاتا کہ اسکول کی چھٹی کے بعد ایسا محسوس ہوتا کہ ریاضی کا خانہ بالکل خالی ہی ہے، جغرافیہ، تاریخ، زبان، خط نویسی اور خوش خطی پر بھی ایسی ہی بے تحاشا محنت لیا کرتے۔

خوب یاد ہے ایک مرتبہ اتوار یا کسی اور تعطیل کا دن تھا، ہم چند بدنصیب صبح ہی سے منشی جی کے پھندے میں پھنس گئے تھے نکلتے جاڑے کا موسم تھا —— مدرسہ کے صحن میں استاد شاگرد سب دھوپ کھا رہے تھے یا بقول کسی افغانی کے دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ منشی جی ڈاک خانہ کے حساب میں منہمک تھے جو ان کے لیے شاید اتنا ہی وقت طلب اور دماغ سوز تھا جتنا ہمارے لیے چکرورتی کے پیچیدہ سوال۔ دوہرے سینہ کا رُوئی کا کوٹ، اس کے نیچے رُوئی کی بنڈی، اس کے نیچے اُونی سویٹر پھر اپکے کا قمیص اور سب سے نیچے موٹی بنیان، ہم دار م چرانہ پشم کا مجسمہ بنے پیٹ کے اندر گرم گرم دودھ، روغن پراٹھے انڈے کے آملیٹ اور ناشتہ کے حلوے کا گراں ناشتہ بھرے ایک زانو بچھائے دوسرا کھڑا کیے مونجھ کے پٹڑے پر بیٹھے تھے اور کھڑے زانو پر سلیٹ ٹکی ہوئی تھی، علم الحساب چکرورتی کی ضخیم جلد سامنے تھی —— اور سلیٹ پر کم و بیش آدھے انچ پتھر کی پنسل گھس چکی تھی کیونکہ صبح ۸ بجے سے دن کے بارہ بجے تک چار گھنٹہ میں "کام اور وقت" کے سوالوں کی پوری نمبری حل کرنی تھی اور اس وضع سے کہ معدہ کا بالائی حصہ اور پشت و سینہ روئی کے پہلوں میں ملفوف اور تمام شکم اوپر سے نیچے تک کھڑے زانو کے مسلسل دباؤ میں اور پشت اور دماغ کا پچھلا حصہ شروع فروری کی کرنیں جذب کر رہا تھا۔ پیچھے سے دھوپ کی مسلسل حرارت، آگے سے زانو کا پیہم دباؤ اور اس تواتر اور تسلسل کے ساتھ شدید قسم کا ذہنی انہماک —— بارہ بجے جب منشی جی ڈاک خانہ کے سب ہفتہ وار نقشوں کی خانہ پُری کر چکے اور ہم پورے پچاس سوال نکال چکے اور جب اندر سے منشی جی کے لیے کھانا آیا تو ہم نے ماحول کا بلکہ شاید خود اپنے وجود کا احساس کیا اور ایک لمبی سانس لے کر اِدھر اُدھر دیکھا اور محسوس کیا کہ شاید چھٹی کا وقت ہو گیا اور منشی جی نے ہمیں قیدِ تعلیم سے آزاد کیا مگر بستہ لپیٹ کر جب ہم کھڑے ہوئے تو ہم نے محسوس کیا کہ کھانے کا وقت تو ہو گیا مگر ہمارے پیٹ میں بجائے بھوک کے ناف سے لے کر کوڑی تک جیسے پورا ایک مٹکا کھولتا ہوا گرم پانی بھرا ہے۔ افتاں خیزاں بغل میں بستہ دبائے ہم اندر پہنچے جلدی جلدی کوٹ کے بٹن کھولے

بستہ پٹک کر اِدھر سے اُدھر ٹہلے ——— اور بس سایہ میں پہنچتے ہی جیسے ہانڈی پورے اُبال پر آگئی۔ دونوں جانب دائیں بائیں کنوتیوں پر کالی کالی لہریں سی چلتی معلوم ہوئیں۔ آنکھوں کے سامنے پہلے تتلیاں اڑیں پھر چمگادڑ پھڑپھڑائے اور پھر کالا کالا دریا موجیں مارنے لگا۔ کانوں میں اِدھر اُدھر کی آوازیں ایسی نامانوس اور پنپناتی سی سُنائی دیں جیسے کوئی اجنبی ٹیلیفون پر بول رہا ہے ——— اور یکدم فضا گھومی، دھندلے دھندلے سایے آس پاس ناچے، پاؤں تلے زمین تھرتھرائی اور ایک مرتبہ کو ساری دنیا گھوم گئی، لپک کر ستون کا سہارا لیا، گرتے گرتے بچے اور بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی اڑا اڑا دھوں! تڑاق پڑاق ——— دودھ بشکل دہی، حلوا نرتی معکوس کر کے رقیق گھلے ہوئے نشاستے کی شکل میں اور انڈا شاید نیم بسمل مرغے کی صورت۔ الغرض سب کا سب صبح کے ناشتے کا سامان سامنے پھیلا ہوا تھا ——— اور جب ہم نے آنکھیں کھول کر اندازہ کیا تو جتنا کھایا تھا اس سے ٹھیک دس گنا برآمد ہوا تھا اور نہ معلوم کب تک کی کھائی پی سب نکل گئی۔ گھر میں سب نے بالاتفاق رائے دی کہ نظر لگ گئی ہے اور جب دوسرے روز صبح کو اسکول گئے تو معلوم ہوا کہ استفراغ کی خبر منشی جی کل ہی سن چکے تھے کیونکہ انھوں نے پہنچتے ہی غرا کر مزاج پرسی کی "ابے حرام خور! ایں! آں! اتنا کیوں کھا جاتا ہے کہ ہضم نہیں کر سکتا، پھر اوگلتا پھرتا ہے۔" اور اس وقت تو ہم بھی نہ سمجھے اور ہم کیا ہمارے استاد بیچارے بھی نہ سمجھے اور اگر استاد اس بیماری کا سبب سمجھتے تو یہ لاحق ہی کیوں ہوتی۔

ہمارے منشی جی فیض اللہ کے اختیارات لامحدود تھے اور اختیارِ سماعت بھی لامحدود تھا یعنی کچھ وہ ہمارے اسکول کے گھنٹوں کے ہی چابک سوار نہ تھے بلکہ وہ تو ہمہ وقت سوار رہتے۔ کوئی واقعہ اسکول کے وقت میں ہو یا اسکول لگنے سے قبل یا چھٹی ہونے اور منشی جی کے تشریف لے جانے کے بعد شام یا رات کا یا گھر کے اندر ہو خواہ گھر سے باہر کہیں بستی میں جس سے قریب یا دور کا کیسا ہی واسطہ ان کے کسی شاگرد کا ہو اور سمجھ لو کہ منشی جی کے اختیارِ سماعت میں پہنچ گیا دوسرے روز اول وقت ہی منشی جی کے علم میں آجانا لازمی تھا اور سزا کے سرسری اختیارات سے قدرت نے انھیں سرفراز فرمایا ہی تھا۔ ان کے نافذ شدہ احکامات کا مرافعہ یا اپیل نعوذ باللہ اللہ میاں کے یہاں بھی نہ تھا اور کیسے ہوتا عہد ماورا التاریخ کا لٹریچر ان کے بے انتہا تعزیری اختیارات ثابت کرنے کے لیے ہمارے اخلاقی معیار پر کس درجہ حاوی تھا اور رساوتی دور کی یہ تعلیم "جورِ استاد بہ ز مہرِ پدر" ؎

استاد و معلم چو بود بے آزار ——— خرک بازند کودکاں در بازار

باپ کی شفقت تو در کنار ماں کی ممتا پر بھی حاوی تھی ؎

مات پتا گورو سوامی سکھ سروسر کریں بھائے ——— ہو، لابھ ان جنم کے تتر جنم جگ جائے

وغیرہ وغیرہ روایات و ضرب الامثال ہمارے معاشرے میں استاد کا درجہ ذہنی اور جسمانی ہر طور پر ماں باپ سے زیادہ بلند قائم کرنے کے لیے موجود تھیں بس جس کسی بچے پر منشی جی کی نظرِ قہر ذرا زیادہ گہری ہوئی وہ خوشی کے مارے جامے میں پھولا نہ سمایا اور منشی جی کی خاطر و مدارات ہونی لگی یا یوں کہیے کہ منشی جی خاطر و مدارات کے بدلے تیغ نگاہ پر ہمہ وقت سان رکھے رہتے تھے۔ جاڑوں میں گنے، رس، گڑ، کھانڈ، سنگھاڑے، شکر قند، نارنگی، امرود، آلو اور ترکاریاں، گرمیوں میں بیر، تربوز، خربوزہ، آم، پیاز، لہسن، دھنیا غرض ہر وہ چیز جو ہمارے فارم اور باغ میں پیدا ہوتی تھی وہ سب منشی جی کو بطور تحفہ نہایت افراط اور عقیدت کے ساتھ پیش کی جاتی گویا ہمارے لاغر اور نحیف جسم پر دستکاریاں دکھانے کی اُجرت ادا ہوتی اور کیوں نہ ہوتی جب اس وقت اندر سے لے کر باہر تک اور شاید ماہرینِ تعلیم تک شاگرد استاد اور والدین

سرپرست سب کا یہ عقیدہ تھا کہ تعلیم کی MASTER KEY تعزیری بید کی نوک ہے۔

اور وہ ہمارے تعزیری بید کا سپلائی ایجنٹ (کٹ گیا ورنہ اب بھی منہ سے یہی نکلتا کہ خدا غارت کرے کم بخت کو) وہ لمبا چوڑا دیوزاد شیشم کا درخت جو مدرسہ کے عین پیچھے غربی دروازوں کے سامنے پختہ سڑک کے کنارے ایستادہ تھا اور پی ڈبلیو ڈی کی ملکیت تھا اور محض اس قصور میں قتل کیا گیا کہ جب ہم جوان ہوئے اور اپنے آبائی مکان میں ترمیم و توسیع کا خیال آیا تو سب سے پہلے ہم نے اس مدرسہ کو منہدم کر کے اپنے مکان میں شامل کیا اب یہ بجائے مدرسہ کی پچھیت کے ہماری پشت پر آگیا مگر پھر ہمسایہ کے ساتھ یہ سلوک کیسا لیکن کیا کریں اس کی ہمسائیگی میں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ بچپن میں تو اس کی قمچیوں سے نہ معلوم کتنے چرکے اٹھائے ہیں خیر وہ تو اٹھا گئے لیکن اب اگر کوئی چرکہ اس کی ذات سے پہنچا تو وہ نہ اٹھایا جائے گا کیونکہ احتمال تھا کہ جناب کی وساطت سے کوئی شب زندہ دار ہمارے اثاث البیت پر ہاتھ صاف نہ کر دے لہٰذا مجبوراً ہمیں اپنے دیہاتی قانون کی صحرائی دفعہ لگا کر باوجود گورنمنٹ پراپرٹی ہونے کے حفاظتِ خود اختیاری میں موت کے گھاٹ اتار دینا پڑا اور لوگوں نے ممکن ہے کہ بدگمانی بھی کی ہو کیونکہ صبح سے شام تک جتنی قمچیاں درکار ہوتیں منشی جی فیض اللہ اسی سے کٹوا کر منگایا کرتے مگر اس کے قطع و برید میں پرانی عداوت کو کوئی دخل نہ تھا حالانکہ پُروائی چلتی ہے تو اب بھی پیٹھ اور ہتھیلیوں پنڈلیوں پر یادیں ابھر آتی ہیں —— آہ! وہ مقہور درخت پچھم رُخ پر ہمارے مدرسہ کی چھت پر کو جھکا ہوا، دیہاتی موٹا تازہ والا شیشم، جسے منشی جی فیض اللہ کو آلاتِ ستم بنا کر دینے کے سوا پھول پھل دینا کچھ آتا ہی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جنت میں لکڑی کا کام نہیں اور نہ شیشم جیسے بے پھول پھل کھورے درخت کا گزر، پھر اعمال جیسے تھے ظاہر ہے، معصوم پھول سے ننھے ننھے جسموں پر مشقِ ستم کے ہتھیار بنا بنا کر منشی جی فیض اللہ کے ہاتھ میں دینا بس ساری عمر اسی میں کٹی یہاں تک کہ خود کٹ گیا۔ دوزخ کا ایندھن بنا ہو گا۔ کم بخت کی تلوار کی دھار جیسی ضربیں اتنی کھائی ہیں کہ آج بھی رونگٹا رونگٹا یاد کر کے پکارتا ہے ؎

رگ رگ میں نیشِ غم ہے، کھینچے کہاں کہاں کی

لیکن ایک دن کی قمچیاں آج تک یاد ہیں اور پیٹھ پر پلپلاتی ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک روز شام کو اسکول کی چھٹی کے بعد سڑک پر ایک بیل گاڑی (لمبا چھکڑا) طماٹر کی چھپڑوں کے گٹھوں سے اوپر تک بھری ہوئی گزری۔ اتنے بہت سے وہ قلم جو پیسہ میں دو نیزے آیا کرتے تھے، دیکھ کر طالب علمی حلقہ میں ہیجان پیدا ہو جانا لازمی امر تھا۔ سڑک پر پوری چکڑی کھیل رہی تھی چند بد اندیش قسم کے خلفاء نے گاڑیبان کو آگے سے باتوں میں لگایا اور چونکہ شام ہو رہی تھی لہٰذا یہیں پڑاؤ کرنے کی تجویز پیش کی اور جب اس پر وہ آمادہ نہ ہوا تو آگے راستہ خطرناک بتایا اور رہزنوں کا خوف دلایا اور اتنی دیر میں کہ اس نے آگے والوں کے نیک مشورے سنے اور بستی کے پڑاؤ پر الاؤ میں سے آگ لے کر ایک چلم بھر کر پی، پیچھے والوں نے نہایت نرم روی کے ساتھ ایک ایک چھڑ کر کے آڑ میں ایک اچھا خاصا گٹھا جمع کر لیا اور وہ آگے والے متواضع اور ہمدرد بزرگوں کے مشوروں پر غور ہی کرتا رہا اور پیچھے والے گٹھا سڑک پر سے بستی میں لے فرار ہو گئے اور اسے خبر بھی نہ ہوئی مگر یقین مانئے نہ ہم آگے والوں میں تھے نہ پیچھے والوں میں، اگر اس زمانہ میں ہم کو یہ معلوم ہوتا کہ قلم، پنسل، روشنائی وغیرہ کی چوری چوری نہیں ساہوکاری ہوا کرتی ہے تو ہم ضرور بڑھ کر ہاتھ مارتے —— مگر خیر ہم تو بس دور کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ جب حصہ بانٹ کا وقت آیا تو اپنی چودھراہٹ کے زور پر حصہ برابر کا لیا لہٰذا قانونی اصطلاح میں "داشتنِ مالِ مسروقہ" کے مجرم ہو گئے اور پھر دوسری اصطلاح میں "باوجود علم و اطلاع کے" —— پھر جو ہونا تھا سو ہوا ایک دفعہ تو قلمدان

بھر گیا اور پٹواری کے لڑکے کنور بہادر عرف کمرا نے موٹے باریک ہر طرح کے قلم بنا بھی دیے۔ تقسیم کے بعد وہ ایک ذاتِ شریف کو بھی اطلاع ملی جو نہ تو آگے والوں میں تھے اور نہ پیچھے والوں میں اور نہ ہماری طرح تماشائیوں میں ہی۔ نہ تو شریکِ کار اور نہ شریکِ حال — خیر انھوں نے بھی کچھ اپنی ٹھکرائیت کے بل پر اپنے حصّہ کا مطالبہ کیا۔ خیر وہ وقت سے آجاتے تو شاید ان کے مطالبہ پر تھوڑا بہت غور ہو بھی جاتا مگر جب حصّے بخرے ہو چکے تو بھلا نیا حصّہ کہاں سے آئے۔ لوٹنے والے غازی مرد صاف اینٹھ گئے۔

"واہ! کاہے کا تمھارا حصّہ؟" صالح نے کہا۔

"کیا کہنے — واہ! یہ خوب ہے۔ مال والے ...... کھسوٹو مست۔" مجتبیٰ بولے۔

"ابے تیرا کھایا نہ پیا، تیری ہے ہے!! ذرا صورت تو دیکھو یعنی ایسے بکرماجیت ہیں کہ گھر بیٹھے حصّہ لیں گے!" نائی کے ننھوا نے کہا، "بڑے شوقین ہیں کیا کہنے آپ کے؟"

اور پٹواری کا کمرا کائستھ پٹواریوں کے مخصوص انداز میں بولا "ارے بھائیو! حاضر کا حصّہ تھا۔ اب ان بھائی ابوالفضل کو دیا نہیں پورا حصّہ؟ تم ہوتے تو تمھیں بھی ملتا۔ بھلا ہم ایسا کرتے کہ تم ہوتے اور تمھیں حصّہ نہ دیتے؟ بھیّا — احمد جان، وحید۔ اب تم ہی انصاف سے بتاؤ کس کے حصّہ میں سے کاٹ کر دیں تمھیں، اور پھر جو چیز بٹ گئی اور اپنی اپنی ہو کر ٹھکانے لگ گئی اب کہاں سے آئے؟ اگر ذرا دیر پہلے آجاتے تو مل جاتا، اور کچھ نہیں تو میں اپنے حصّہ میں سے تم دونوں کو ضرور دیتا۔" اور فوراً آلِ حسن نے لقمہ دیا "دیکھو بھیّا وحید، احمد جان! آج تک ہم نے کوئی چیز بغیر تمھارے کھائی ہے؟"

"واہ! خیر دیکھا جائے گا۔ اتنا بڑا گٹھا ہضم کر گئے اور ہمیں ایک قلم نہیں۔ ہوں۔" وحید اور احمد جان نے کہا۔

اور صالح نے چیخ کر کہا، "جی کوئی آپ بڑے بھاری سورما ہیں کہ مفت میں حصّہ لیں گے؟"

"جاؤ دیکھا جائے گا۔"

"ہاں جاؤ دیکھ لینا — کیا کر لوگے؟"

اور جب اِدھر اُدھر سے زیادہ اکڑ ہوئی شاید کمرا کو جیسے ایک نامعلوم اور گہرا سا خوف لاحق ہوا اور کائستھ کھوپڑی نے اک ساعت سوچ کر پینترا سا بدلا۔ "دیکھو بھیّا! تم لوگ بیکار جھگڑتے ہو، اچھا بھائی احمد جان! تم لوگ اس وقت تو درگزر و اب تو میں گھر رکھ آیا۔ میرا قلم دان بھرا ہوا ہے، آج والے بلکہ اور سب میرے پہلے کے قلم بھی تم دونوں آدھے آدھے کر لینا، میں کل صبح قلمدان جھاڑ دوں گا۔ تم ہی لکھنا۔ کوئی بات بھی تو ہو، سب تمھارا ہی ہے، ایک ہی بات ہے تمھارے پاس رہے یا میرے پاس — ہاں! اگر آج تم لوگ ہوتے تو ہم سب مل کر ایک گٹھا اور مار کر لاتے، اس وقت تھی بڑی تنگ۔"

"چل مرنگے سالے! بڑا آیا بن کے لکھ لٹ کا بچہ، کیا ہم کوئی فقیر ہیں؟" احمد جان نے ترچھا ہو کر جواب دیا اور وحید بھی تن گیا۔ ادھر بھیّا کنور بہادر کی ہمدردی میں ہم سب تن گئے۔ وہ تو معاملہ سنگین تر صورت اختیار کرنا چاہتا تھا مگر ہمارے لیڈر کنور بہادر جیسے کسی مصلحت کے تحت ایک قسم کا بھاری بھرکم اور بزرگانہ انداز بنائے ڈھیلے ہی رہے ورنہ ہم دست و گریباں ہو جاتے۔ اتنے میں کچھ لوگ جو عشا کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے درمیان میں آگئے اور بچ گئی مگر چلتے چلتے اِدھر اُدھر سے "چھوٹ" کا اعلان ہو گیا۔

اور منشی جی کے اختیاراتِ سماعت تو لامحدود تھے اور انٹیلیجنس بڑی زبردست۔ کوئی واقعہ ہو گھر کے اندر چھوٹے بڑے

بہن بھائیوں سے، اماں سے، ملازموں سے، کسی پڑوسی یا راہ گیر سے خواہ مدعی ہو یا نہ ہو، منشی جی مدعی بن جایا کرتے اور پیٹا نٹر کی رہزنی تو دن دہاڑے ہوتی تھی اور چیلنجوں کا تبادلہ ہو ہی چکا تھا۔ منشی جی گھر سے فجر کی نماز پڑھ کر چلا کرتے تھے اور میل بھر کا اسکول تک کا فاصلہ سورج نکلتے نکلتے طے کر لیا کرتے تھے اور احمد جان اور وحید فجر ہی کے وقت سے اسکول سے دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر بیٹھے سڑک پر انتظار کر رہے تھے، بس دو لفظوں میں جاسوسی کر دی۔

اور منشی جی اسکول میں داخل ہوئے۔ ایک آنکھ لال، ایک آنکھ پیال، غصہ میں جیسے آبنوسی چہرہ، کڑوا تیل سا ملا ہوا، ہونٹوں سے کف چھوٹتا ہوا، احمد جان اور وحید ماتیں بائیں حلقہ انسپکٹر اور کوتوال شہر کے دم خم میں۔ بس دیکھتے ہی ہم سب کی روح فنا ہو گئی۔ اللہ خیر کرے۔ ان دونوں شیطانوں کے چہروں پر چمک اور ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ۔ اگر یہ ساتھ نہ ہوتے تو ہم سمجھتے کہ منشی جی منشا سے لڑکر آ رہے ہیں مگر یہ اکثر مہینہ کی دوسری تاریخ کو ہوا کرتا تھا جب وہ ایک روز قبل تنخواہ لے کر جایا کرتے تھے اور بس مدرسہ میں گھستے ہی دو چار کی شامتیں آ جایا کرتی تھیں۔

منشی جی نے مجمع پر ایک قہر آلود نگاہ ڈال کر اپنے تیوروں کے مطابق پہلے ایک ببر کی سی غوں نکالی اور جیسے غوں کے تسلسل ہی میں سنائی پڑا "کیوں بے سؤرو! یہ کل ٹانٹر کس کس نے چرائے ہیں گاڑی میں سے ایں!؟"

اور پیشتر اس کے کہ کوئی جواب دے احمد جان اور وحید دونوں اپنے قلم دان کھول کر کھڑے ہو گئے اور بولے "منشی جی دیکھ لیجئے ہمارے قلم دانوں میں تو سب پہلے کے چلے ہوئے قلم ہیں، آپ کے اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے۔"

اور یہ چیز منشی جی کو ایک مخصوص طرزِ تحقیقات کی جانب متوجہ کرنے والی ثابت ہوتی اور ہماری سب کی نگاہیں یکدم اپنے قلمدانوں کی جانب گئیں، کلیجہ دھک سے ہو گیا، یہ درجنوں کی درجنوں مالِ مسروقہ کی ہضم کیے پڑے تھے اور منشی جی اندازے سے سمجھ گئے کہ مالِ مسروقہ برآمد ہو گیا اور پھر ذرا توقف کر کے کنور بہادر سے مخاطب ہو کر گرجے "ابے سُنتا ہے کمرا! —— تو ٹھیک ٹھیک نام ہم کو سلیٹ پر لکھ کر دے۔"

اور کنور بہادر بدانند کا شستہ بچہ بڑے اطمینان کے ساتھ بولا "منشی جی! او پر ایشور اور نیچے استاد، آپ سے ویسے بھی کوئی بات چھپائے نہیں چھپ سکتی لہٰذا جھوٹ نہیں بولوں گا" اور یہ کہہ کر نہایت سنجیدگی کے ساتھ بستہ کھول کر سلیٹ نکالی اور ایک جانب کو کھسکا اور سلیٹ پر پچارا پھیر کر بولا "منشی جی! بڑی گنگا جی آگے اور چھوٹی گنگا جی پیچھے دے کر لکھ رہا ہوں" اور بھائی کنور بہادر کا شستہ کھوپڑی اور پھر پٹواری زادہ، اور جانتے تھے کہ پھنسے ہوئے ہیں کسی صورت خلاصی ممکن نہیں نہایت ایمانداری کے ساتھ فہرست بنائی سب سے اوپر اپنا نام تحریر کیا اور سب کے نام لکھنے کے بعد اخیر پر احمد جان اور وحید کے نام بھی گھسیٹ دیے اور اپنا قلم دان کھول کر تمام قلم منشی جی کے سامنے اس طرح پیش کر دیے جیسے کوئی ڈکیتی کا اقبالی ملزم اپنے اقبال کی تائید میں عدالت کے سامنے مالِ مسروقہ پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی بڑی ہمت کر کے بلکہ یوں کہئے کہ منشی جی کے سامنے کھل کر بولنے کا ریکارڈ توڑ کر بولا "صاحب حصہ سب نے لیا ہے لوٹ میں، وحید اور احمد جان بھی شریک تھے اور منشی جی! میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ یہ دونوں ڈبل حصہ مانگتے تھے اور جب ہم نے ڈبل حصہ نہیں دیا تو اینٹھ کر چلے گئے اور آج صبح ہی صبح ستی ستیا بن کر آپ کو رپورٹ گزار دی" اور ہم سب کو حیرت تھی کہ منشی جی کے سامنے اتنا لمبا جملہ بغیر ہکلائے بول کیسے گیا ——

"ہوں! اچھا یہ بھی شریک تھے مگر یہ ڈبل حصہ کیوں مانگتے تھے؟" منشی جی کی آواز ذرا اونچی تھی۔

"منشی جی لوٹ سب نے کی، کسی نے کم کسی نے زیادہ، پھر یہ کہتے تھے کہ ہم نے اور سبھوں سے زیادہ ٹماٹر سونتے تھے لہٰذا ہمیں ڈبل حصہ ملنا چاہیے اور منشی جی ہم سب نے یہ کہا کہ حصہ سب کا برابر کا ہونا چاہیے لہٰذا منشی جی یہ ایک ایک حصہ تو پہلے لے کر گھر رکھ آئے اور پھر دوسرا حصہ مانگنے پھر آئے بس اسی پر جھگڑا ہوا اور انھوں نے آپ تک بات پہنچائی۔"

"اچھا تم لوگوں سے ان کا جھگڑا ابھی ہوا تھا، کب؟" منشی جی نے پھر ذرا دھیمی آواز میں پوچھا۔

"منشی جی ابھی وقت عشاء کی نماز پڑھ کر امانت اللہ اور رحمی حجام نکلے ہیں اور وہاں منشی جی مسجد والے مولوی صاحب اس وقت یہ لڑ رہے تھے اور ان نمازیوں نے بیچ بچاؤ کرایا ہے یہ ان کے سامنے اپنا دوسرا حصہ مانگ رہے تھے اور جھگڑا ہو رہا تھا۔ اگر یہ لوگ مسجد سے نہ آجاتے تو منشی جی یہ ہم کو مارتے بھی۔"

"ہوں!" منشی جی نے کہا اور فرمایا "بس ابھی سب حال روشن ہوا جاتا ہے۔ یہ لوگ جھوٹ بولنے والے نہیں ہیں۔" اور ایک لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا "ذرا امانت اللہ اور رحمی حجام کو تو بلا لا ـــــ اور دیکھ مسجد میں مولوی صاحب ہوں تو ان کو بھی، چل جلدی۔"

اور ان لوگوں نے آکر کنور بہادر کے بیان کی اس حد تک تصدیق کر دی کہ رات ٹماٹروں کے کچھ حصہ بانٹ پر وحید احمد جان اور ان لوگوں میں جھگڑا ہو رہا تھا اور اس جھگڑے کو انھوں نے بچا دیا۔

اور اب معاملات گواہی شاہدی کی حدود سے گزر چکے تھے ادھر تمام مجرموں کے قلمدان مالِ مسروقہ سے یوں بھی پُر تھے اور وحید احمد جان پر اس وقت تو خیر جرم بھی ثابت ہو گیا تھا مگر منشی جی یوں بھی ایسے مرگِ انبوہ قسم کے ہنگامے میں اور کچھ نہیں تو کبھی آئندہ ہونے والے قصور کی سزا کے سلسلہ میں پیشگی ہی ٹھونکے بغیر چھوڑنے والے نہیں تھے اور پھر کنور بہادر جیسے اقبالی مخبر قسم کے مجرم کے بیان میں جنھوں نے سرِ محضر اپنا نام لکھ کر لوٹ کا مال بھی پیش کر دیا تھا شک و شبہ اور صفائی کی کسی کو کب گنجائش تھی۔ منشی جی کا فلسفۂ تعزیر سو تن سے لے کر میکالے تک ہر ایک سے زیادہ سخت اور نادر تھا۔ تعزیراتِ ہند بھی اقبالی مجرم کو جس کے ذریعہ انکشاف اور انصاف میں مدد ملے سرکاری گواہ بنا کر اور مخبر کے ضمن میں شمار کر کے معاف کرتی ہے مگر واہ رے منشی جی فیض اللہ اکٹھے دو درجے، تیسرا اور چوتھا، پورے پچاس طالب علم، مجرم تھے جن میں سے وحید اور احمد جان مخبر اور کنور بہادر اقبالی مجرم اور سرکاری گواہ بن کر بھی نہ چھوٹ سکے اور منشی جی نے حجام کے لڑکے جھٹوا کو پکارا ـــــ جو مدرسہ کا سب سے بڑا اور تگڑا لڑکا تھا اور ہمیشہ منشی جی کے جلّادانہ احکام میں مدد و معاون ہوا کرتا تھا۔ "اے جھٹوا! لا تو دس بارہ قمچیاں پتلی پتلی شیشم پر سے توڑ کر۔"

اور جھٹوا دو زقندوں میں سیڑھیاں چڑھ کر مدرسہ کی چھت پر پہنچ گیا اور چھت پر جھکی ہوئی شاخوں میں سے ایک موٹا گٹھا ہری ہری پتلی پتلی قمچیوں کی توڑ کر لے آیا اور بے غیرت باوجودیکہ خود مجرم تھا مگر مسکراتا ہوا چھت پر چڑھا اور مسکراتا ہوا ٹہنیاں لیے اترا قمچیاں آگئیں اور محضرنامہ منشی جی کے روبرو رکھا تھا۔ منشی جی نے اک ذرا سکوت کیا سفید گلٹ کی کمانی والی عینک چڑھائی اور ایک نظر محضرنامہ پر ڈالی ـ ہمارا دل امید و بیم کا مرکز تھا۔ کنور بہادر ہمارا پکا دوست تھا اور اس دوستی میں اس چیز کو بھی دخل تھا کہ میرے جدِ امجد پشتوں سے اس گاؤں کے زمیندار تھے اور کنور بہادر کی کئی پشتیں پٹواری چلی آرہی تھیں اور کنور بہادر اسی منصوبہ کے تحت پڑھ رہے تھے کہ اُردو مڈل پاس کر کے پٹوارگری کر سکیں اور باپ دادا کا بستہ سنبھالیں لہٰذا اس کے لیے انھوں نے میرے ساتھ رہنے میں ابھی سے

امتیاز برتنا شروع کر دیا تھا اور وہ دونوں کی سوچ کر ابھی سے اپنی پٹواری گری اور زمینداری کے دور کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے چنانچہ بغیرہی لوٹ میں عملی حصّہ لیے ٹانڈوں میں ہمارا حصّہ کنور بہادر ہی نے دلوایا تھا اور ہم کچھ مطمئن بھی تھے کہ نہ تو آگے والوں میں تھے نہ پیچھے والوں میں مگر ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ قلمدان اپنا بھی بے ایمان کی توند کی طرح بھرا ہوا تھا —— محضر نامہ کی خواندگی شروع ہوئی۔ پہلا نام "کنور بہادر"۔ منشی جی نے اپنی مخصوص نغیدو دینے والی غوں میں ادا کیا اور کنور بہادر ایسے فخر یہ اٹھ کر چلے جیسے تقسیم انعامات کے جلسے میں انعام لینے جا رہے ہیں۔ "ہاتھ کھول حرام خور"۔ منشی جی غرائے اور تین تین دونوں ہتھیلیوں پر اور پھر گردن جھکا کر کچھ بیٹھ کے اور منشی جی نے پوری درجن غرا غرا کر سونت دی۔ نام پکارے جاتے رہے اور منشی جی کو شروع میں شاید تو کچھ غصّہ سا بھی تھا اور دس بارہ لڑکوں کے بعد تو جیسے ایک معاشی مشغلہ کی طرح تڑاق پڑاق کرتے رہے اور ہر تین لڑکوں کے بعد نئی قمچی بدلتے رہے۔ کوئی رویا، کوئی تڑپا، بلبلایا، کسی نے گردن جھکانے میں منشی جی کے ہاتھ میں بل سے کھائے اور بے غیرت چھوٹا مسکراتا رہا۔ پچیس تیس لڑکوں کے بعد —— ہم نے خیال کیا کہ کنور بہادر واقعی ہمارا جگری دوست نکلا اور یک گونہ مطمئن سے ہو گئے —— اور ہم سب کسارانِ ساحل کی طرح رزم خیر و شر دیکھ رہے تھے اور تقریباً بالکل مطمئن ہو چکے تھے ——

منشی جی کے سیاہ ہونٹوں سے جیسے پرانی چال کی شاہی توپ کے دہانے والا دھواں نکلا اور جیسے گولا ہمارے سینہ پر پڑا اس نادر شاہی دربار میں ثبوت، صفائی، معافی کا تو گزر ہی نہ تھا اور نہ رکنے ٹھٹکنے کا سوال۔ "قہرِ درویش بر جانِ درویش"۔ اور بجا ماما تھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب محضر نامہ میں دو ایک نام ایسے کانوں میں آئے تھے جن غریبوں کو خبر بھی نہ تھی کہ ٹانڈر کی رہزنی کا کیا قصّہ ہے اور انھیں اس وقوعہ کا علم ابھی منشی جی کی باز پرس وغیرہ سے یہیں مدرسہ آ کر ہوا تھا —— اور جب ایسے ناکردہ گناہ بے چون و چرا اپنی سزا بھگت کر چلے آئے تو پھر ہمیں چون و چرا (زبان پر لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا، دل میں) کرنے کا کیا حق تھا۔ غارتگری کے مجرم نہ سہی داشتن مالِ مغرونہ کے مجرم تو تھے ہی، نام سنتے ہی ہاتھوں سے لبیک پکارتے بڑھے اور بارہ کے بارہ تین تین دونوں ہتھیلیوں والے اور چھیوں پیٹھ والے اپنا پورا حصّہ پا کر ہائے وائے کرتے آنسو پونچھتے سسکیاں بھرتے اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔

سلسلۂ دار و رسن جاری رہا یہاں تک کہ دونوں جانب سلیٹ پر لکھے ہوئے سب نام ختم ہو گئے اور منشی جی وحید اور احمد جان دونوں کے نام صاف چھوڑ گئے اگرچہ ہمیں منشی جی کی ذات سے ایسی امید نہ تھی اور ہم سب کو اپنی پٹائی میں اتنی تکلیف نہ پہنچی تھی جتنی ان دونوں کی رہائی سے ہو رہی تھی اور جب منشی جی نے سلیٹ ایک جانب رکھ دی اور گویا کام ختم کر دینے کا انداز بنایا تو وحید اور احمد جان سینہ پھلا پھلا کر اور گردنیں اٹھا اٹھا کر سب مجرموں کو دیکھنے لگے اور بار بار مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگے اور جس سے نگاہیں چار ہوتیں اس کا منہ چڑا دیا اور منشی جی نے چنگیزی آواز میں دوسرا حکم صادر کیا "سب اپنے اپنے قلم لاؤ"۔ اور یکدم ہر ایک نے منشی جی کے سامنے اپنا اپنا قلمدان جھاڑ دیا اور آنِ واحد میں منشی جی کے پاؤں کے پاس یہ بڑا ڈھیر نئے تراشے ہوئے پکّے پکّے قلموں کا لگ گیا اور منشی جی نے مٹھی بھر بھر کر قلم اٹھائے اور اپنا قلم تراش چاقو ہاتھ میں لے کر بغیر کھولے اس کے دستہ سے ہتھوڑے کا کام لے کر کچل کچل کر پھینکتے رہے اور آہستہ آہستہ غراتے رہے۔ جب اخیر پہ دس بارہ قلم رہ گئے تو وہ میز پر ذرا ترتیب کے ساتھ رکھ لیے اور بولے۔

"آؤ وحید اور احمد جان اپنا اپنا حصّہ لو تمھیں حصّہ نہیں ملا ہے" ——

اور جب وحید اور احمد جان خائف نگاہوں سے قلموں کو اور کنکھیوں سے منشی جی کے تیوروں کو دیکھتے ہوئے میز پر پہنچے

تو منشی جی نے فرمایا "انھیں تم کو خود ہی کچلنا ہے۔" اور دونوں کی کلائیاں اپنے ایک ہاتھ میں پکڑ لیں اور ایک ایک قلم اٹھا کر دونوں کی بائیں ہاتھ کی گائیوں میں دباتے رہے اور جب دونوں کی اُلٹے ہاتھ کی چاروں گائیاں چار چار قلموں سے بھر گئیں تو ایک کا پنجہ اپنے سیدھے ہاتھ میں اور دوسرے کا بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ دبانا شروع کیا۔ منشی جی کے فولادی ہاتھوں کا دباؤ گائیوں میں خوب پکے ہوئے ٹماٹر پھنسے ہوئے "ہائے اللہ، ہو ہو، ہائے اللہ، مرگیا مرگیا منشی جی!" دونوں کراہتے رہے اور منشی جی غرّاتے رہے: "اسے حرام خورو! لو حقہ لو۔" اور رفتہ رفتہ دباؤ بڑھاتے رہے، چیخیں تیز ہوتی گئیں چہرے سُرخ سے نیلے پڑ گئے مگر منشی جی کی گرفت اس وقت تک ڈھیلی نہ ہوئی جب تک قلم گائیوں کے اندر پچک کر برابر نہ ہو گئے اور جب قلم بالکل پچک گئے تو منشی جی کا دباؤ ڈھیلا پڑا اور گویا سزا پوری ہو گئی۔

یوں تو ہمارے منشی جی کے طرزِ تعلیم پر پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے مگر کچھ خصوصیات ہمیشہ یاد رہیں گی مثلاً وقت کا تخمینہ خصوصاً جب کچھ نالائق یا بد شوق قسم کے طلباء کو امتحان کی تاریخ کے بارے میں تنبیہہ فرماتے تو یوں کرتے: "اب وہ مہینہ تو امتحان کا ہی ہے وہ تو یوں گیا" (خواہ مارچ کی ۲۸ تاریخ سے امتحان شروع ہونے والا ہو) "اور یہ دسمبر سمجھو گیا ہی ہے" (خواہ دسمبر کی تیسری چوتھی تاریخ ہی کیوں نہ ہو) "جنوری اور فروری دو مہینہ بیچ میں، اسے حرام خور دو مہینہ، دو مہینہ، بس دو مہینے رہ گئے مردود! بے ایمان کھلاڑی، سوّر، نالائق، اُلّو، گدھے، دو مہینہ اور ایک حرف نہیں پڑھا نالائق، دو مہینے!" منشی جی کہتے جاتے اور مخاطب کی پیٹھ پر شیشم کی ہری قمچیوں کی بوچھار ایک سو بیس فی منٹ کی رفتار کی اوسط سے کرتے جاتے اور ضربات کی تیزی اور تندی منشی جی کی آواز کے زیر و بم کے ساتھ اس طرح اترتی چڑھتی رہتی جیسے خود ہی گانے اور خود ہی بجانے والا گویا گاتے وقت اپنی سارنگی اور اپنی آواز میں توازن رکھتا ہے۔

پان باوجود اپنا تاریخی اور روایتی حق ہونے کے کبھی "عید کے دن بھی" کھاتے ہوئے نہ دیکھے گئے البتہ حقّے کے بڑے رسیا تھے کسی وقت لگاتی منہ سے ہٹنے نہ دیتے تھے۔ تمام شاگردوں کے ذمہ دو ہی خدمتیں تھیں جن سے اسپیشل الاؤنس دینے والے زمینداروں کے بچے مستثنیٰ تھے، چلمیں بھرنا اور بکری کے چارہ کے لیے پتے لانا ـــ منشی جی کی وہ بکری جس کی بہ نانی کنور بہادر کے باپ منشی نند کنوار پٹواری چچا نے منشی نند کنوار کے زمانہ طالب علمی میں تین مہینے کی صورت میں دی تھی آج تک چل رہی تھی اور یہ پٹواری کا تحفہ یعنی ہاتھی کے منہ کا لیا ہوا گنا منشی جی کو ایسا سزاوار ہوا تھا کہ ہر سال اس کی نسل دو مرتبہ بیاہتی رہی اور کم و بیش آدھی درجن میمنے دیتی رہی جو منشی جی بیچ لیا کرتے اور ہر دوسرے سال اپنے لیے نئی بکری بدلتے رہا کرتے اور منشی جی کی یہ بکری بُزِ اخفش کی خالہ جو ہمارے زمانہ میں تھی اس پر ہماری نگاہیں ایسی پڑا کرتیں جیسی آج کل کسی محترم دوست کی اہلیہ پر اتفاقیہ پڑتی اور احتراماً جھک جاتی ہیں اور ہر طالب علم اس کے سامنے چارہ ڈالنا سعادت خیال کرتا۔

منشی جی کے زمانہ میں جبریہ تعلیم کا نفاذ بڑے بڑے ماہرین تعلیم کے دماغوں میں بھی نہ تھا لیکن عملی طور پر منشی جی کا اسکول جبریہ تعلیمی اسکول تھا۔ انھیں اپنے شاگردوں کو اسکول میں سو فی صدی حاضر رکھنے کا خبط تھا۔ نصف نصف درجن سینئر طلبا ایک ایک مفرور طالب علم کو پکڑ کر حاضر کرنے کی خاطر میل میل دو دو میل ادھر اُدھر دیہات میں گھوما کرتے اور صبح کے نکلے تیسرے پہر جنگلوں میں سے گرفتار کر کے لایا کرتے اور منشی جی غیر حاضری و مفروری کے باغیانہ جرم کی سزا میں پوری دو دو ہری قمچیاں پیٹھ کے اوپر دھوبیوں کی طرح

اڑا دیتے۔ تعلیمی معیار کا عالم یہ تھا کہ منشی جی کے دور کے چوتھی جماعت تک منشی جی کے پڑھاتے ہوئے جو طلباء انگریزی اسکولوں میں پڑھنے جاتے تو وہاں ان کا داخلہ تو ضابطہ کی رُو سے پانچویں جماعت میں ہوتا مگر ریاضی، زبان، تاریخ اور جغرافیہ میں ایک اچھے سیکنڈ ڈویژن اور فرسٹ ڈویژن ہائی اسکول پاس طالب علم کی استعداد لے کر جایا کرتے تھے اور جو منشی جی کے دور کے چوتھی جماعت پاس طلباء ہوتے تھے ان کی استعداد کا آج کے ہائی اسکول اور میٹرک پاس طلباء سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ وہ جو کچھ بھی تعلیم دیتے تھے اس کام کو "پڑھانا"، "محنت کرانا" نہیں کہا جا سکتا اسے "ریاض کرانا" کہتے ہیں۔ منشی جی کا شعور ہر وقت اپنے ہر طالب علم کے گرد گھومتا رہتا تھا۔

بچپن میں ہم کبھی کبھی منشی جی کے لامحدود اور بے پناہ اختیارات پر رشک کیا کرتے اور دل میں ایک معصوم آرزو اُبھرا کرتی کہ کاش ہم بھی بڑے ہو کر منشی جی فیض اللہ کی طرح مطلق العنان حاکم بن سکیں۔ خیر وہ وقت جب آیا تو ہم منشی جی فیض اللہ تو نہ بن سکے مگر ڈسٹرکٹ بورڈ کی جبریہ تعلیمی کمیٹی کے چیئرمین ضرور ہو گئے۔ یہ سنہ ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا اور ملک میں آزمائشی طور پر جگہ جگہ جبریہ تعلیمی اسکیم کا نفاذ کیا گیا تھا اور جب میں نئے دور کی جبریہ تعلیمی کمیٹی کی کرسیٔ صدارت پر بیٹھا اور اس اسکیم اور اس قانون کے عملی اثرات دیکھے تو بڑی ناامیدی ہوئی اور سنہ ۱۹۳۰ء لغایت سنہ ۱۹۴۷ء بلا انقطاع پانچ چھ مرتبہ جبریہ تعلیمی کمیٹی کا چیئرمین منتخب ہوا اور سولہ سترہ سال مسلسل ایک منشی جی فیض اللہ کی تلاش میں رہا، یہاں تک کہ تھک کر بیٹھ رہا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ جبریہ تعلیم کا مجسٹریٹ قسم کا چیئرمین شاید ضابطہ اور تعزیر کے زور سے جبریہ حاضری تو کرا سکتا ہے مگر "اصل جبریہ تعلیم" کے منشی جی فیض اللہ اپنے دور کے ساتھ گئے جن پر مشرقی مکتب کے طریقۂ تعلیم کے اثرات تھے، جنھوں نے صرف تعلیم ہی نہیں پائی تھی، نہ حاضری ہی دی تھی بلکہ ریاض کیا تھا اور ریاض کراتے تھے۔

دستار

کھیلنے اور بولنے کے لیے کہانی جسے ابوسعید قریشی نے لکھا

کہانی کے افراد:

سُوت کاتنے والی سیہ پوش عورتیں

دادی اماں :- (صرف آواز) کہانی کو سٹیج پر کھیلتے وقت اس کردار کا صرف ذکر ہی آئے گا!

دستار بردار	:-	تین گرگے
بابا	:-	بالی کا باپ
بیٹی	:-	بالی (سولہ سترہ کا سن، دیہاتی لڑکی)
دیہاتی	:-	بوڑھے، نوجوان، عورت، بچے
متولی	:-	عمر پچاس سے اوپر
پیش کار		

منظر

دیہاتی مکان کا آنگن جس پر ویرانی برستی ہے، دیواروں کا پلستر گرا ہوا — ٹنڈ منڈ شاخوں کا ایک درخت — مناسب جگہوں پر چند چرخے پڑے ہیں۔ عورتیں ایک ایک کر کے آتی ہیں اور اپنے کام میں لگ جاتی ہیں۔

سُوت کاتنے والی عورتوں کا نوحہ

سوت کا دھاگا

سوت کا دھاگا

ڈوٹنا چڑھتا دھگا
جیون چرخے کی گنجار
دن کے پیچھے کالی رات
رات کے آگے اندھا سورج
جیسے اٹی کی گرہیں ہوں
ایک کے پیچھے ایک

سانس کا تانا بانا
رونا
بیتی گھڑیوں
آج کا ماتم
آنے والی
کل کا نوحہ
دکھ کی لوگڑ
ڈھیروں ڈھیر
لٹتی لاج اور روتے نین
جیون بین
روگ بیوگ

(۱) (تحت اللفظ) کبھی دن رات یہی
یہی دن رات کبھی
جھولے امریوں کے تھے
گیت مدھر سکھیوں کے
آج جس وقت بھی دھیان آتا ہے ان لمحوں کا
ہر رگ و پے میں چھنک اٹھتے ہیں
جیسے گھنگرو!
جیسے بوندوں کی مدھر تال پہ
متوالی ہوا
۲ گیت گاتے رہے دوشیزہ تمناؤں کے
۴ مگر اک روز یہ ندیاں سوکھیں

بیلیں مرجھائیں
کنول نال میں خاک اڑنے لگی
اور امریوں کی ڈالیں ٹوٹیں
بول سکھیوں کے، ہجو کے بنے سرد آہوں کے!
زہر کے گھونٹ بنے گیت مدھر سکھیوں کے!
(تکلا چبھتا ہے ـــــ چیخ)

۱۔ ہائے اللہ! میرے اللہ! مری ـــ
۲۔ کیوں بہن
نوک تکلے کی ـــ؟ ارے
۱۔ نوک تکلے کی چبھی تیسری بار آج مجھے
۳۔ دیکھوں ذرا
۱۔ کیا دیکھو گی ـــــ خون؟
۴۔ اللہ اک بوند نہیں!
۱۔ بہہ گیا آنکھ سے آنسو بن کر
ریت کا رزق ہوا
اور یہاں
دل میں مرے
آگ املیوں کی دبی ہے گویا
آگ کا پیڑ اُگا ہو جیسے
زہر کی ٹیس
سراپا میں سلگتی ہوئی لہر اور آگ کے پھول
بس دہکتی ہوئی یادوں کا الاؤ
(دور سے مردانہ آواز سنائی دیتی ہے لیکن لفظ سمجھ میں نہیں آتے)
عارفِ عارفاں، رہبرِ سالکاں، محرمِ رازدارِ طریقت، حضرتِ ابوالشریعت کی دستار آتی ہے لوگو!
۱۔ کچھ سُنا؟
یہ آواز! (لمحی وقفہ جس میں سوت کاتنے والیاں گوش بر آواز ہیں)
۲۔ کان بجتے ہیں ترے

۱ - کان بجتے ہیں مرے !

جب بھی بجتے تھے مرے کان کہ جب پہلے پہل

نوک تنکے کی چبھی تھی مجھ کو !

اور اک بوند — لہو کی اک بوند

ریت کی کھا دبی تھی اک دن !

(پھر وہی دور کی بے معنی آواز) :

میں یہ سمجھی تھی یہ ہانکا شاید

بھیڑ بکری کے لیے

بھٹکے ہوئے ڈھوروں کی خاطر ہوگا !

میں وہ وحشی تو نہیں

میں نے کہا !

ڈھور ڈنگر تو نہیں !

نوک تنکے کی مگر سینے میں اتری ایسی

دل سے اک درد اٹھا

زندگی موت کا کھٹ راگ بنی

تم تو مگر جانتی ہو

تم بھی میری طرح وحشی ہو وہی

۲/۳ وحشی — تہِ دام !

۴/۵ ——— تہِ دام (ہانکے کی آواز)

۱ ——— وحشی ! (")

سب ——— وحشی !

۲ - ہمیں وحشی ہیں وہی جن کے لیے

بوڑھے صیاد کا بچا اک گلو گیر کمندیں لایا

۳ - جھنجھناتی ہوئی زنجیر کی ٹھنڈی کڑیاں

سانپ کا سایہ نہیں

ہر طرف رینگتا پھنکارتا ڈستا ہوا سانپ

ساری شریانوں میں بس گھولتا

شل کرتا ہوا زہری سانپ

ا۔ آج بھی یاد ہے وہ رات!

سب۔ وہ بارات کی رات؟

ا۔ ہاں! وہ بارات!

وہ آہوں کی، برستے ہوئے اشکوں کی

نرالی بارات

ہانکے جانے کی وہ پُر ہول گھڑی

اور وہ منڈھا؟

(منڈھا[1] ——— چار کہار

چار کہار

چار کہار

بیری بابل

بیری بھائی

جیتی میت کو کندھا دیویں

بیرن مائی

سکھی سہیلی ماں کی جائی

وہ روہی کے گھر جانا

بیری ہوا زمانہ

چار کہار

چار کہار

چار کہار)

ا۔ (تحت اللفظ) اور وہ دستار

کبھی جس کا مقدس سایہ سر پہ لوگوں کے تُنا کرتے تھے

سایۂ بالِ ہما تھا گویا

ڈھال آفات کی تھا اور کال کا توڑ!

---

[1] سٹیج پر کھیلتے وقت صرف منڈھے کی بازگشت سنائی دے گی، عورتیں چرخہ کاتنے میں محو نظر آئیں گی۔

دادی اماں سے سُنا تھا
اک شام
جب مؤذن کی صدا گونج چکی
اور مصلّے سے اٹھیں دادی اماں
اور ہم لڑکیاں بالیاں
لپکیں کہ سنیں
کسی درویش خدامست کا قصہ ان سے!
دادی اماں نے کہا

دادی اماں[1] :- لڑکیو! قصّے کا درویش وہ درویش نہ تھا
تخت اور تاج کو تج کر جو پھرا آوارہ
کسی شہزادی کی خاطر
یا کسی سبز پری کی خاطر
نہیں بچو
اس قلندر کی تو دستار تھی اک پرِ نو بالِ جبریل
اس کا فیضانِ طریقت تھا خدا کا احسان
اور کرم اس کا رہا شاہ و گدا سب کے لیے
بعدِ مُردن بھی رہا شاہ و گدا سب کے لیے
اسی درویش کی دستار کا یہ قصہ ہے
آج سے برسوں پہلے

مرد و زن کا ہجوم[2]
ایک گروہ :- یا رب رحیم! (آواز دو مرتبہ گونجتی ہوئی ویرانوں میں پھیل جاتی ہے)
ایک نوجوان :- اے خدا دیکھ یہ سُوکھی فصلیں!
مینہ کی بوندوں کو ترستے والے!
اور یہ جلتی دھرتی

---

[1] نوٹ :- ریڈیو پر دادی اماں کی آواز کی بازگشت ہوگی لیکن اسٹیج پر یہ قصہ آواز نمبر ا میں جاری رہے گا۔
[2] اسٹیج پر یہ قحط کا منظر ہوگا۔ سوکھے درخت، گِدھ، جانوروں کے ڈھانچے وغیرہ۔

آسماں جس پہ ہے یوں شعلہ فشاں
یہ مری بستی، ترے بندے، یہ بلکتے بچے
کال کی ماری ہوئی چپ مائیں (ہانپتے ہوئے)
جن کی آنکھیں گورکے گڑھے
جن کی باہیں موت کے پھندے
جن سینوں سے یہ چمٹی جونکیں
خون نہ ملنے پر ہیں بے حس
بے حس بے جان مردہ لاشیں
تیرے رب ہونے کی شاکی

بوڑھا :۔ (خوفزدہ) یوں نہ کہو
تم ــــ یوں نہ کہو

نوجوان : (طنز) کہ جو کہئے تو گلہ ہوتا ہے ؟ ــــ
اور شکوے سے وہ بے مہر خفا ہوتا ہے ! (وقفہ)
اچھا یوں ہی سہی !
تم جو کہتے ہو تو ایسا ہی سہی !
میں ــــ
میں مگر پوچھتا ہوں
اور بھی ہوگا عذاب سنگیں ؟

بوڑھا : آگ
سیلاب
وبا
جنگ بھی
اور اس سے سوا
محکومی (خوفزدہ ہجوم کا شور) !

نوجوان : سچ ہے ــــ بابا !
مگر اس بھوک سے سوکھی ہوئی شاخوں کی پکار
اپنے رازق کا اڑاتی ہے مذاق

شل کیے دیتی ہے یوں ہوش و حواس
جس طرح —
جیسے —
مگر —
میری زباں
پیاس سے
اکڑی آہ!
زبان کے کانٹے
اب مرے
دل میں اترتے ہیں
چلائیں[1] !!! (وحشت زدہ ہجوم کا شور)

بوڑھا : الامان والحفیظ!

سب : الامان والحفیظ!

بوڑھا : مرے بچو! (ہجوم آہستہ آہستہ یہ سننے کے لیے خاموش ہو جاتا ہے کہ بوڑھا کیا کہہ رہا ہے)
میرے بچو یہ عذاب
بھوک کی فصل سلگتے کھلیان
اپنے اعمال کا خمیازہ ہے
پھل کرموں کا
پھل کرموں کا (وحشت زدہ ہجوم کا شور)
یہ سمجھ کر کہ خدا کوئی نہیں
ہم خداوند بنے بیٹھے تھے
اَن داتا!
ہم نے ہمسایے کا حق چھین کے سمجھا کہ خدا کوئی نہیں
مال اوروں کا ہوا ہم پہ حلال
ہم!

---

[1] سٹیج پر نوجوان گرتا ہے اور مرجاتا ہے۔

ہم کہ اک سانس کی ڈوری کے سوا کچھ بھی نہیں
عیشِ امروز میں کل کو بھولے
کل کہ ٹل سکتی نہیں
آج وہ کل ہی مسلّط ہے
وہ کل یعنی، قیامت کی جھلک
اب بھی لازم ہے کہ ہم
توبہ کریں
اپنے اعمال سے افعال سے شرمائیں

سب مرد و زن : یہ سچ ہے بابا ——
دوسرا نوجوان (دست بدعا): اے مرے رب!
ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں ترے عاصی بندے
رحم کر ہم پہ کرم کر مولا!

بوڑھا : ٹھہرو!
ہم نے یہ سُنا ہے
کہ وسیلہ کوئی
اللہ والوں کا توسط بھی میسر ہو اگر
بات بگڑی ہوئی بن جاتی ہے

نوجوان : ہم گنہ گاروں میں یاں کون ہے اللہ والا؟

بوڑھا : بس وہی
جس کا مزار
اونچے ٹیلے پہ یہ کہتا ہے
میرا فیض —— ابھی تک بھی حجابوں میں ہے جاری ساری
اسی درویش کی دستار
سُنا ہے میں نے
سایۂ بالِ ہما تھا گویا
دکھ درد کی دوا تھی سپرِ آفات و بلا کی گویا
ہم پہ واجب ہے کہ پھر

اپنے بزرگوں کا طریق اپنائیں
اونچے ٹیلے سے بصد عجز و نیاز
اسی دستار کو پھر حجرے سے باہر لائیں!
کیا عجب ہے کہ خداوندِ کریم
ہم پہ پھر رحم کرے

(سٹیج پر کھیلتے وقت کچھ لوگ دستار لینے کے لیے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اعلان سنائی دیتا ہے، "قبلۂ حاجات صاحبِ فیض کی دستار"۔ دستار کا جلوس سٹیج پر نمودار ہوتا ہے۔ بادل کی گرج، بجلی کی چمک، مطلع ابر آلود ہو جاتا ہے اور پھر بلیک آؤٹ)

(جلوس کی آواز مختلف فاصلوں سے اعلان کی صورت میں سنائی دیتی ہے)

قبلۂ حاجات
صاحبِ فیض کی دستار!
قبلۂ حاجات
صاحبِ فیض کی دستار!
قبلۂ حاجات
صاحبِ فیض کی دستار!

دادی اماں[1] : اور پھر کالی گھٹا
جھوم کے اٹھی
برسی!
ننھی فصلوں نے کرامت دیکھی
دھان لہرائے
ترنجن گونجے
پیلی سرسوں کے دہکتے ہوئے گہنے پہنے
بالیاں گیہوں کی لہرائیں
جواں مٹیاریں
گجرے سلمے کے گئیں

---

[1] سٹیج پر کھیلتے وقت دادی اماں کے بجائے نوحہ گر نمبر ۱ اس بیان کو جاری رکھتی ہے

صاحبِ دستار کے گُن گاتی ہوئی!

مٹیاروں کا گیت (دھن شنکرا) :-

تیرو دربار بڑا

سانچی سرکار تری

نام ترا

تری دستار

دکھ ولدّر کی دوا

کال کا توڑ

یہی ردِّ بلا

تیرو دربار......

تیرے گنبد کی چمک

عرش والوں کی جھلک

تیری درگہ کے گدا

شاہ و گدا

تیرو دربار بڑا...... (بلیک آؤٹ)

سوت کاتنے والیاں : ...... ۱ —— مگر اب

دل دہلتا ہے جو دستار کا نام آتا ہے

بچیاں بالیاں

سن سن کے دبک جاتی ہیں

کہ وہ دستار آئی

۲ —— ٹھیک کہتی ہو بہن

وہی لوہا

کبھی ہل ہے

کبھی تلوار بھی ہے

ٹھیک ایسے ہی وہ دستار بھی ہے

ل سٹیج دھانی رنگ میں رنگ جاتی ہے اور گاؤں کی مٹیاریں ناچتی گاتی ہوئی آتی ہیں

کئی بد بختوں کی میت بن کر
اپنے ان گاموں کی گلیوں سے گزرتی ہے
گزرتی ہی چلی جاتی ہے
(دور سے گونجتی ہوئی آواز — عارفِ عارفاں...... کی دستار آتی ہے)

اللہ مرے
کس کے گھر جائے گی آج — یہ کالی آندھی! (دروازہ پیٹا جاتا ہے)

(تینوں دستار بردار ایک ساتھ): مبارک ہو!
مبارک ہو!
۱ — : خیر و برکت کا پیام آیا ہے
۲ — : اونچی ماڑی سے سلام آیا ہے
بابا — : کیسا پیغام؟
مبارک کیسی؟؟
تم کو کچھ بھول ہوئی ہے شاید
ہیں کہاں؟
اونچی ماڑی سے مجھے کیسا پیام آئے گا —؟
۱ — : اتنے بھولے نہ بنو
۲ — : دیکھو متولی کی دستار
جو ٹیلے سے کہاں آئی ہے
تو نے منت کبھی مانی ہو گی
اب وہ منظور ہوئی
تیری دعائیں ہوئیں مقبول، مبارک!
تیری بیٹی کا نصیبا جاگا
۱ — : اونچی ماڑی پہ دلہن بن کے وہ اب جائے گی
بابا — : مری بچی؟
۱ — : تری بیٹی بابا!

---

^ سٹیج تاریک ہو جاتی ہے — اور ایک دیہاتی مکان کے باہر دستار بردار ظاہر ہوتے ہیں۔ وقت شام۔ افق خون آلود ہے۔

بابا —: تم کو کچھ بھول ہوتی ہے شاید
میری بچی ابھی کم سن ہے
ابھی گڑیوں کے گھروندوں سے
فقط کھیلتے رہنے کا زمانہ اس کا
۳ —: محل ہی جائے گی اب
تری گڑیا بابا
بابا —: گڑیا مری
سولھواں سال لگا ہے اس کو
سر پہ چُنری کا بھی کچھ ہوش نہیں ہے اس کو
مری پگلی بچی
آم کے پیڑ پہ جھولا ڈالے
چیختی رہتی ہے کوہو کوہو!
ایسی مورکھ کبھی دیکھی نہ سُنی
آپ کو بھول ہوئی ہے بھائی!
یہ وہ لڑکی تو نہیں
اس کا تو سن ہی ابھی
۱ —: یہی تو سن ہے
یہی سن ہے بابا!
بابا —: چپ رہو!
۱ —: تم بُرا مان گئے؟
میرا مطلب ہے کہ یہ سن ہے
مرادوں کا مگر
غم نہ کرو —!
۲ —: یہ بھی اک بوجھ ہوا کرتا ہے
۳ —: بوجھ سا بوجھ کوئی!
۱ —: فرض ہے یہ
جیسے نماز

۱ ـــ : لوگ کہتے ہیں کہ جس
گھر میں جواں بیٹی ہو
آگ برسے گی وہاں حشر کے دن!
۲ ـــ : نہ ہوتی آج تری گھر والی
ورنہ اس موقعے کو یوں ہاتھ سے جانے دیتی!
اونچی ماڑی کے پیامی کی تواضع کرتی
سجدۂ شکر ادا کرتی کہ یہ دن آیا
میری بچی کا نصیبا جاگا
بابا ـــ : میری بیٹی کا نصیبا جاگا؟
۱ ـــ : تجھ پہ احساں ہے یہ
لطف و کرم!
بابا ـــ : یہ کرم ہے کہ ستم ہے مجھ پر
مجھ کو معلوم نہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ احسان فقط مجھ ہی پہ کیوں ہونا تھا
اس کرم کے لیے کیا میرا ہی گھر دیکھا تھا؟
میری بیٹی تو ابھی بچی ہے
اور وہ!
اور وہ جس کا پیام آیا ہے
۱ ـــ : آقا!
اونچے ٹیلے کا ہے وہ سجادہ نشیں
اور اس شہر کا والی بھی ہے، حاکم بھی ہے، مفتی بھی ہے
اور قاضی بھی
وہ سبھی کچھ ہے
بابا ـــ : سچ ہے ـ ٹھیک
مگر ـــ پر عمر ـــ
۲ ـــ : عمر کی قید سے آزاد ہے وہ
شیر کی عمر تو پنجوں میں ہے
بالوں میں نہیں

۱ ——: تم کو تو یاد ہی ہوگا شاید
ابھی اس قصے کو

بیس
پچیس برس
تیس ہی بیتے ہوں گے
عرس پہ
ایک سیاہ سانڈ
تڑا کر زنجیر ——
ایسا بھاگا تھا کہ اللہ کی پناہ!
کتنے جواں
اس نے سینگوں پہ اٹھا پھینکے تھے
اور وہ میدان ——
کہ جہاں
چھاؤنی چھائی تھی بس!
اتنے زائر کبھی دیکھے نہ سنے
اس میں محشر کا سماں تھا گویا
۲ ——: سانڈ کیا کوئی درندہ جیسے
گلے میں بھیڑوں کے گھس آیا ہو
شور ہٹ جاؤ! بچہ کی چیخیں
عورتیں بوڑھے جواں بھی کتنے
سانڈ کے پاؤں تلے روندے گئے
اک بگولا تھا کہ کالی آندھی
کسی منتر کسی جادو سے جو تھمتی ہی نہ تھی
ایسے میں ایک جواں
چیرتا بھیڑ کو یوں آگے بڑھا
جس طرح
چلے سے نکلا ہوا تیر

اور اس مردِ جواں سال نے آگے بڑھ کر
راستہ موذی کا یوں روک لیا
جیسے پہاڑ
چڑھتے پانی کو ہٹا دے پیچھے
اور پھر سانڈ کے سینگوں کو جکڑ کر اس نے
گتھ گیا اس سے کچھ اس طور
کہ حیوان و جوان
ایک ہوئے
اتنے میں نعرہ یہ گونجا
کہ "مدد —— صاحبِ فیضان مدد ہے!"
اور جواں مرد نے حیوان کو یوں زیر کیا
یوں مروڑا کہ نئی لاڈلی بیٹی جیسے
اپنی چنری کو چنٹ سے پہلے
کسی رسی کی طرح اس کو بٹا کرتی ہے!

اور پھر
دھم سے گرا سانڈ
وہیں ڈھیر ہوا

اور وہ مردِ جواں
جھاڑ کے اپنا تہمد
اونچے ٹیلے کی حویلی کی طرف
ایسے بڑھا
جیسے کوئی بات کوئی واقعہ گزرا ہی نہ تھا!
یہ وہی شخص ہے جس کی دستار
تری عزت کو حویلی سے یہاں آئی ہے

۲ —— : اور وہی مردِ جواں سال
وہی قبلۂ حاجات
وہی مخزنِ انوارِ صفت

صاحبِ فیض کا سجادہ نشیں

بابا ـــــ: صاحبِ فیض کا سجادہ نشیں!

اور جو انکار ہو تو؟

۳ ـــــ: ناممکن!

سر پھرا ایسا بھی ہوگا کوئی

ایسی عزت سے جو انکار کرے!

۱ ـــــ: دشمن جاں ہی کوئی

اپنی اور اپنوں کی جاں کا دشمن!

ایک تھا ایسا

کہ شیشم کے تلے

جس کا رہٹ چلتا تھا

یہ کنواں اس کے لیے

موت کا ہی چاہ بنا

اور دیوانے کا گھر

کھیت! وہ کھلیان

دھڑا دھڑ جل کے

ایک ہی رات میں بس

اس کے گھر تک کا نشاں بھی نہ رہا

اور جب صبح ہوئی

راکھ کے ڈھیر تھے ہر سمت

جو کہ انکار کی پاداش کے خود شاہد تھے

۲ ـــــ: سو یہ انکار کوئی

ایسا آسان نہیں ہے بھائی!

یوں بھی لازم ہے کہ جو نیک رواج

بابا ـــــ: نیک رواج؟

۳ ـــــ: وہ کہ مدت سے چلا آیا ہو!

اس کے خلاف

ایسی کوئی بات نہ ہو

ا ——: ایسا دستور ہے یہ جس پہ عمل کرنا ہے ایماں اپنا
دین و دنیا میں بھلائی کا یہی رستہ ہے

بابا——: یہی رستہ ہے ؟

ا ——: ہاں یہی ایک —— فقط ایک یہی رستہ ہے ۔

۲ ——: ویسے تم آپ سیانے ہو سمجھ سکتے ہو۔

۳ ——: صاحب فیض کے سجادہ نشیں سے رشتہ
بخشش و عیش و مدارات کا سرچشمہ ہے!

بابا——: ٹھیک کہتے ہو
مگر مجھ کو ذرا سوچنے دو

ا ——: اور سنو

بابا——: سوچتا ہوں
کہ اگر یوں نہ ہوا

اور
گر یوں نہ ہوا —— اور کیا ہوگا —— مگر.....

ا ——: یہ پہیلی نہ چلے گی بھائی

بابا——: کیا کہا؟

ا ——: ہاں یہ پہیلی
کہ اگر اور مگر

دوں —— اور یوں؟؟
مگر اس کا جواب
ہم سے کیا پوچھتے ہو؟

بابا——: میں تو بس اپنے سے
اپنے من سے
اپنی بچی کے مقدر کا پتہ پوچھ رہا تھا بھائی
اس کی تو ماں بھی نہیں

ا ——: تم جو ہو

۲ ——: خیر، ہٹاؤ بھی —— سنو
آج کی رات کی مہلت ہے تمھیں
اور کل صبح جواب

۳ ——: یعنی ایجاب و قبول

۱ ——: اچھا تو اب رخصت دو![1]

بابا ——: یعنی ایجاب و قبول
اور اگر یوں نہ ہوا —— تو —— پھر —— کیا؟
بوڑھے شیشم کے تلے
بیٹھا رہنا! زہر بنے گا اک دم
جلتے کھلیان
گڑھا
گور
سلگتی فصلیں ——
میرے اللہ بتا تو ہی بتا

بیٹی[2] ——: بابا

بابا ——: (سنبھلنے کی کوشش) آؤ بیٹا —— تم نہیں امّا یوں نہیں؟

بیٹی ——: بابا وہ ڈال تو اب ٹوٹ چلا ہے شاید!

بابا ——: ارے اللہ بچائے
میں تو ہر بار یہ کہتا ہوں یہ کچی شاخیں ——

بیٹی ——: تم تو بس ڈرتے ہو
ہر وقت مری فکر

بابا ——: میری بیٹی جو ہوئیں
گھر کا چراغ
آنکھوں کا نور

---

[1] سٹیج پر کھیلتے وقت تینوں دستار بردار چلے جاتے ہیں اور بوڑھا سوچتا رہ جاتا ہے
[2] سٹیج پر بوڑھے کی بیٹی مکان کے عقبی دروازے سے باہر آتی ہے۔

بیٹی —— : سچ بابا؟

بابا —— : مری بچی!

بیٹی —— : بابا اک بات کہوں؟

بابا —— : بیٹی کہو بھی —— کہہ دو!

بیٹی —— : مانو گے؟

بابا —— : ماننے والی ہے تو مانوں گا!

بیٹی —— : مگر وعدہ کرو

بابا —— : وعدہ کرنے میں تو کچھ عیب نہیں ہے بیٹی
وعدہ کر کے جو نباہا نہ گیا —— تو؟ بولو!

بیٹی —— : بس تو کچھ بات نہیں

بابا —— : روٹھ گئیں؟
اچھی من جاؤ نہ اب
اب کے دھانوں مری ننھی کے لیے
چاندسی بالیاں آئیں گی
چھماچھم کرتی
شہر لاہور کی سوغات حسیں!

بیٹی —— : (شوخی اور ضد سے) بس نہ بولوں گی
نہ بولوں گی
نہیں بولوں گی!

بابا —— : پگلی
جانے کب عقل اسے آئے گی
قد تو سرکنڈہ ہے لیکن بچپن
بچپنا سولھویں سال بھی باقی ہے
ابھی منتی ہے ابھی روٹھتی ہے
بول چاہتی کیا ہے آخر؟
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ قصہ کیا ہے؟

بیٹی —— : وعدہ —— پہلے!

صاحب دستار کا قول!!!

بابا ـــ: (چونک کر) کیا کہا؟

بیٹی ـــ: قول نہ دو

بابا ـــ: اچھا بابا

بیٹی ـــ: ضمانت ہونا

بابا ـــ: اف!

اب کہہ بھی چکو!

بیٹی ـــ: یہ لوگ ـــ

بابا ـــ: مگر کون سے لوگ؟

بیٹی ـــ: یہ جو آئے تھے ابھی

لفظ انکار سے ناواقف ہیں، وہی لوگ جو آئے تھے ابھی

بابا ـــ: (صدمہ اور حیرت) یہ تو کیا کہتی ہے بیٹی میری

تُو تو اندر ہی تھی، ہم کو بھلا کیا ان سے؟

بیٹی ـــ: ان کی باتیں لیکن

میں نے سن لی ہیں سبھی

بابا ـــ: تجھ کو کن سوئیوں کی عادت تو نہ تھی

بیٹی ـــ: بھول ہوتی ہے لیکن

میں یہیں تھی

اسی دروازے کے پٹ کے پیچھے

بابا ـــ: (صدمہ) یہ تو کیا کہتی ہے؟

بیٹی ـــ: ٹھیک کہتی ہوں بابا

بابا ـــ: یارب!

بیٹی ـــ: اور اس وقت سے لگتا ہے کہ بچپن میرا

کسی جھولے کی طرح

ڈال سے ٹوٹ گرا ہو جیسے

مجھ کو معلوم ہے اب اپنی جگہ

اب نہ ننھی ہوں نہ پگلی ہوں نہ جاہل

جو تھی

بابا ——: نادان!

بیٹی ——: ایسی ناداں بھی نہیں

اور وہ الجھن جسے حل کرنے کی مہلت ہے فقط آج کی رات

اس کا حل جانتی ہوں

یعنی —— قبول!

بابا ——: پاگل لڑکی!

تیرا مطلب ہے کہ اپنے ہاتھوں

تیرے ارمانوں، امیدوں کا گلا گھونٹ دوں میں!

اس سے پہلے مجھے موت آجائے

بیٹی ——: یہ کوئی حل نہ ہوا

بابا ——: پھر تو کیا چاہتی ہے؟

بیٹی ——: صاحبِ فیض کے سجادہ نشیں کی دستار!

بابا ——: اف یہ دستار

یہ انکار

یہ اقرار کا چکر —— توبہ!

میں گرا چاہتا ہوں

بیٹی ——: سنبھلو

بابا!

بابا ——: یاں سنبھلنے کی کسے مہلت ہے

وقت کے ہاتھ میں اندھی لاٹھی

اتنی فرصت کسے دیتی ہے کہ سنبھلے —— سوچے

شاید اس موڑ پہ

اب تک

وہ گھڑی جامد ہے

گور کی گود کھلی تھی جس دن

اور ساتھی مرے دکھ کی سکھ کی

سدھاری تھی یہ کہتی

"مری بچی
مری بچی ـــ دیکھو
اپنی بچی کو تجھے سونپتی ہوں
اس کے سب چاؤ!
تمنائیں مری
حسرتیں سب!"
مگر اب

ربِّ رحیم!
کس گنہ کی یہ سزا ہے
کہ وہ بچی
کئی بیٹوں کے برابر بیٹی
طاقِ پیری کا چراغ
اور مری بجھتی ہوئی آنکھ کا نور
ظلم کی کالی ہواؤں سے بجھا چاہتا ہے
کچھ سنا؟ (ہوا کا شور اور اس کے ساتھ سوت کاتنے والیوں کے نوحہ کی آواز آتی ہے)

بیٹی ـــ: تیز ہوا ہے بابا
بابا ـــ: نہیں پگلی
پھر سن (نوحے کی آواز اور بلند ہو جاتی ہے)
بین ہیں یہ
انہی بدبختوں کا نوحہ جن کو
اونچے ٹیلے کی حویلی میں ہوا لے جاتا
صاحبِ فیض کا سجادہ نشیں، مفتی و قاضی بھی ہے جس کا آئین
ایک ہی شب کی دلہن چاہتا ہے
یعنی دلہن
آج آئی ہے تو کل ـــ پھر میکے!
یہی دستور ہے اس کا کہ کوئی جبر کی ماری لڑکی

سادہ لوح لوگوں کی بھولی بچی
آستانے پر ہوس کی اس کے
اسی آئین کی صدا بھینٹ چڑھے!
کسی بدبخت کی کٹیا کا دیا
اس کے حجرے میں جلے
فقط رات کی رات
ریشِ پیری کا بنے اس کی خضاب!
مری بیٹی مری پیاری بچی!
کیا اسی دن کے لیے تجھ کو جواں ہونا تھا؟
دل پھٹا جاتا ہے جب اس کا خیال آتا ہے
جل بجھے کاش یہ کل کا سورج
کاش اس رات کی کل آئے ابد تک نہ کبھی
اور آئے تو اسے میں نہ کبھی دیکھ سکوں!

بیٹی ــــ: موت مانگے سے جو ملتی
تو یہ دنیا اب تک
مردہ روحوں کا بسیرا ہوتی!
ایسے میں صبر کرو
کون جانے مری تقدیر میں کیا لکھا ہے
یہ بھی ممکن ہے مقدر میں مرے
بین نہ یہ لکھے ہوں
اور اگر ہیں
تو کوئی تال
کوئی ساز
بدل سکتا نہیں ہے ان کو

بابا ــــ: مری بچی ــــ
مری بیٹی ــــ
میں نے سوچا تھا کہ دن آنے دو

جی کے ارمان نکالوں گا سبھی
مرنے والی کے وہ چاؤ سبھی پورے ہوں گے
مہندی ہاتھوں میں لگے گی تیرے
تیرے سکھیاں تری
تیرا منڈھا گائیں گی
جنتی ماں تری خوش ہوگی کہ میری بیٹی
اپنے گھر جاتی ہے آخر کو سہاگن بن کر!
سر خرونی کا مری اس طرح ساماں ہوگا!
اب مگر —
میرے اللہ یہ کیا سنتا ہوں —
اندھی تقدیر کے تیروں کے لیے
میرا ہی گھر باقی ہے؟
میرے گناہوں کی سزا
مجھ کو ملے
میری بچی کا تو کچھ دوش نہیں

بیٹی —: سنبھلو — بابا
رونے دھونے سے بھی ہونی کبھی ٹل سکتی ہے
رات اور دن کی یہ بہتی دھارا
کچھ تو لائے گی کنارے کے لیے
کہیں موتی
کہیں گھونگا
کہیں ٹوٹی پتوار
باپ پہ بیٹی نثار
زندگانی کا ہر پل چھن چھن
میرے ارمانوں کا ماتم ہے تو ماتم ہی سہی
میری امیدوں کا خوں ہو جائے
اس سے بہتر ہے کہ تم پہ کوئی آفت ٹوٹے

ساری بستی پہ بلا ہو نازل
گھر لٹیں کھیت جلیں
اور رہٹ کا قصّہ
پھر سے دہرائے کوئی

بابا —— : میری بیٹی
میری بیٹی !!
بوڑھے بزدل کی بہادر بچی [1]

(ہماہمی کی لہریں - نوبت کی آوازیں)

گاؤں کے لوگ : ۱ کچھ سُنا
۲ جیسے کہ نقارہ ہو —— نوبت
۳ اس وقت ؟
ابھی روزوں کو نو دن باقی ہیں
۱ روزے تو خیر یہاں روز ہی ہیں
رمضان ——
۴ کہیں ڈاکہ ہی پڑا ہو شاید
۱ کچھ عجب سنسنی ہے
۲ جیسے ہو بھونچال کوئی
۳ او نچے ٹیلے ہی پہ آنا تھا اسے ؟

(نوبت اور ہماہمی کی لہر)

۲ تو یہ ہے —— یہ آواز !
۴ شیر دم توڑ رہا ہو جیسے
اور جنگل کے چرند اور پرندے سارے
سوگ میں

---

[1] سٹیج پر افق ایک دم بھڑک کر سیاہ ہو جاتا ہے —— اور پھر بلیک آؤٹ —— اور پھر آہستہ آہستہ نیم تاریک شہر کا چوراہا نظر آتا ہے عقب میں ایک طرف درگاہ کا گنبد، سامنے کھلا میدان اور مسجد کی محراب —— موسم گرمیوں کا اور لوگ باہر ہی پڑے ہیں -

آقا کے سب
بیچ کریں
م۵: چلو چل کر دیکھیں
م۶: (افیونی) مردم آزار
کیسی نیند آئی تھی ——
کیا سپنا
جیسے دکھ دور ہوئے
کھیت اپنے ہیں، اناج اپنا ہے، راج اپنا ہے
کھائے پیچے کر لٹائے کوئی

م۱: واہ وا!
م۶ ———— : اور بھینسیں ہیں کہ بس
دودھ کے میٹھے تالاب
م۱: چنیا بیگم کی کرامت (قہقہے)
ورنہ
آدھی روٹی بھی جو مل جائے
غنیمت جانو
ایسے سپنوں سے بچو
آنکھوں کو سمجھاؤ
یہیں سیر کریں
ورنہ بینائی سے بھی جائیں گی
م۲ ———— : یہ مقدر کا لکھا ہے بھائی
کوئی بوئے کوئی سینچے تو کوئی عیش کرے
گارے چڑھنے میں پسینہ تو کسی کا ٹپکے
اور رنگ رلیاں منائے کوئی!
م۱: تو فلک سیر میاں
ایسے سپنے نہیں اچھے بھائی
م۶ ———— : اور سنو

یعنی سینوں پہ بھی پہرہ چوکی (نوبت)
جاؤ بھی
ہم نہ اٹھیں گے
بلا سے نوبت
چاہے دن رات بجے
اپنی ہی موت کا اعلان کرے ۔۔ کرتی رہے !

ک : (زور سے) مارے گئے
مارے گئے

م۱ : کچھ نہ سنا
ک : مارے گئے
قتل ہوئے

م۲ : کون ؟
م۳ : کہاں ؟
م۴ : کس صورت ؟
م۱، ۲، ۳، ۵ : کیسے ؟

ک : (ہانپتے ہوئے) درگہہ فیض کے ۔ صاحب ۔ سرکار !
صاحب فیض کے سجادہ نشیں

م۶ : قہر ہوا !
ظلم !

م۱ : مگر کیسے، بتاؤ بھائی ؟
م۲ : اور کہاں ؟
م۳ : کس وقت ؟
ک : حجرۂ خاص میں اپنے
کل رات
رات محفل تھی نا ـــــ آئی تھی کوئی
م۱ : قتل مگر کس نے کیا ؟
م۲ : کس طرح ؟

ع۳ : چاقو سے؟

ع۴ : خنجر سے؟

ع۵ : یہ تو معلوم نہیں ۔

ع۱ : کان تو دو ہیں

مگر بات آدھی ——

ع۵ : میں تو شب کھیت میں تھا

پانی کی باری تھی نا

ہاتھ منہ دھو کے یہی سوچ رہا تھا کہ چلوں

آج درگھہ پہ بھی ہوتا آؤں

اتنے کیا دیکھتا ہوں

کن کٹا اپنے محلّے کا وہ گنجا نائی!

چیختا آتا ہے سر پیٹتا روتا دھوتا

اس سے بس اتنا ہی معلوم ہوا

اور

سنتے ہی میں بھاگا

کہ چلوں

بستی میں خبر کروں

ع۱ : خیر

کچھ بات نہیں

ابھی معلوم ہوا جاتا ہے[1]

ع۲ : (انمی سے) کیوں میاں!

اب بھی دیکھو گے کہ بس

کوئی سپنا ——

ع۶ (انمی) : ہائے ہم لٹ گئے، مارے گئے، لوگو —— بھاگو!

پوری بستی پہ بلا آئے گی اب

---

[1] سٹیج پر سے اسی طرح چیختا ہوا چلا جاتا ہے جس طرح آیا تھا۔ لیکن دوسری طرف ۔

مارنے والوں کا انجام تو معلوم ہی ہے
ساتھ گیہوں کے مگر
گھن بھی تو پس جاتا ہے
ارے ——— کوئی بچاؤ!
۵ : آج کا سورج دیکھیں
کیسا دن لاتا ہے
۱ : یہ دعا مانگو
خدا خیر کرے
مرنے والے کا خلیفہ
یہ سُنا ہے ہم نے
ایسا سنکی ہے نہیں جس کا جواب
تند خو سخت مزاج
رنگ رلیاں ہیں نہ مجرا گانا
اس کی پیشانی پہ بل
ایسے نظر آتے ہیں
خشک کھیتوں سے ابھی
دھول اڑاتا ہوا ہل گزرا ہو
۲ : قتل یہ کس نے کیا؟
۳ : وجہ بھی معلوم نہیں [1]
کیہل میاں!
تم کو خبر ہو شاید
تم ابھی آئے ہو نا
ہم یہ کیا سنتے ہیں؟
اونچی ماڑی پہ کوئی قتل ہوا؟
۸ (نووارد) : قتل سا قتل ہوا ہے بھائی!

---

[1] سٹیج پر مجمع زیادہ ہو رہا ہے، ساتھ ساتھ روشنی بھی تیز ہو رہی ہے۔ دن نکل رہا ہے۔ نمبر ۳ ایک نووارد سے مخاطب ہوتا ہے

بوڑھے سجادہ نشیں کا نئی دلہن نے گلا گھونٹ دیا

۲ : نئی دلہن ——

۳ : وہی امرلیوں کی بالی؟

۵ : ہاں ہاں ——

ابھی دستار

تو پرسوں ہی وہاں آئی تھی

۱ : یہ تو تکیے سے اُڑی ہے شاید

وہ تو متولی کی پوتی سے بھی چھوٹی ہوگی

اس کی مہندی تلے اب تک شاید

پلنگ کے رستے کی سلوٹ کے نشاں باقی ہیں

وہ کہاں قتل کہاں؟

بوڑھے متولی کی گردن کے لیے

کسی مضبوط جواں مرد کا پنجہ ہوتا

پھر تو کچھ بات بھی تھی

بالی کے ہاتھ تو بس اتنے ہیں

اک نئی بیل کا پتہ جیسے

۴ : ہاتھ

نازک تھے کہ مضبوط؟

یہ تو متولی کی گردن ہی بتا سکتی ہے

۵ : اب تو بولے گی ضرور (سب قہقہے)

جس طرح

وقتِ سماع

سم پہ ہلا کرتی تھی

ناچنے والی کے بچھوے کی چھنا چھوم پہ سر دھنتی تھی

۲ : مرنے والے سے مذاق

چاہے دشمن ہو

مناسب نہیں ہوتا میاں

۵ : اُفوہ!
تم تو ناحق ہی بُرا مان گئے
موت برحق ہے
مجھے اور تمھیں
شاہ و گدا

پیر و مرید
سب کو مرنا ہے ــــ مگر
یہ فسانہ کہ گلا گھونٹ دیا دلہن نے
طوطا مینا کی کہانی ہی نظر آتی ہے
۸ : جھوٹ سچ
ابھی معلوم ہوا جاتا ہے
اور وہ لوگ
ابھی آتے ہوں گے
مرنے والے کا خلیفہ
نیا سجادہ نشیں

اور
سبھی حلقہ بگوش
۴ک : کیا کہا؟
چوکے ہیں؟
۸ : دربار!
عدالت!
انصاف!
سب یہیں ہوگا
۴ک : اماں جاؤ بھی!
بھنگ پی رکھی ہے کیا؟
ہم بھی ان گلیوں کے روڑے ہیں میاں
کون سی رسم یہاں کی ہمیں معلوم نہیں

کون سی بات چھپی ہے ہم سے ؟
ہو گی اب دھوپ کہاں، چھاؤں کہاں ؟
چاند کس مٹی سے ابھرے گا کہاں ڈوبے گا
کب گھٹا چھائے گی
برسے گی نہیں برسے گی !
آم پر بور کہاں آئے گا، کتنا ہو گا !
دانہ بھٹے میں پڑے گا کہ نہیں ؟ !
کب لحافوں میں ڈلیں گے ڈورے !
سرسوں کب پھولے گی —— آئے گی بسنت
پیلے گجروں سے، دوپٹوں سے، پتنگوں سے، امنگوں سے دھنک رنگ مچلتی ہوئی مہکی ہوئی رُت !
گیارھویں کب ہے تو کب عرس شریف !
کون سی بات یہاں کی ہمیں معلوم نہیں ؟
لو —— سنو ! چوک میں انصاف کا دستور تھا کب !
یہ کچہری کبھی دیکھی نہ سُنی
ہوش کی لو مرے بھائی —— سوچو !
۷ : ہاتھ کنگن کو یہاں آرسی کیا ہے (نوبت)
اُ°سے لو —— (ہماہمی)

کہو کچھ آیا نظر ؟
مچھلی کے بیتے تو نہیں پھاند آئے
وہ —— دیکھو
بوڑھی بھٹیاری کی بھٹی کے قریب
وہ جلوس
ابھی آنا ہے اِدھر
نقیب : (دور کی آواز) صاحبِ فیض کے سجادہ کے سجادہ نشیں —— سواری آتی ہے الوگو —— ہٹ جاؤ
۱۲ : وہ بھی کیا سالنہ ہی ہو گی ؟
۷ : دیکھیں !

○ گھوم کر ایک طرف دیکھتا ہے

ع۴ : جانے وہ کون ہے
باکی تو ہو نہیں سکتی
ع۱ : اور بھی بیسیوں ہی تھیں
جانے ان میں سے کوئی؟
ع۳ : یہ پہیلی بھی ابھی باقی ہے
نقیب : (ذرا قریب) صاحبِ فیض کے سجادہ نشیں کی سواری آئی ہے (ہماہمی) ※※
ع۴ : راستہ چھوڑ دو بھائی
اماں تم!
پیچھے ہٹ جاؤ بیاں
آج گھر والی نے روٹی نہیں دی ہے شاید (قہقہے)
ع۶ : ہُشش!
لو وہ آ پہنچے
ع۲ : وہ تو باکی ہی نظر آتی ہے
ع۱ : دیکھوں
کہاں؟
ع۶ : اماں وہ!
ع۴ : ہے تو باکی ہی خدا جھوٹ نہ بلوائے کبھی
وہی لٹ اُلجھی سی
اور گال پہ تل!
سُوہا چولا جو نہ ہوتا تو میں کہتا
شاید
ابھی امرئیوں سے آئی ہے جُھلا کر جھُولا
اب مگر اور ہی جھُجِلا کوئی

※※ سٹیج پر متولی کا جلوس داخل ہوتا ہے۔ متولی روایتی لباس میں ملبوس ہے۔ لوگ راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ متولی سامنے مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا ہے بائیں جانب ہجوم ہے اور اس کے پیچھے دور کھیت وغیرہ نظر آتے ہیں۔ باکی (بیٹی) متولی کے بائیں جانب کھڑی ہے، ساتھ باپ (بابا) ہے۔ ہجوم میں عورتیں بھی شامل ہیں باکی سرخ جوڑا پہنے ہوئے ہے۔

قسمت میں لکھا ہو شاید!

ع۳ : ساتھ بدبخت کا ہے باپ بھی

م۵ : سر نہوڑائے ہوئے

م۱ : اسے لو وہ بیٹھ گئے!

م۴ : پر نہ مسند ہے نہ تکیہ

یہ عدالت — تو سمجھ میں نہیں آئی اپنی

ع۶ : کیسا متولی ہے یہ

سر پھرا

خشک —

م۷ : ہش

اب وہ کچھ کہنے کو ہے (ہما ہمی ختم ہو جاتی ہے)

متولی — : لوگو! (مکمل خاموشی)

آج اک بارِ گراں آن پڑا ہے مجھ پہ

میں نے سوچا کہ اسے بانٹ دوں تم لوگوں میں

تم کہ اس بستی کے باشندے ہو — بھائی میرے

میرے دکھ سکھ کے شریک

ع۱ : (سرگوشی) اماں کیا سنتے ہو

"بھائی میرے!"

م۲ : پہلے متولی کی بولی تو مگر اور ہی تھی

"ابے او کتّے کمینو"

یہی نا؟

م۱ : ہم تو انساں بھی نہ تھے

بھائی کہاں!

م۴ : بھائی تو حضرتِ یوسفؑ کے بھی تھے۔ تم مگر دیکھتے رہنا بھائی

وہی بولی انھیں آجائے گی دھیرے دھیرے

آج تو پہلا ہی دن ہے ان کا

نشہ طاقت کا برا ہے بھائی!

۳ : ٹھیک کہتے ہو میاں
ڈھاک کے پات
وہی تین رہا کرتے ہیں!
پھر وہی ہوگا
وہی "کتے، کمینے، مردود!"
منولی ــــ : لوگو! (مکمل خاموشی)
آج اک قتل ہوا ہے (خوفزدہ ہجوم کا شور اُبھر کر ڈوب جائے)
اور تم ـــــ دونو کو۔
قاتل و مقتول، دونوں کو جانتے ہو (ہماہمی کی لہر)
ویسے تو قتل
نئی بات نہیں ہے شاید
یہ مگر قتل جدا ہے سب سے
اور قصوں سے الگ
اپنی مثال آپ ہے یہ
تم سمجھ دار ہو
اور جانتے ہو ـــــ اچھی طرح جانتے ہو
اس بات کو
اب جس کے طفیل ـــــ
ہم کو ـــــ
مجھ جیسے کو بھی
اوروں پہ فوقیت ہے ـــــ!
ہاں تو یہ علم کے انبار
یہ الفاظ کے جادو یہ طلسم!
سینکڑوں صدیوں کی دانش کے دفینے
دفتر
ان میں سب کچھ ہے
مگر کچھ بھی نہیں (ہماہمی)

ان کی مثال
ایسی ہے جیسے کہ اک بوند ہو دریا میں کہیں!
ننھی اک بوند
بہتے دریا میں کہیں (تحسین کی آوازیں)
دوستو!

عمر مری
ان کتب خانوں میں گزری ہے جہاں
علم کے مجھ کو ملے ہیں انبار
فلسفہ، دین و شریعت، یہ نجوم و حکمت
ادب و طب و ریاضی و کلام و تاریخ!
منطق و سیرت و اسمائے رجال

عرض کیا نا میں نے
میری پلکوں نے کئی سال کئی سال
گرد جھاڑی ہے کتب خانوں کی
مگر ایسی مثال

میری نظروں سے نہیں گزری ہے
ایسے میں آپ پہ لازم ہے مرا ہاتھ بٹائیں بھائی!
بستی بستی کے بزرگ اور سیانے آئیں
اور اس قتل کی تفصیل سے واقف ہو کر
اپنی رائے سے مجھے مطلع کر دیں —— مجھ کو ——

(سٹیج پر سفید ریش لوگ ہجوم سے اٹھ کر دائیں بائیں سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

متولی —— : پیش کار! مقدمے کی کارروائی شروع کی جائے۔ (نوبت)

پیش کار —— : پنچو! —— تم کو معلوم ہو کہ واقعات اس قتل کے روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ایک لڑکی، جو آس پاس کی بستیوں میں امڑیوں کی باکی کے نام سے مشہور ہے اور لڑکی اس بڈھے کی ہے جو کہ باپ باکی کا کہلاتا ہے، ملزم اس قتل کی ہے (ہماہمی) یہ لڑکی کل عارفِ عارفاں، صاحبِ فیض کے سجادہ نشیں، درگہہ دستار کے متولی، مفتی و قاضی، متولی البوالطریقت کے حرم میں داخل ہوئی اور عقد میں ان کے آئی۔ کل حویلی میں محفلِ سماع تھی۔ بعد محفل کے متولی البوالطریقت نے حجلۂ عروسی

میں قدم رنجہ فرمایا لیکن کنیزوں کو حضور سے رخصت ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ حجلۂ عروسی سے صدا اس قسم کی آئی جیسے کوئی مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ یہ آواز رہنمائے عاشقاں، عارفِ عارفاں درگہِ فیض کے متولی، صاحبِ دستار کے سجادہ نشیں حضرت ابوالطریقت کی تھی —— کنیزانِ خاص جانبِ دروازہ بڑھیں لیکن دروازے کو بند پا کر سوچنے لگیں کہ اب کیا کیا جائے مگر اس دوران میں مدد کو پکارنے والی آواز خاموش ہو گئی اور دروازہ کھلا اور دروازہ کھولنے والا جانتے ہو کون تھا؟

ہجوم —— : کون ؟

پیش کار —— : دلہن! امرتیوں کی باکی۔ یہی لڑکی جو اس وقت آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ اس وقت بھی وہ انہی کپڑوں میں ملبوس تھی۔ کنیزوں کو دیکھ کر یہ راستے سے ہٹ گئی۔ اس نے چھپر کھٹ کی طرف اشارہ کیا اور کنیزوں نے دیکھا کہ چھپر کھٹ کے اوپر ان کے حضرت ابوالطریقت مردہ پڑے ہیں —— مردہ! (ہجوم کا شور) ان کی آنکھیں ابلی پڑی ہیں۔ ان کے گلے میں پھندہ ہے —— انہی کی دستار (ہجوم کا شور) وہی دستار جو رواج کے مطابق ابھی اگلے ہی روز باکی کے باپ کے پاس متولی کا پیغام لے کر گئی تھی۔

(اسٹیج پر پیش کار بیٹھ جاتا ہے —— لوگوں کا ردِ عمل —— تاسف، خوف، وحشت)

متولی —— : یہ سچ ہے لڑکی؟

باکی —— : یہ اگر قتل ہے تو
میں نے کیا
میرے ہاتھوں سے ہوا
انہی ہاتھوں سے ہوا تھا یہ کام

متولی —— : مگر
اس کی سزا ——

باکی —— : موت بھی ہو سکتی ہے
یہی نا؟

متولی —— : چرب زباں!
تیرا سِن دیکھ کے رحم آتا ہے
ورنہ انجام ترا —— تیری سزا

از روئے قانون
یہی ہے ——موت!

بالی ——: میرا انعام ہے یہ!
متولی ——: گستاخ!
یوں نظر آتا ہے مینا جیسے
اپنے پنجرے میں سبق دہرائے
اس سن و سال میں ایسی باتیں؛
ہو نہ ہو باپ ترا
عمر بھر تجھ کو یہی ایک
یہی درس، سبق نفرت کا
تجھ کو سکھلاتا رہا ہے شاید
"تیری باتوں سے جلے گوشت کی بو آتی ہے"

بالی ——: یہ بُو!
بُو یہ اک باپ کے ارمانوں کی
اور میری جوانی کی
چتا کی بُو ہے
میری امیدوں امنگوں کی یہ لاش
اک ہوس کار کی بھٹی میں بھڑک اٹھی ہے
گلنے سڑنے کے بجائے
اس کی خلوت میں سُلگنے کے بجائے
جیتے جی گور میں گھٹنے کے بجائے
میں نے سوچا کہ فقط ایک ہی بار
ایک ہی بار میں جل جائے بھڑک اٹھے یہ لاش
باپ میرے کا تو کچھ دوش نہیں
اندھے دستور کا بدبخت غلام
بوڑھے متولی کی دستار کا دھاگہ
مجبور!

اس میں دستار کو لوٹانے کی ہمت ہی نہ تھی
اس کو دھمکانے ڈرانے کے لیے
راہ پہ لانے کے لیے
وہی قصہ ہی بہت تھا صاحب!

منتولی —: کون سا قصہ تھا وہ؟

بالی —: بوڑھے شیشم کے تلے میٹھے رہٹ کا چکر (ہماہمی)
یعنی انجام مرا
موت ہی تھا!
میں نے سوچا کہ سسکنے کے بجائے
ہاتھ ملنے کے بلکنے کے بجائے
خون رونے کے بجائے
کیوں نہ اک پل کی اذیت ہی گوارا کر لوں!
موت یوں زندگی بن کے بھی تو آسکتی ہے
میری عصمت کی محافظ
میرے ماں باپ کی عزت کی نگہبان بھی بن سکتی ہے!
میری ان بہنوں کی عفت کی نگہدار بھی ہو سکتی ہے!
جن کو دستار کے دستور کی اندھی لاٹھی
ہانک لے جائے کبھی —— آج یا کل!
اور اس کے سوا
کون جانے کہ ارادے ہیں مرے
اور کوئی ہاتھ بھی ہو
غیبی مدد
صاحبِ فیض کا الطاف و کرم بھی شاید
جن کی دستار کو اس طرح سے بدنام کیا جاتا تھا
اور یہ پاگل لڑکی
جس کو کل تک تو کوئی بات ہی معلوم نہ تھی
بن کے تقدیر کا آلہ ہی یہاں آئی ہو (ہماہمی)

صاحبو! ـــ آپ نے دیکھا ہوگا
بہتے پانی کی روانی جیسے
کبھی گرداب بھی بن جاتی ہے
ٹھیک ویسے ہی کبھی ظلم پلٹ جاتا ہے!
سانپ کی طرح پلٹتا ہے سپیرے ہی کو ڈس لیتا ہے
آج دستار کا اک پھیر بنا موت کا مہلک پھندا
اک سیاہ کار فریبی کے لیے
میں نے اک کام کیا ہے لوگو!
بھائیو ـــ بہنو ـــ بزرگو!
مجھے اس کا انعام
مل چکا عصمت و عفت کی عدالت سے
سزا کیسی مجھے تم دوگے!

متولی ـــ: لوگو! (ہماہمی بند ہو جاتی ہے)
تم نے دیکھا کہ یہ مجرم سنگیں
کتنا پرپیچ ہے
اور اس کی مثال
میری نظروں سے نہیں گزری ہے
کوئی فتوے
کوئی قصہ ہی بتاؤ
جو مجھے راہ دکھائے اس وقت!
خیر یہ مجرم سنگیں
آپ کے سامنے ہے
اور اب آپ کی رائے کیا ہے

ہجوم ـــ: معصوم!
معصوم!
معصوم!

متولی ـــ آپ کی رائے سے آگاہی ہوئی

میرا دل بھی یہی کہتا ہے کہ معصوم ہے یہ!　(ہمامی کی لہر)
میرا دل بھی یہی کہتا ہے
مگر رائے مری!
آپ کی رائے میں سمجھو کہ نہیں ہے شامل!
میں کہ مفتی بھی ہوں قاضی بھی
فقط میں ہی نہیں ہوں اس وقت!
اس گھڑی فرض مرا
میرے دل کی نہیں سننے دیتا
ورنہ اس بچی کی منطق ہے درست
اس کی اُلجھی ہوئی باتوں کا یہ سلجھاؤ مرے واسطے ہے باعثِ رشک
عقل کہتی ہے کہ
اس فعل کے پہلو ابھی کچھ اور بھی ہیں!
لفظ و معنی کے تعلق کی طرح
راہ و منزل کا تعلق بھی خردمندوں کا عقدہ ہی رہا ہے اب تک
وہ یہ کہتے ہیں کہ جائز ہے یا ناجائز ہے!
اچھے مقصد کے لیے
کام بُرا؟
اور اس فعل کا اب
دوسرا پہلو لیجئے!
از روئے اصلِ اصول و آئین
قتل اک قرضہ ہے
قاتل کے لیے! ——
یہی فتویٰ ہے مرا
آپ کے شہر کے قانونِ مروّج کا یہی فیصلہ ہے!
(تاریکی —— سپاٹ لائٹ بوڑھے پر پڑتی ہے)

بابا ——: مری بیٹی
سات بیٹوں کے برابر بیٹی

بوڑھے بزدل کی بہادر بیٹی

مری بیٹی

(وہی پہلا منظر۔ وقت رات۔ سوت کاتنے والیاں ایک ایک کر کے آتی ہیں)

سوت کاتنے والیاں: ۱: پھر وہی ہم ہیں وہی سانس کا تانا بانا

پھر وہی رات وہی اندھا دیا

۲: آج کی رات مگر

ایسے لگتا ہے نیا چاند کوئی

صاحب فیض کی دہلیز سے اٹھا ہے ابھی

کرتا ہوا جھک جھک کے سلام

اس دھندلکے میں کہیں

جانی پہچانی سی اک شکل بھی آتی ہے نظر

مسکراتی ہوئی گاتی ہوئی باغی لڑکی

وہ جواں مرگ

کسی گیت کا جھونکا ——— بانکی

۳: زندگی کھیل تھی بانکی کے لیے

موت بھی کھیل بنی

سُولی پر ایسے نظر آتا تھا

جیسے امرئیوں کے جھولے پہ ابھی

پینگ کے جھونٹوں پہ ہنستی گاتی

کالی کوئل کی طرح کوکتی ——— کُو ہو کُو ہو!

میگھ ملہار کی بوندوں کے ترانے کی طرح

بن کے بھادوں کی دھنک

کسی بدلی کے جزیرے میں چلی جائے گی

بانکی کی آواز (بازگشت): "جان پر کھیل کے جینا سیکھو

زندگی دے کے امر ہو جاؤ"

۱: اے جواں مرگ

ترے بول سدا یاد رہیں گے سب کو

تو نے سُولی سے پکارا تھا ہمیں
باکی کی آواز (بازگشت) "ظلم کی حد بھی ہوا کرتی ہے
ظلم سہنے کی بھی حد ہے کوئی"
۲: تم نے دیکھا ہے اگر ڈور پلاؤ
کتنی اونچی چلی جاتی ہے پتنگ
اور گر ڈھیل نہ دو
کھینچ لو
تب نیچے اُتر آئے گی
ویسے ہی ظلم کی ناؤ بھی ہے اک ہلکے تھپیڑے کے لیے صید زبوں
ناتواں لہر کوئی
اس کو ڈبو سکتی ہے
ظلم کے پاؤں نہیں! (موسیقی)
(سٹیج تاریک ہو جاتی ہے)

(پردہ)

ناشپاتی کے سفید شگوفے

اے حمید

میرے پلنگ کے قریب ہی تپائی رکھی ہے۔

تپائی پر زرد رنگ کا ایک گلدان ہے جو ناشپاتی کے سفید شگوفوں سے بھرا ہوا ہے۔ ناشپاتی کے یہ شگوفے میری ایک سہیلی دے گئی ہے۔ ان شگوفوں کے سفید سفید ترو تازہ چہروں کو دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ بہار کا موسم شروع ہو چکا ہے اور باغوں میں پھول کھل رہے ہیں اور گہرے نیلے آسمان کے نیچے پرسکون جھیلوں میں کنول کے شگوفے کھل اٹھے ہیں اور آم کے گہرے سایوں والے جھنڈوں میں کوئلیں کوکنے لگی ہیں۔ تپائی کے پیچھے کھڑکی کھلی ہے۔ جب ہوا کا جھونکا آتا ہے تو کھڑکی کے ہلکے نیلے پردے لہرانے لگتے ہیں اور مجھے ناشپاتی کے سفید شگوفوں کی بھینی بھینی مہک محسوس ہوتی ہے۔ میں اس ہسپتال کی دوسری منزل کے ایک خنک اور ویران سے کمرے میں اکیلی پلنگ پر پڑی رہتی ہوں۔ سرخ کمبل میرے نصف جسم کو ڈھانپے ہوتے ہے۔

میں اس وقت تمہیں یاد کر رہی ہوں لیکن تم مجھ سے ہزاروں، لاکھوں میل دور ہو اور میرے پاس ایک لمحے کے لیے بھی نہیں آسکتے۔ اگر تم کسی طرح چپکے سے میرے کمرے میں داخل ہو کر میرے پلنگ کے پاس آکر رک جاتے اور مجھ پر جھک کر اپنی محبت بھری آواز میں آہستہ سے کہتے۔

”کلثوم! تم بیمار کیوں ہو گئیں؟“

تو میں اپنی اداس پلکیں اٹھا کر تمہارا بھولا بھالا چہرہ دیکھتی اور میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ میں تمہارا گرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھیں بند کر لیتی اور تمہیں بتاتی کہ میں بیمار کیوں ہو گئی ہوں اور مجھے کون سا روگ اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ میں تمہیں بتاتی کہ میرے رخسار جو کبھی گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح شگفتہ ہوا کرتے تھے اب خزاں میں جھڑتے ہوئے زرد پتوں کی طرح کیوں مرجھا گئے۔ لیکن تم میرے پاس ہوتے ہوئے بھی مجھ سے اتنی دور ہو کہ میں اس جنم میں تمہیں پھر نہیں پا سکتی۔ محبت ویران جزیروں کے قریب سے ہو کر گزر جانے والی کشتی ہے جو ایک بار گزر کر پھر نہیں لوٹا کرتی۔ محبت وہ پردیسی مسافر ہے جو کسی طوفانی رات کو ہمارے گھر کے دروازے پر دستک دیتا ہے اور صبح ہونے سے پہلے چلا جاتا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ کیا بانسری سے بچھڑا ہوا نغمہ اب کبھی بانسری سے نہیں ملے گا؟ کیا پہاڑ کی بلندیوں سے اچھل کر باہر کو نکلی ہوئی شفاف پانی کی لہر اب کبھی اپنے چشمے کے ہونٹوں کو چومنے کے لیے واپس نہیں آئے گی؟

میں بیمار ہو کر اس ویران ہسپتال کے سرد کمرے میں پڑی ہوں۔ مجھے ایک ماہ سے کھانسی کے ساتھ بخار آرہا ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ میں بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی مگر میں جانتی ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا کیونکہ میرے جسم میں اب سوائے تمھاری یاد اور تم سے ایک بار ملنے کی تمنا کے اور کچھ نہیں رہا۔ میں اتنی کمزور ہو گئی ہوں کہ چاہوں بھی تو اٹھ کر دروازے تک نہیں جا سکتی۔ اگر تم کسی روز اچانک آجاؤ تو میں تمھارا خیر مقدم نہیں کر سکتی۔ کاش میں اتنی کمزور ہونے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی ہوتی۔

میری کتنی آرزو نہیں تھی کہ تمھارے ساتھ کسی سنسان اور گمنام جنگل میں ایک خوبصورت سی پھولوں کے درمیان گھری ہوئی، جھونپڑی میں زندگی بسر کرنے کے لیے چلی جاؤں، جہاں چاروں طرف جنگلی پھولوں کی جھاڑیاں خوشبو اڑا رہی ہوں اور رنگ برنگ تتلیاں ہماری جھونپڑی کے چکّر کاٹ رہی ہوں، جہاں ہر طرف روشنی، خوشبو، پھول، سکون اور شگفتگی ہو لیکن یہ حسرت میرے دل ہی میں رہ گئی۔ جب ہم وادیوں میں اکٹھے سیر کرنے نکلیں تو بادلوں کے سفید ٹکڑے ہمارے ساتھ ساتھ چلیں۔ جب ہم سیر سے واپس آئیں تو ہمارے کپڑوں سے انگور کے پتوں کی مہک آرہی ہو اور ہمارے ہونٹوں پر سبزہ زاروں کی تازگی ہو اور پھر جب برفانی رات کا گھرا اندھیرا آگے بڑھ کر ہماری جھونپڑی کو اپنی سرد آغوش میں سمیٹ لے اور یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں تو ہم اپنی جھونپڑی کا دروازہ بند کر کے اوپر ہرن کی کھال ڈال دیں اور آگ جلا کر بیٹھ جائیں اور جنوبی ملایا کے سمندروں سے آنے والی نیم گرم ہواؤں کا ذکر شروع کر دیں۔

اور جب جنگل میں شگفتہ دھوپ چمکنے لگے تو ہم جھونپڑی کا دروازہ کھول دیں اور بہار کی خوشبوؤں اور گرم سانسوں سے لبریز چھکیلی ہوا کو اپنے دمکتے ہوئے چہروں پر محسوس کریں اور ہرے بھرے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر سفید سفید بھیڑوں کو سنہری دھوپ میں اچھلتے کودتے دیکھیں اور ہمارے چہروں پر گہری، عمیق اور حقیقی مسرت کے پھول کھل اٹھیں۔

جب رات گہری ہو جائے اور اندھیرا چاروں طرف جنگل میں پھیل جائے اور الاؤ کی آگ بھی مدھم ہو جائے تو ہم وہیں پڑ کر سو جائیں۔ بچوں کی طرح سو جائیں ———— اور صبح جب مشرقی آسمان پر سورج کا دہکتا ہوا، چمکتا ہوا زریں تھال ابھر کر اوپر آئے تو ہم اس کی پہلی کرن کے ساتھ بیدار ہوں اور ہمارے سانس پھولوں کی مہک اور پاکیزہ جنگلوں کی طرف سے آنے والی صبح کی بے داغ ہوا کی خوشبوؤں سے لبریز ہو جائیں۔ ہم پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں محبت کرنے، پیار کرنے، ہنسنے مسکرانے، سیریں کرنے اور پھولوں کے منہ چومنے کے لیے زندگی سے بھرپور ایک اور دن عطا کیا ہے۔

اور جب وہ آخری لمحہ آئے جب ہر انسان اس دنیا سے سفر کرتا ہے تو ہم اس کا بھی ایک جشن منائیں۔ ہم اپنے اردگرد موم بتیاں روشن کریں۔ پھولوں کے ڈھیر لگا لیں، انگور کے پتوں کو سروں پر باندھ لیں۔ نرگس کی کلیوں کے گچھے گلے میں پہن لیں اور مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں اور اس خوبصورت دنیا سے یوں نکل جائیں جس طرح کوئی چڑیا جی بھر کر دانہ چگنے کے بعد کسی ہرے بھرے کھیت میں سے اڑ جاتی ہے۔

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ کل تک یہ خواہش زندہ اور شاداب تھی مگر آج اس پر ایک ایسے دردانگیز نغمے کا گمان ہو رہا ہے جو کسی ویران معبد کے شکستہ دروازے سے بلند ہو رہا ہو۔ مجھے تمھارے وہ وعدے آج بھی یاد ہیں جنھیں نباہنے کے لیے تم نے بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں مگر تم کوئی بھی وعدہ پورا نہ کر سکے۔ اس کے باوجود میں تمھیں یاد کیا کرتی ہوں اور تمھاری یاد ہی میری زندگی کا حقیقی شعلہ ہے۔ جس دن تم یاد نہ آئے اسی دن یہ شعلہ بجھ جائے گا۔

جب بھی مجھے گزرے ہوئے دنوں کا خیال آتا ہے تو میں یوں کانپ اٹھتی ہوں جیسے شعلے کی لَو میری پیشانی کو چھو گئی ہو۔ دل غم کی شدت سے تڑپ اٹھتا ہے۔ ایسا غم جو راتوں کو مجھے پہروں جگائے رکھتا ہے، جو خواب میں مجھے تمھاری ہی صورت دکھاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مرجھائے ہوئے پھولوں سے اداس خوشبو آ رہی ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں اکیلی ان جگہوں پر کبھی نہیں پھرا کروں گی جہاں کبھی ہم دونوں ساتھ مل کر ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلا کرتے تھے لیکن آج میں اپنا وعدہ پورا کر رہی ہوں اور تم وہاں اپنی نئی نویلی دلہن، اپنی بیوی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ان ہی راستوں پر سے گزرتے ہو اور تمھیں کبھی میرا خیال نہیں آیا۔ میری سہیلی نے مجھے آ کر بتایا تھا کہ سجاد اب تمھیں بالکل بھول چکا اور کبھی تمھارا ذکر تک نہیں کرتا۔ میں خاموش رہی تھی۔ میں نے یونہی مسکرا کر کہا تھا:۔

"مردوں کو بھول جانے کا حق ہے۔ مرد پیدا ہی بھول جانے کے لیے ہوئے ہیں۔"

مگر اپنی سہیلی کے چلے جانے کے بعد میں بہت روئی تھی۔ میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ سجاد! تم ساری دنیا کو بھول جاؤ مگر مجھے تم نے کیوں بھلا دیا؟ میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا؟ اگر تم میرے جیون ساتھی نہیں بن سکتے تھے تو کم از کم ہمیں ایک دوسرے کو یاد تو رکھ لینا چاہیے تھا۔ سجاد! کیا تم اس چشمے کو بھلا دو گے جس نے اس وقت تمھاری پیاس بجھائی تھی جب تم صحرا کی دھوپ میں جھلسے ہوئے اس کے کنارے پہنچے تھے؟ کیا تم جھونپڑی کے اس ٹمٹماتے ہوئے دیے کو فراموش کر دو گے جس نے اس وقت اپنی دھیمی روشنی کا ہاتھ بڑھا کر تمھیں راہ دکھائی تھی جب تم ویران جنگل کی اتھاہ تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے؟ اگر تم ماضی کے دریچے میں سے جھانک کر پیچھے دیکھو تو تمھیں محسوس ہوگا کہ تم ہر قدم پر کلثوم کے بازوؤں کا سہارا لے کر زندگی کے سفر پر چل رہے ہو۔ جب اس نے پہلی بار گلاب کے سُرخ شگوفوں کا تاج تمھارے سر پر رکھ کر تمھیں اپنا محبوب کہا تھا اور تم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی۔ جب تم نے کہا تھا:۔

"کلثوم! میں تم سے اور صرف تم سے پیار کرتا ہوں اور ہمیشہ پیار کرتا رہوں گا۔"

تم نے کہا تھا:۔

"کلثوم! اب اگر کوئی ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے ہاتھ میں سورج لے کر بھی سامنے آ جائے تو میں تمھاری محبت کا سودا نہیں کروں گا۔ تمھیں کبھی اپنے سے جدا نہیں کروں گا۔"

لیکن ایسا نہ ہوا سجاد!

بلکہ جب تمھارا سسر ایک ہاتھ میں اپنی جائیداد اور دوسرے ہاتھ میں اپنی بدصورت لڑکی کو لے کر سامنے آیا تو تم نے اس کی لڑکی سے شادی کر لی اور مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ تم نے دولت کی دکان پر اپنی انمول محبت کو پہلی ہی بولی پر فروخت کر دیا۔ سجاد! تم اتنے سستے داموں اسے فروخت کر دو گے مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اب تم دولت میں کھیل رہے ہو تمھارے پاس کار ہے، کوٹھی ہے، بنک میں تمھارے نام پر ہزاروں روپیہ جمع ہے۔ کیا ہوا اگر تمھارے پاس کلثوم نہیں۔ کلثوم کی

محبت نہیں اور ایک بدصورت بیوی ہے۔ تمہارے پاس کار ہے، دولت تو ہے، بنگلہ تو ہے۔ دنیا میں روپیہ پیسہ اور کار کوٹھی ہی سب کچھ ہے۔ اگر یہ ہو تو خوبصورت سے خوبصورت عورت خریدی جا سکتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بدصورت سے بدصورت عورت بھی پاس نہیں پھٹکتی۔ چنانچہ تم نے اپنی محبت بیچ دی، اپنی روح فروخت کر دی۔ تم نے مجھ سے ملنے کی بھی تکلیف گوارا نہ کی۔ تم نے اتنا بھی نہ کیا کہ کلثوم سے مل کر اسے تسلی کے دو بول ہی کہہ دیتے۔

تم نے چپکے سے شادی کر لی۔ اپنی بدصورت بیوی سے نہیں بلکہ اپنے سسر کی دولت، اس کی کار، کوٹھی اور کاروبار سے ——— ! مجھے اس حادثہ جانکاہ کی خبر ملی تو مجھ پر گویا بجلی گر پڑی میں پتھر کی طرح سُن ہو کر رہ گئی۔ مجھے اپنے کانوں سنی بات پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن جب میری سہیلی نے مجھے تمہاری شادی کا کارڈ دکھلایا تو میں سکتے میں آ گئی۔ یہ کارڈ گویا زہریلے سانپ کا اٹھا ہوا پھن تھا جس نے لپک کر مجھے ڈس لیا تھا اور میرا سارا جسم تمہارے غم سے، تمہاری ہمیشہ کی جدائی کے صدمے سے زہر آلود ہو کر نیلا پڑ گیا تھا۔ سجاد! میری زندگی کا شعلہ تو اسی روز ہی بجھ گیا تھا۔ اب تو صرف میں راکھ کا ڈھیر ہوں جس کی تہوں میں چند ایک چنگاریاں باقی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ راکھ میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ میری محبت اور دل کی شگفتگی دم توڑ چکی ہے۔ بیتے دنوں کے وعدے اور عہد و پیمان آج شاخوں سے ٹوٹ کر گرے ہوئے مُردہ پتّے بن کر رہ گئے ہیں جو خزاں کی ہواؤں کے ساتھ اڑتے پھر رہے ہیں۔

میری آنکھوں سے غم کا اندھیرا نکل کر چاروں طرف پھیل رہا ہے اور میری آنکھوں میں اس دنیا کو اور تاریک کر رہا ہے جس کی رعنائیاں میرے لیے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی ہیں۔ بھولی بسری یادیں ماضی کی گمنام رہگذاروں پر سے ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں اور پھر خود ہی خاموش ہو کر سر جھکا لیتی ہیں۔ ہوائیں، موسم کے جذبات، مانوس خوشبوئیں اپنے ساتھ یادوں کے پھول لا کر میرے سامنے بکھیر دیتی ہیں اور میں بازوؤں میں منہ چھپا کر رونے لگتی ہوں کیونکہ اب ان پھولوں میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں۔ یہ مرجھا کر سوکھ گئے ہیں اور انھیں کوئی بہار دوبارہ اپنی ٹہنیوں پر مسکراتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ زندہ رہنے کا ارمان کسے نہیں سجاد! انسان کو تو مرنے کے بعد بھی زندگی کی خواہش رہتی ہے مگر تمہاری محبت کا غم زنجیر بن کر میری زندگی کے پاؤں میں پڑ گیا ہے اور یہ مجھے زندگی کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھانے دیتا۔

میرے سنہرے خواب منتشر ہو گئے ہیں۔ دھوپ کی چمکتی ہوئی کرنیں اندھیرے کی لکیروں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ سورج کبھی نہ طلوع ہونے کے لیے غروب ہو گیا ہے۔ چاند سنگِ مرمر کا ٹکڑا بن کر آسمان سے ٹوٹ کر ویران صحراؤں میں گم پڑا ہے ستارے انجیروں کی طرح ٹوٹ کر فنا ہو چکے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں باہر بہار آئی ہوئی ہے۔ میرے پاس تپائی پر رکھے ہوئے ناشپاتی کے سفید شگوفے بھی مجھ سے یہی کہہ رہے ہیں۔ لیکن میں جانتی ہوں یہ بہار نہیں بلکہ خزاں نے بہار کا سفید کفن پہن رکھا ہے اور یہ سفید شگوفے نہیں ہیں بلکہ ناشپاتی کی ٹہنیوں پر چھٹکا ہوا کافور ہے۔

سجاد! میں تب سے اس ہسپتال میں اکیلی پڑی ہوں۔ تم پہلے میری محبت سے اور میری آرزوؤں سے کھیلا کرتے تھے۔ اب تم لاکھوں میں کھیل رہے ہو۔ کھیل تمھیں پسند ہیں اور تم ہمیشہ کھیلتے رہو گے۔ لیکن یاد رکھو اسی کھیل کے میدان میں ایک دن تم کھیلتے کھیلتے منہ کے بل گرو گے اور پھر تمہیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ ہو گا۔ پھر تمھیں ان باہوں کا خیال آئے گا

جو تمہاری ذرا سی لغزش پر تمہیں بڑھ کر سنبھال لیا کرتی تھیں۔ تمہاری آنکھیں بند ہوں گی۔ تمہارا جسم مفلوج ہو رہا ہوگا۔ تمہاری پیشانی پتھرا گئی ہوگی۔ تم ہاتھ بڑھا کر کسی کا ہاتھ نہ تھام سکو گے۔ تم بولنا چاہو گے، کسی کو پکارنا چاہو گے لیکن آواز تمہارے منجمد ہونٹوں پر آکر جم جائے گی۔

کاش! خدا تمہیں وہ تاریک دن کبھی نہ دکھلائے کیونکہ مجھ سے تمہارا یہ دکھ بھی نہ دیکھا جائے گا اور میں خواہش کے باوجود تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گی۔ اس لیے کہ میں اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہوں گی۔ تم اپنی تاریک منزل پر اس وقت پہنچو گے جب میرے دن کا سورج غروب ہو چکا ہو گا۔ میرے الاؤ کی آگ سرد پڑ چکی ہوگی۔ میری جھونپڑی کا چراغ بجھ کر ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔ تم اس وقت میری تلاش میں نکلو گے جب میں تمہیں کہیں بھی نہ مل سکوں گی۔ تم اس وقت مجھے آواز دو گے جب موت نے مجھ سے میری سماعت چھین لی ہوگی۔ پھر بھی میں جہاں بھی ہوں گی تمہاری آواز پر تڑپ اٹھوں گی۔ تمہاری مدد نہیں کر سکوں گی لیکن تمہاری مدد کرنے کے لیے بے چین ہو جاؤں گی۔

شام کے سایے آہستہ آہستہ میری کھلی کھڑکی میں سے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ باہر سورج غروب ہو رہا ہے۔ کھڑکی میں سے ڈوبتے سورج کی سُرخ روشنی گلدان میں پڑے ہوئے ناشپاتی کے سفید شگوفوں پر بڑی محبت سے بچھتی جا رہی ہے۔ شگوفوں کا سفید رنگ گلابی ہو گیا ہے۔ ان کے مقدس اور بے داغ چہرے غمگین ہو گئے ہیں۔ نرس نے ابھی ابھی آکر مجھے دوا پلائی ہے۔ یہ نرس بڑی ہمدرد اور شفیق ہے۔ مجھ سے بڑی محبت کرنے لگی ہے۔ اسے میرے دردِ دل کا علم نہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں گھریلو دکھوں کی وجہ سے بیمار ہو گئی ہوں۔ دل کے دکھوں کا حال ابھی تک اس پر نہیں کھلا اور خدا نہ کرے کہ کبھی اس پر کھلے —— ! تمہاری آواز، تمہاری پیاری پیاری باتیں پت جھڑ کے سانس کی طرح —— گرم اور خشک سانس کی طرح میرے ویران چہرے سے ساتھ لگ کر گزر رہی ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی جھڑے ہوئے خشک پتوں پر سے گزر کر مجھ سے ملنے چلا آ رہا ہے۔ یہ کون ہے؟ یہ کس کے قدموں کی چاپ ہے؟ یہ تم ہو سجاد؟ —— نہیں، کوئی نہیں۔

یہ بھولے بسرے دنوں کی سوگوار یادیں ہیں جو اپنے بوجھل قدم اٹھائے چپ چاپ ویران باغ میں سے گزر رہی ہیں، اور ہر قدم پر پلٹ کر مجھے دیکھ لیتی ہیں مگر اے سوگوار یادو! اب واپس پلٹ کر دیکھنے سے کیا ہوگا؟ زندگی کی بہار نے خزاں کی چوکھٹ پر اپنے سارے پھول ایک ایک کر کے رکھ دیے ہیں۔ زمین نے اپنی مانگ کا سیندور واپس کر دیا ہے۔ خوبصورت دلہنوں نے اپنے افشاں لگے چہروں کی چمک ستاروں کو واپس کر دی ہے۔ خزاں کی بے رحم آندھی نے بہار کے خیموں کی طنابیں کاٹ دی ہیں۔ ماضی کے سارے دریچے بند ہو گئے ہیں۔ تیز ہوائیں میرے خوابوں کے تمام رنگین پَر اڑا کر گمنام سمندروں کی طرف لے گئی ہیں۔ اب کبھی یہ ہوائیں لوٹ کر نہیں آئیں گی۔ پھر تم کس کی لگن میں کس کی امید میں پلٹ کر دیکھتی ہو؟

اے خوبصورت جنگلو! نازک پتیوں والے تناور درختوں سے کہہ دو کہ اپنے مشکبار ڈالیوں کو سمیٹ لیں۔ اب ان کی چھاؤں میں کوئی نہیں آئے گا۔ تاریک سنسان راتوں کو چنار کے درختوں پر اب سُرخ شگوفوں کے چراغ جلانے سے کچھ نہ ہوگا۔ نغمہ ریز چشمے چاندنی راتوں میں اپنے گیت بکھیرا کریں گے لیکن کوئی ان کی تال پر رقص کرنے نہیں آئے گا۔ ناشپاتی کے سفید شگوفوں نے اپنا نازک چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا ہے۔ کل شام تک یہ بھی مرجھا جائیں گے۔ یہ شگوفے پھل بننے سے پہلے

ہی مرجھا جائیں گے۔ یہ شعلے زندگی کی چتا سے اٹھنے سے پہلے ہی ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔ یہ گیت قدرت کے لب لعلیں سے نغمہ بن کر طلوع ہونے سے پہلے ہی ڈوب جائیں گے۔ رات ایک بھاری پتھر بن کر میرے سینے پہ اتر رہی ہے۔ آہستہ آہستہ میرے سارے جسم پر بچھتی جا رہی ہے۔ میں ایک، ناقابلِ برداشت بوجھ تلے دبی چلی جا رہی ہوں۔ کیا اس رات کا سورج کبھی نمودار ہوگا؟ کیا اتنی بوجھل، اتنی بھیانک رات کا سویرا ہوگا؟ کیا میں زندگی میں ایک بار صرف ایک بار ان وادیوں میں اپنی محبت کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر خوشبو کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ اڑ سکوں گی جن راہوں پر اب سوائے اندھیرے اور پت جھڑ کی ویرانیوں کے اور کچھ نہیں؛

میں روشنی کی تلاش میں اندھیروں میں بھٹک گئی ہوں۔ ناشپاتی کے سفید شگوفو! میرے ساتھ رہنا۔ میرے پاس رہنا ——!

ہوم میکرز

جوگندر پال

"سچ؟"

مسز وُڈ کے بے باک استفسار سے گھبرا کر میں اپنی ساڑھی کا پلو بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی پر لپیٹنے لگی۔

"ہاں!"

مسز وُڈ میری 'ہاں' سے بڑی متعجب نظر آنے لگی اور اس کی دوسری امریکی ساتھی مس ٹراورڈ تو شاید مجھے وکٹورین عہد کا کوئی عجوبہ سمجھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یعنی تم واقعی بارہ سال سے ایک ہی شوہر کے ساتھ نباہ کر رہی ہو؟"

"ہا ——ں!" میں اپنی جھجک سے سٹپٹا گئی، جیسے مجھے بارہ سال میں بارہ خاوند کرنے کے اعتراف سے ہچکچاہٹ ہو رہی ہو ——!

"اور تم اس سے بور نہیں ہوئی؟"

"نہیں!" مجھے اپنی قناعت پسندی پر ترس آنے لگا۔

"اور وہ بھی تم سے بہت خوش ہے؟"

"ہاں!" میری روہانسی آواز نے قہقہہ بلند کر کے میرا مذاق اڑایا تو میں چڑ گئی (راجے تقریباً ایک ہفتہ سے مجھ سے لڑا ہوا تھا اور ہماری بول چال بند تھی)

"ہاؤ سٹرینج!" مس ٹراورڈ نے اپنی چائے میں جن ملا کر بوتل بیگ میں رکھ دی۔

"سٹرینج اِن ڈیڈ!" مسز وُڈ سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر منہ سے دھوئیں کے چھلے نکالنے لگی۔

"لُوسی!" مس ٹراورڈ نے اس سے کہا۔ "تم دھوئیں کے مرغولے بناتی ہو تو مجھے بے اختیار مسٹر وُڈ کی یاد آجاتی ہے۔ وہ بھی ——"

"ہاں! وہ بڑے خوبصورت مرغولے بنایا کرتا تھا —— پُوئر مسٹر وُڈ! میں نے یہ عادت اسی سے سیکھی تھی۔" مسز وُڈ نے ان گنت مرغولے ہوا میں چھوڑ دیے جو بکھر بکھر کر گویا وُڈ مرحوم کے جسم کا کچا سا خاکہ بنانے لگے۔ "وُڈ میرا پانچواں خاوند

تھا مسز راٹے ! یعنی میں نے رسم و رواج کے مطابق صرف پانچ آدمیوں سے ہی شادی کی ہے۔ وڈ ان سب سے زیادہ دلچسپ تھا۔ مجھے اس کی موت پر بڑا افسوس ہوا مگر سچ پوچھو تو اس کے مرنے کے بعد میں آزاد ہو گئی۔ ہر شوہر سے نجات حاصل کر کے مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں آزاد ہو گئی ہوں۔" دھوئیں کے چھلوں نے مسز وڈ سے وڈ کی باتیں کہنا چاہا مگر اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر انھیں منتشر کر دیا۔

"اسی لیے مجھے شادی سے نفرت ہے۔" چالیس سالہ فربہ اندام مس لوہیا ابھی تک مسز لنکن کا کیک کھانے میں منہمک رہی تھی۔ "مسز لنکن کیک بہت مزے دار بناتی ہیں۔ تم بھی ذرا چکھ کے دیکھو مس ٹراورڈ۔"

"مس لوہیا!" مس ٹراورڈ نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہماری سوسائٹی میں غیر شادی شدہ عورت کو اپنی پسند کے مرد مہیا ہوتے ہی رہتے ہیں مگر انڈین کمیونٹی تو اس معاملے میں بڑی سخت ہے۔ پھر تمہارا گزارا کیسے ہوتا ہے؟"

"گزارا؟" مس لوہیا نے ذرا منہ موڑ کر چپکے سے اپنا پسندیدہ کیک کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا اور ہنس ہنس کر کہنے لگی "گزارا تو ہو ہی جاتا ہے مس ٹراورڈ۔"

مسز وڈ اپنا سگریٹ بجھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ "میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ مسز راٹے بارہ سال کی ازدواجی زندگی کے بعد بھی اپنے شوہر سے بور کیوں نہیں ہوتی۔"

"سبھی جانوروں میں صرف انسان ہی کی ذات ایسی ہے جس نے مرد اور عورت کے رشتہ کو طویل مدتوں کا پابند بنا رکھا ہے۔" مس لوہیا نے 'ہاؤ ٹو بی اے ماڈرن وومن' سے یہ فقرہ اپنی نوٹ بک میں درج کر رکھا تھا۔ "مسز وڈ یہ کیک ضرور چکھ کے دیکھو۔" اس نے ایک اور ٹکڑا اپنی زبان پر رکھ لیا اور سوچنے لگی کہ 'ہاؤ ٹو بی اے ماڈرن وومن' میں اس موضوع پر اس نے اور کیا پڑھا تھا۔ "مس ٹراورڈ! کیا تم نے 'ہاؤ ٹو بی اے ماڈرن وومن' پڑھی ہے؟"

"نہیں۔" مس ٹراورڈ نے جن اور جاٹے کا ایک کڑوا گھونٹ بھر کر منہ بنا لیا۔

مس لوہیا کو کتاب سے کوئی اور سطر یاد نہ آئیں تو اس نے بے چین ہو کر وہی فقرہ ہو بہو دہرا دیا۔ "سبھی جانوروں میں صرف انسان کی ذات ہی ایسی ہے جس نے مرد اور عورت کے رشتہ کو طویل مدتوں کا پابند بنا رکھا ہے۔"

"بنا رکھا تھا۔" مس ٹراورڈ نے مس لوہیا کو تصحیح کی۔ "ہم تو اپنی سوسائٹی میں جانوروں کی مانند یکسر آزاد ہیں۔"

"جنگلی جانوروں کی مانند یا پالتو جانوروں کی مانند؟" مس لوہیا نہ جانے کیا پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے سوال کا مدعا نہ سمجھ کر ذرا لو کھلا گئی اور مس ٹراورڈ سے کہنے لگی۔ "میرے کہنے پر ہی یہ کیک چکھ دیکھو۔"

"نو تھینکس۔"

"مس ٹراورڈ!" مس لوہیا اچانک اپنے سوال کا مقصد سمجھ کر اچھل پڑی۔ "میری ایک پالتو بلی ہے، بڑی پیاری اور پلی ہوئی۔" وہ اپنی پلی ہوئی بلی کی طرح خر خر کرتی ہوئی گویا تھی۔ "اکثر میری نظر بچا کر ادھر ادھر بلوں کے پاس بھاگ جاتی تھی اور جب وہ نہ جاتی تو بھانت بھانت کے خرنخوار بلے ہماری دیوار پھاند کر اندر گھس آتے۔ آخر میں تنگ آ کر پوسی کے لیے کہیں سے ایک بڑا طاقتور بلا خرید لائی۔ اب چند روز تو چین سے کٹ گئے مگر پھر وہی مصیبت شروع ہو گئی بلکہ ڈبل مصیبت۔ پہلے تو صرف پوسی

ہی کی پرابلم تھی، اب بلّا صاحب بھی آئے دن کوئی نہ کوئی نئی پوسی کہیں سے لے آتے — ہی ہہ ہی ہہ —" مس لوہیا ہنس ہنس کر مسز لنکن کے کیکوں کا ذائقہ بھی بھول گئی۔

"مجھے بلیوں سے بے حد نفرت ہے۔" مس لوہیا بھی مجھے خُرخُر کرتی ہنستی ہوتی بلّی سی معلوم ہونے لگی۔

"اور بلّوں سے بھی؟"

(میری آنکھوں میں راسے کے ماتھے کا شکن اُبھر آیا۔

"میں — میں تنگ آ گیا ہوں۔" گھر میں جب بھی ہماری لڑائی ہوئی ہوتی راسے بے سبب بڑبڑاتا رہتا۔

"میں خود تنگ آ گئی ہوں۔" ہمارا ننھا بنٹی کھلونے چھوڑ کر بڑی معصوم حیرت سے میری طرف تکنے لگا۔ "میں نے کیا بُرائی کی ہے؟ کیا بگاڑا ہے — ؟" میں نے بنٹی کو باہوں میں لے کر اس کے گال اپنے منہ پر رکھ لیے۔ "ہائے — اس کا پنڈا کیوں گرم ہے؟"

"کیا کہا؟" راسے نے جھٹ میری طرف منہ اٹھا لیا، بھول ہی گیا کہ ہماری بول چال بند ہے)

"کیا تمھیں بلّوں سے بھی نفرت ہے؟"

"نہیں، بلّوں سے تو نہیں۔" اور میں شرما گئی۔

"بڑی حیرت کی بات ہے۔" ٹرا ورڈ شاید سوچ رہی تھی کہ وہ اپنی چائے میں تھوڑی اور جن ملا لے تو کیا حرج ہے۔ "آخر ایشیائی عورتیں اپنے مردوں سے تنگ کیوں نہیں آتیں؟"

"مس ٹراورڈ!" میں گویا اپنے آپ کو سمجھانے لگی۔ "ہمارے شوہر ہمیں گھروں سے نکال بھی دیں تو ہم انھیں نہیں چھوڑتیں۔ بچے ہی جی ہیں ان سے کھیل کھیل کر اپنے بیاہ کے چاؤ پورے کر لیتی ہیں۔"

"وہ بری رومانٹک ان ڈیڈ!"

"ہندوستانی عورتوں کے لمبے لمبے سیاہ بال اور خوابناک خیالات بڑے رومانٹک ہوتے ہیں۔" مسز وُڈ نے ایک اور سگریٹ سُلگا لیا۔ "جب ہم واشنگٹن سے روانہ ہوئیں تو ہمیں کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ افریقہ کی بجائے ہم ہندوستان کا ٹور کریں۔" مسز وُڈ اور مس ٹراورڈ امریکی ٹورسٹس تھیں اور مسز لنکن نے ان ہی کے اعزاز میں اپنے گھر میں ہوم میکرز کی یہ میٹنگ بلائی تھی۔

"تم ہندوستان ضرور جاؤ مسز وُڈ!" مس لوہیا آرٹ پیپر پر شائع شدہ ٹورسٹ انفارمیشن بیورو کے کسی رنگدار پمفلٹ کی مانند بر آوازِ بلند گویا ہوئی۔ "ہمارا ہندوستان ایک فیری لینڈ ہے، ہردوار میں گنگا کے کنارے بڑی بڑی آنکھوں والی نوعمر جوگنیں ہری کے بھجن گاتی ہیں تو ٹورسٹ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود یہی سمجھتا ہے کہ بھگوان کے دوار پہ آ کھڑا ہوا ہے۔ ان کے گھنے بال ہوا میں لہرا لہرا کر —" مس لوہیا اٹک کر یاد کرنے لگی کہ ہینڈ بک آف ٹورسٹس میں یہ فقرہ کیسے لکھا ہوا تھا۔

"مجھے ہندوستان سے گہری دلچسپی ہے مسز راسے۔" مس ٹراورڈ نے اپنی انتہا سے بے چین ہو کر آخر اپنی بچی کھچی چائے میں مزید جن ملا ہی لی۔ "مجھے ہندوستان کے حالات ذرا کھول کر بتاؤ۔"

"میں وہاں سارا عرصہ ایک ہی شہر میں رہی۔" میں نے جھجک کر اپنے ملک سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "کبھی کبھار موقع ملتا تو

"دو ایک قصبوں میں رشتہ داروں کے ہاں گھوم آئی۔ میرے لیے تو سارا ہندوستان اپنے گھر یا محلے میں ہی سمٹا ہوا تھا۔"

"سچ؟" تم نے ایک بار بھی اپنے دیش کا ٹور نہیں کیا؟"

"نہیں۔ میری شادی ہوئی تو رائے مجھے یہاں لے آیا۔ اس وقت اپنے بحری سفر کے لیے بمبئی آتے ہوئے مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ ہمارا دیش اس قدر بڑا ہے۔"

"کیا یہ درست ہے۔" مسز وُوڈ نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے سگریٹ کا دھواں ہٹا کر پوچھا "کہ تمھارے ملک میں کئی لوگوں نے ابھی تک ریلوے ٹرین بھی نہیں دیکھی؟"

"پتہ نہیں۔" میں کسی ہندوستانی فلم کی گاؤں کی گوری سی بن گئی (رائے کو ہندوستانی فلمیں قطعاً ناپسند ہیں، پر میری خاطر اکثر انھیں دیکھنے چلا جاتا ہے۔ لیکن —— لیکن اگر وہ واقعی مجھے اتنا ہی چاہتا ہے تو مجھ سے لڑتا کیوں رہتا ہے؟) — "کیا پتہ؟"

"یو آر اے ویری سویٹ اینڈ سمپل گرل، مسز رائے!"

ہندوستان میں میرا سارا وقت گھر کے کام کاج میں ہی گزر جاتا تھا۔" میں سوچنے لگی کہ ان بوڑھی امریکی لڑکیوں سے مجھے یہ باتیں کھل کر نہیں کرنی چاہئیں۔ "اور بیاہ کے بعد میں ایک بار بھی وہاں نہیں گئی۔"

"شو ہڑلی ناٹ!" مس ٹراورڈ جن اور چاہتے ہیتی ہیتی رُک گئی۔ "تم سکول بھی نہیں جاتی تھیں؟"

"نہیں۔ میں نے گھر میں ہی تھوڑی ہندی سنسکرت پڑھ لی تھی۔ جب میں یہاں آئی تو مسٹر رائے نے میری انگریزی تعلیم کا انتظام کر دیا۔" (رائے نے میرے لیے کیا کیا نہیں کیا؟ باؤلا ہو کر میرے تلووں کی مہندی چاٹا کرتا تھا مگر اب تو ہر دم لڑنے کا بہانہ ڈھونڈتا رہتا ہے۔ میری ہر بات اسے زہر لگتی ہے۔ مجھے کہیں سے زہر مل جائے تو چھٹی ہو جائے۔ بچے اپنے آپ پل جائیں گے۔ بنٹی ذرا چھوٹا ہے پر جن بچوں کی مائیں انھیں جن کر ہی چل بستی ہیں، وہ بھی تو آخر پل ہی جاتے ہیں ——")

"کیا سوچ رہی ہو، مسز رائے؟"

"کچھ نہیں —— ہاں! یہاں آکر میں پانچ برس مسز لنکن سے انگریزی پڑھتی رہی۔"

"او —— ریلی؟"

"یس!"

"مسز لنکن ابھی تک کچن میں کیا کر رہی ہے؟" مسز وُوڈ نے اٹھ کر کچن میں جانا چاہا۔

"وہ سسٹر کُک کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔" مس لوہیا بھی شاید مسز لنکن کی شاگرد رہ چکی تھی۔ "ذرا صبر کرو، ابھی ہم سب کے لیے مٹن کٹلس لے کر آتی ہے۔"

"ہوم میکرز کی دوسری ممبر ابھی تک کیوں نہیں پہنچیں؟"

"مسز بیگ اور مسز چوہدری تو کہتی تھیں کہ وہ ضرور آئیں گی۔" مسز وُوڈ مسز لنکن کے توسط سے نیروبی کی کئی خواتین سے ملاقات کر چکی تھی۔

"مسز چوہدری کی تو میں گارنٹی دیتی ہوں کہ ضرور پہنچے گی۔" مس لوہیا مسز چوہدری کی بڑی دلدادہ تھی۔

"کینیا کی عورتیں وقت کی پابند کیوں نہیں؟ —— شاید گھر کے کام کاج میں بہت زیادہ مصروف رہتی ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔" مسز وُڈ نے مس ٹراورڈ سے کہا۔ "جب فرصت کی فراوانی ہو تو اوقات کی تمیز دشوار ہو جاتی ہے۔"

"ایشیائی عورتیں دراصل اپنی مالک خود آپ نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے شوہروں کی ملکیت ہوتی ہیں۔" مس لوہیا سوچ رہی تھی کہ کیک کا ایک اور ٹکڑا اٹھا لے یا مٹن کٹلس کے لیے پیٹ میں تھوڑی جگہ رہنے دے۔ "اس لحاظ سے میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتی ہوں۔ نہ ہو گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔"

"تمہارے ہندوستان کے اس کالے کالے گاڈ کا کیا نام ہے جو بانسری بجا کر دودھ بیچنے والی سندر بالاؤں کے دل چُرا لیا کرتا تھا؟"

"لارڈ کرشنا۔" مس لوہیا نے مس ٹراورڈ کو بتایا۔ "مگر تمھیں اس کا علم کیسے ہوا؟"

"پچھلے سال ایک ہندوستانی سکالر امریکہ میں لیکچر ٹُور پر آیا تھا۔ میرا ایک بوائے فرینڈ اس کا لیکچر سُننے کے لیے لے گیا۔ ہم نے اسے انگریزی بولتے سُنا تو حیران رہ گئے۔ میں تو یہ سوچ کر گئی تھی کہ وہ کوئی سپیرا یا جادوگر ہو گا مگر اس نے بڑے خوبصورت آکسفورڈ ایکسینٹ میں گاڈ کرشنا کے معاشقوں پر ایک نہایت دلچسپ تقریر کی۔ میں نے پہلی بار کسی ہندوستانی کو اتنی عمدہ انگلش بولتے سُنا تھا —— !"

"پنڈت نہرو بھی بڑی خوبصورت انگریزی بولتا ہے۔"

"ہاں!" مسز وڈ نے کہا۔ "میں نے اس کی ایک تقریر کا ریکارڈ سُنا تھا۔ وہ بھی بہت اچھا بولتا ہے مگر اس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"تمہارے اس کالے خدا —— کیا نام ہے اس کا —— لارڈ کرشنا نے اتنی عورتوں سے لَو کیا اور عورتیں بھی کھلم کھلا اپنے شوہروں کو چھوڑ چھوڑ کر اس کے سیاہ حُسن پر مرمٹیں۔ اگر تمہارا مذہب اتنا غیر روایتی ہے تو تم لوگ اس ماڈرن ٹائم میں بھی اتنے روایتی کیوں ہو؟ تم ——"

"کرشن کا پیار تو سپرچوئل تھا۔" مجھے یکلخت اپنی اداس خاموشی کا احساس ہوا تو میں نے ٹراورڈ کو ٹوکا۔

"سپرچوئل ——؟" ٹراورڈ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ڈونٹ بی بورنگ!"

"تمہارے گاڈ تو تمھارے مردوں سے زیادہ دلچسپ ہیں۔" مسز وُڈ نے اپنے لبوں سے سگریٹ ہٹا کر کہا۔ "پرائی عورتوں سے سپرچوئل لَو تو کرتے ہیں۔"

"ہم اپنے مردوں کو بھی اپنا گاڈ ہی سمجھتی ہیں۔" میں اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ کیا پتہ میرا راسٹے بھی اب پرائی عورتوں کے پیچھے بھاگنے لگا ہو، شاید اسی لیے اب مجھ سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے۔ میرے آنسو آنکھوں میں آنے کی بجائے حلق سے نیچے اُتر گئے —— !

وہ تینوں ہنس رہی تھیں۔

"مسز وڈ!" مس لوہیا کہنے لگی۔ "لارڈ کرشنا ہماری مذہبی تاریخ کا ایک نہایت بانکا فلاسفر ہے۔ تم اس کی گیتا ضرور

پڑھیو۔ گیتا میں اس نے لکھا ہے کہ ——" لیکن مس لوہیا نے نہ کبھی گیتا کا مطالعہ کیا تھا اور نہ کسی پنڈت سے کبھی اس کی کتھا سُنی تھی۔

"کہ ——" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

"کیا اس میں محبت پر بھی کوئی چیپٹر ہے؟"

"ہاں! لائف کا ہر سبجیکٹ اس میں موجود ہے۔" مس لوہیا نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ہیلو مسز ناڈوے!"

مسز وُوڈ نے افریقن منسٹر فار کامرس اینڈ ایجوکیشن کی بیوی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو اس کے استقبال کے لیے دروازے کی طرف جانے کے لیے اٹھی۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک بار مل چکی تھی۔

"ہیلو!"

"ہیلو!"

"ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

"ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

"بہت دیر کر دی مسز ناڈوے؟"

"ہاں! دیر ہی ہو گئی۔ ناڈوے ہمیشہ بزی رہتا ہے لیکن آج اس کے پاس کچھ فری ٹائم تھا" میں نے سوچا اچھی طرح فائدہ اٹھا لوں۔"

"مسز ناڈوے! تمھاری آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے آج تم نے کچھ زیادہ فائدہ ہی اٹھا لیا ہے۔" مسز وُوڈ کو اپنے ایک پسندیدہ امریکی حبشی موسیقار کا خیال آنے لگا جس کی مینڈولن سُن سُن کر اسے ہمیشہ یوں لگتا جیسے وہ بلیک سی پر چاندنی کا نظارہ کر رہی ہو۔

"ناٹی گرل! ——"

"وہ دیکھو مسز چودھری بھی آ پہنچی ہیں۔" مس لوہیا دروازے کی طرف دوڑی۔

"گڈ آفٹرنون مسز چودھری۔"

"واٹ از دا گڈ اباؤٹ دِس آفٹرنون؟"

ہیلو ہیلو کے بعد مسز چودھری نے اپنا فربہ وجود صوفے پر اس طرح گرا دیا جیسے کوئی مزدور بوجھ پھینک کر دم لیتا ہے۔

"بہت تھکی ہوئی نظر آتی ہو مسز چودھری؟"

"ہاں! آج میرا سارا دن بے حد مصروف رہا۔ صبح ایشین وِمن کی میٹنگ تھی، وہاں سے مس اتھاٹیڈ ایک ڈاگز شو پر لے گئی۔ میں نے لنچ بھی وہیں لیا، گھر لوٹی تو نہایت تھکی ہوئی تھی۔ مسٹر چودھری مجھ سے ہمدردی کرنے کی بجائے الٹا لڑائی پر اُتر آیا۔ اب یہاں آتے ہوئے بھی اس سے ٹوک جھونک کر کے آئی ہوں۔"

"واٹ اے شیم!" مسز وُوڈ کو بے چاری مسز چودھری سے بڑی ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ "دراصل تمھارے مرد تمھاری

پرابلمز کو بالکل نہیں سمجھتے۔"

"میں تو یہ نہیں سمجھ پائی" مس ٹراورڈ نے میری طرف دیکھ کر کہا "کہ تم اپنے مردوں سے بور کیوں نہیں ہوتیں۔"

"بور ـــــ ؟ میرا تو یہ حال ہے" مسز چوہدری آرام سے بیٹھی بیٹھی گویا پھر اپنے بوجھل بدن کو اٹھا کر تن گئی "کہ بوریڈم سے گلے میں پھندا ڈال لینے کو جی چاہتا ہے۔"

"ہیر! ہیر!" مس ٹراورڈ نے اٹھ کر مسز چوہدری سے ہاتھ ملایا "تم پہلی انڈین وومن ہو جسے میں عظیم سمجھتی ہوں۔"

مسز چوہدری کو اپنا پھولا پھولا ہوا بدن روئی کی گٹھڑی کی طرح ہلکا پھلکا معلوم ہونے لگا "میں اگلے ماہ کوسٹ جا رہی ہوں پورے چھ ماہ چوہدری کی شکل نہیں دیکھوں گی۔"

(مگر میں کہاں جاؤں؟ میرے ماں باپ یہاں ہوتے تو میکے ہی چلی جاتی۔ آدمی عورت آپس میں لڑتے ہی رہتے ہیں لیکن کوئی مرد ایسا تو نہیں ہوتا کہ اپنی عورت سے لگا تار کئی کئی دن کلام بھی نہ کرے)

"ارے بھئی مسز لٹکن کہاں چھپی بیٹھی ہے؟"

"مسٹر کچن میں ہمارے لیے مٹن کٹلس بنا رہی ہے" مس لوہیا نے اٹھ کر کہا "میں اسے لے کر آتی ہوں۔"

"ہاں! ہاں! لاؤ اسے، اور مٹن کٹلس بھی لے آؤ۔"

مسز ناڈوے اپنی جگہ سے اٹھ کر مسز وُوڈ کے پاس آ بیٹھی "میرا ایک کام کرو گی مسز وُوڈ؟"

"اگر تم مجھ سے پوچھتیں مسز ناڈوے" مس ٹراورڈ نے ہنس کر کہا "تو ایک کیا، میں تمہارے سارے کام بخوشی کر دیتی۔"

"سارے کام؟" مسز وُوڈ نے شوخ ہو کر پوچھا۔

"ہاں!"

"مسز ناڈوے کا وہ کام بھی جس کی بدولت ہم اسے مسز ناڈوے کہتے ہیں۔"

"نان سنس!" لیکن وہ سوچنے لگی کہ سال چھ ماہ کے لیے مسز ناڈوے بننے میں بھی کیا حرج ہے۔ جیسے اس کے ہونٹوں کے قریب کالے کالے رس بھرے انگور کے خوشے لٹکنے لگے ہوں۔ ہاں! اس میں حرج ہی کیا ہے؟ وہ مسز وُوڈ کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں لومی! وہ کام بھی!"

(ہائے رام! راتے اس دن سچ ہی کہتا تھا کہ یہ ہوم میکر نہیں، ہوم بریکر رہی ہیں۔ اپنی لاج کو یوں پیٹتی ہیں جیسے کوئی بدمزاج شرابی اپنی بیوی کو ـــــ پکیا راتے تو جھگڑا کر کے ہمیشہ چپ ہی سادھ لیتا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ پیٹ ہی لیا کرے۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے بایاں کندھا سہلانے لگی)

"پر پہلے مسز ناڈوے سے تو پوچھ لو۔" مسز وُوڈ مس ٹراورڈ سے کہہ رہی تھی۔

"مسز ناڈوے کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ ناڈوے کے عوض میں بیسیوں مرد اس کے سامنے لا کھڑے کر دوں گی۔ اگر وہ کہے تو اپنے پیارے ہیری کے نام آج ہی واشنگٹن چٹھی لکھ بھیجوں۔"

"میں تو واشنگٹن جانے کے لیے ترس رہی ہوں" مسز ناڈوے کا لہجہ ملتجیانہ ہو گیا "مسز وُوڈ سے میں اپنے اسی کام کا ذکر

کرنے لگی تھی۔ پچھلے ہفتے ایک افریقی عورت کو کلچرل سکالرشپ پر امریکہ بھیجنے کا اعلان ہوا تھا۔ میں چاہتی ہوں اس سکالرشپ کے لیے میرا ہی انتخاب ہو۔"

"یہ کام تو بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔" مس ٹراورڈ اور مسز وڈ امریکی قونصل کے ہاں قیام پذیر تھیں۔ "اپنے ناڈوے سے کہو ایک بار امریکی قونصل سے مل آئے۔"

"نہیں مس ٹراورڈ، یہ کام میں خود کرنا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ناڈوے کو علم بھی نہ ہو اور مجھے سکالرشپ مل جائے۔"

"کام تو تمہارا ہو جائے گا پر بے چارے کو بتا تو دو۔"

"بے چارہ! تم اسے بے چارہ کہتی ہو؟ بے چاری تو میں ہوں ___" مسز ناڈوے دفعتاً ترش مرچ سی بن گئی۔ "مجھے میری ضروریات کی قطعاً فکر نہیں، بس سارا سارا دن سرکاری فائلوں پر جھکا رہتا ہے۔ اس کی منسٹری تو میری سوت بن گئی ہے ___"

"پور تھنگ!" مسز وُوڈ کو مسز ناڈوے کی بے چارگی پر ترس آنے لگا۔ "منسٹر سے شادی کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ کسی سکول ماسٹر کو ہی اپنا شوہر بنا لیا جائے۔" سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے مسز وُوڈ کو اس کے تیسرے شوہر کی ایک مبہم سی جھلک دے کر فضا میں مدغم ہو گئے۔ "میرا تیسرا شوہر ایک سکول ماسٹر تھا، بڑا بور تھا، پر میرا بڑا چاؤ کیا کرتا تھا۔"

"مسز وُوڈ۔" مسز چوہدری گویا ذہنی طور پر چوہدری سے ہاتھا پائی کرنے لگی ہو۔ "مسز ناڈوے کا یہ کام ضرور ہونا چاہئے۔ اگر مرد ہمارے لیے فرصت نہیں نکال سکتے تو ہمیں بھی ان سے لاتعلق ہونے کا حق حاصل ہے۔"

(تیرے منہ میں خاک! میرا دل بیٹھ گیا۔ ماتو میں نے دو دھ اند ٹب میں پڑنہ اگنی کا الٹی چوتھا پھیرا ہی پورا کیا ہو کہ اس نوج نے میری سہاگ کی گانٹھ کھول دی ہو۔ میں تو مر کر بھی اپنے راجے سے لاتعلق نہ ہوں گی۔ مرد عورت کا تعلق تو ہمیشہ بنا رہتا ہے، ابھی جوڑے سے تو سب ناطوں کی روپ ریکھا بنتی ہے، جیسے میرے بنٹی میں میں بھی ہوں اور راجے بھی ___ پر ___ پر وہ مجھ سے روٹھتا کیوں ہے؟ میں آج خود ہی ہاتھ جوڑ کر اسے منالوں گی۔ کتنا سوکھا سوکھا نظر آنے لگے تو ماسے اور گھرا کھو دلینا چاہیے)

"ہیر! ہیر!" مس ٹراورڈ تالیاں بجا رہی تھی۔ "مسز چوہدری! یو آر اے گریٹ وومن!"

"مسز وُوڈ! کسی طرح مجھے یہ سکالرشپ لے دو۔"

"مسز ناڈوے پہلی افریقی عورت ہے۔" مسز چوہدری بتانے لگی "جس نے آکسفورڈ سے انگلش آنرز کیا تھا۔"

"بیوٹی!" مسز وُوڈ نے مسز ناڈوے کی تعریف کی تو ناڈوے کا خوبصورت کالا چہرہ چمک چمک کر بجھتا معلوم ہونے لگا۔ "تم انگلینڈ کب گئی تھیں؟"

"۱۹۴۲ء میں۔" مسز ناڈوے نے اپنا پاؤں ہلا ہلا کر جواب دیا۔ "مجھے سفر کرنے کا بے حد شوق ہے۔ بڑی تمنا ہے کہ ایک بار ساری دنیا کا چکر کاٹوں مگر یہ ناڈوے کسی کام کا آدمی نہیں۔ سب خواہشات کا خون کر کے رکھ دیا ہے۔"

"تم تو ہم امریکی عورتوں کی مانند ہی روشن دماغ ہو مسز ناڈوے!" مس ٹراورڈ نے کہا۔ "مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری قوم کی دوسری عورتیں اتنی جاہل کیوں ہیں؟" مس ٹراورڈ اپنی وجن اور رچا ئے، کی چسکی بھر کر گویا سچ مچ اس گمبھیر مسئلے پر غور کرنے لگی۔

"میرا باپ ہمارے قبیلے کا چیف تھا مس ٹراورڈ! اور انگریزی تعلیم پر جان چھڑکتا تھا۔"

"تمہارے قبیلے کی چند دوسری عورتیں بھی تم جیسی ہوں گی ؟"

"نہیں، وہ سب جاہل ہیں ۔ کیا کیا جائے ؟ گھروں سے تو نکلتی نہیں ہیں ۔"

"تم انھیں باہر کیوں نہیں نکالتیں ؟"

"یعنی مسز ناڈوے انھیں بے گھر کر دے ؟" میں نے اپنی خاموشی توڑی تو مسز وُڈ میری طرف دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور میں نے خفا ہو کر مس لوہیا کی طرح کیک سے منہ بھر لیا ۔

"پور چائلڈ ! پور سویٹ چائلڈ !"

تیز تیز کیک کو حلق سے اتارتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ میں غصے میں مسز وُڈ کو نگل رہی ہوں ۔

کسی نے بھی میری بات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا ۔

"ہماری ایشیائی قوم میں بھی کئی عورتیں ابھی جاہل ہیں ۔" مسز چوہدری نے گویا میرے متعلق ہی انھیں بتایا ہو ۔

"واٹ ڈُو یو مین ؟" میں نے مسز لنکن کے مخصوص برٹش لب و لہجہ میں مسز چوہدری سے جواب طلب کیا ۔

"ارے بھئی مسز چوہدری نے کوئی بُری بات تو نہیں کہی ۔" مسز ناڈوے نے موقع کی تلخی کو دبانا چاہا ۔ "جاہل عورتیں تو ہر قوم میں ہوتی ہیں ۔"

"نہیں، ہماری عورتیں جاہل نہیں ہوتیں ۔" مسز وُڈ نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ۔

"آپ لوگوں کی اور بات ہے ـــ میں ـــ"

لیکن میں نے جلدی جلدی کسی ہندی پمفلٹ کا انگریزی ترجمہ کر کے مسز ناڈوے کو ڈکا دیا "کئی بار ہمارا علم ہی ہماری جہالت کا سبب بن جاتا ہے ۔ ہمارا دھرم تو ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ گھر ہی استری کا اصل استھان ہے ۔" مجھے معاً یاد آیا کہ پندرہ برس کی عمر میں نے آریہ استری سماج کے سالانہ جلسہ میں اس موضوع پر بول کر انعام حاصل کیا تھا ۔ مسز وُڈ شاید میری آواز میں بچپن محسوس کر کے ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مسز وُڈ ۔" میں شاید ہٹپٹا کر خلافِ معمول اونچی اونچی آواز میں بولنے لگی "جب سے ہم عورتیں گھروں سے باہر نکل آئی ہیں ہمارے گھر گھر نہیں لگتے ۔"

"تو کیا لگتے ہیں ؟"

"خالی خالی مکان !"

"بڑی عجیب باتیں کرتی ہو تم مسز رائے ! اگر مکان نہ ہوں تو تم اپنے گھرانوں کے ڈھیر کہاں اتارو ؟" مسز وُڈ نے بُجھتے ہوئے انداز میں ایشیائی گھرانوں کے حجم پر طنز کی ۔ "اپنے دلوں پر ؟"

"ہاں ! مسز وُڈ ـــ گھرانے ہمیشہ دلوں پر ہی پھلتے پھولتے ہیں ۔"

"او ـــ ہاؤ رومانٹک !" مس ٹماورڈ نے کہا ۔ "لومی ! مسز رائے کسی گڈ اولڈ انگلش ڈرامے کا ایک پرفیکٹ کیریکٹر معلوم ہوتی ہے ۔"

"مسز رائے!" مسز وُڈ بولی۔ "امریکی عورت کا دل تو ایک خاوند کے بوجھ سے بھی تھکا تھکا رہتا ہے، اگر سالم گھرانہ وہاں پُھدکنے لگے تو بے چاری ہمیشہ بے ہوش ہی رہے۔ کیوں میگی؟"

"ہاں تو می!" پھر مس ٹراورڈ میری طرف متوجہ ہوئی۔ "مسز رائے! جھوٹ نہ بولنا۔ کیا تم واقعی اپنے شوہر سے بور نہیں ہوتی ———؟"

"یہاں تو بڑی گرما گرم بحث چل رہی ہے۔" مسز لنکن کے الفاظ انگریزی آداب کے مطابق چپکے سے کمرے میں داخل ہوئے تو ہم سب نے دروازے کی طرف منہ موڑ لیا۔ "اب میرے گرما گرم مٹن کٹلس کون کھائے گا؟"

"میں۔"

"اور میں بھی۔"

"اور میں بھی مسز لنکن!" مسز چوہدری بھیڑ کے گوشت کی خوشبو سونگھ سونگھ کر بے اختیار ہو گئی۔ "گرما گرم بحث میں حصہ لینے کے بعد میرا تو ہمیشہ یہی جی چاہتا ہے کہ کھانے کو بھی کچھ گرما گرم مل جائے۔"

"لو بھئی، کھاؤ۔" مسز لنکن نے ٹرے ان کے درمیان رکھ دی۔ "اپنی طرف سے بہت تیزی کی، پھر بھی کٹلس بنتے بنتے ہی بنتے ہیں۔"

"اگر میں نہ جاتی ———" مس لوہیا بھی مٹن کٹلس کا ایک اور ٹرے لیے ہوئے داخل ہو چکی تھی۔ "تو ابھی شاید آدھ گھنٹہ اور صرف ہو جاتا۔"

"ہاؤ اِز اَیوری تھنگ مسز ناڈو ے؟" مسز لنکن ذرا سستانے کے انداز میں صوفے میں نچھ گئی۔

"ویری فائن، تھینک یو!"

"ارے! ابھی مسز بیگ نہیں پہنچی؟" مسز لنکن نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر پوچھا۔ "ہمیشہ ٹال جاتی ہے۔"

"مجھ سے تو کہتی تھی کہ اس بار ضرور آؤں گی۔" مس لوہیا نے مٹن کٹلس کو منہ میں رکھنے سے پیشتر گویا اسے آنکھوں سے کھلتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ہمیشہ اپنے میاں کے ساتھ جُڑی رہتی ہے۔"

"ہاؤ ——— ڈسگسٹنگ!"

"اری کو شی!" مسز لنکن اچانک میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔ "تم کیوں منہ پھلائے بیٹھی ہو؟ اگر باتیں کر کے ہمارا مغز نہیں کھانا چاہتی تو کٹلس ہی کھاؤ۔"

ٹرے سے کٹلس اٹھانے سے پہلے میں بناوٹی سے انداز میں مسکرا دی۔

مسز رائے بھی یہاں نہیں ہے۔" مس ٹراورڈ میری طرف اشارہ کر کے گویا ہوئی۔ "یہ بھی اپنے میاں کے ساتھ جُڑی بیٹھی ہے۔"

سراسیمگی میں اپنی نشست سے اُٹھ کر پھر بیٹھ گئی اور وہ سب ہنسنے لگیں۔

"مسٹر رائے تو ہماری کوشش کو پل بھر کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔"

("گوری!" رائے کی آواز سُن کر میرے کھڑے کھڑے اُداس جھکے یکبارگی وفورِ مسرت سے بے تاب ہو ہو کر ہلنے لگے۔ جھگڑے کے بعد جب بھی ہماری بول چال شروع ہوتی، رائے مجھے 'گوری' کہہ کر ہی پکارتا۔ اس کی آواز میں مجھے وہی ترنگ محسوس ہوتی جو شادی کے نئے نئے دنوں میں ہوتی تھی۔

"گوری!" میں سچ مچ اپنے رائے کے ساتھ بالکل جُڑ کر بیٹھ گئی۔ لڑ جھگڑ کر پُرش عورت کا ملاپ ہو جائے تو اس ملن کے سامنے پہلا ملن بھی پھیکا پھیکا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی انمول شے پا کر اسے کھو دینے کا اندیشہ لاحق ہو جائے تو اس کے لیے ہم ساری دنیا تج دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

"گوری!" روٹھ کر رائے صرف دیکھنے میں ہی لاپروا ہوتا ہے۔ نرا بچہ ہے۔ ہار ماننی بھی پڑ جائے تو فوراً اپنا قصور نہیں مانتا، جھجک جھجک کر قریب آتا ہے، جیسے ہمارا بنٹی مجھ سے پٹتا ہے تو اُچک اُچک کر چوری چوری رسوئی کی کھڑکی سے جھانکتا ہے، اپنی گڑیاں خفگی میں اٹکا اٹکا کر سوچتے ہوئے کہ میرے پاس جھٹ ہی چلا آئے یا ابھی تھوڑی دیر اور رُکا رہے۔

"گوری!——)

"ہاں!" میں نے چونک کر مسز لنکن کی طرف دیکھا جو میری توجہ اپنی طرف مبذول کروا رہی تھی۔

"کس سوچ میں ڈوبی ہوئی ہو؟"

اور میں نے سمجھا کہ وہ مجھے مزید مٹن کٹلس کھانے کو کہہ رہی ہے، میں نے اپنا ہاتھ ٹرے کی طرف بڑھا دیا۔

"مسز لنکن!" مسز چودھری بولی۔ "میں نے 'دا ماڈرن ہاؤس وائف' میں ایک بڑے انوکھے کھانے کا ریسیپی پڑھا ہے ہوم میکرز کی اگلی سیٹنگ میرے ہاں رکھو۔ یہ کھانا میں سب سے پہلے ہوم میکرز کو کھلانا چاہتی ہوں۔"

"پہلے اپنے چودھری کو کھلاؤ نا۔"

"اسے چھوڑو۔ وہ تو ہوٹلوں میں الم غلم کھاتا ہی رہتا ہے۔"

"تم تو واقعی اپنے شوہر کے معاملے میں بہت پراگریسو ہو۔" مس ٹراورڈ کو انڈین ہسٹری کا کوئی باب یاد آ گیا۔ "مگر میں نے سُنا ہے کہ پُرانے ہندوستان میں تمہاری قوم کی عورتیں اپنے مردوں کی موت پر ان کے ساتھ جل مرتی تھیں۔"

"ہاں!" مسز چودھری نے مسز وُڈ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ سلگا لیا۔ "بڑی جاہل عورتیں تھیں۔"

"مرد اپنی عورتوں کے ساتھ کیوں نہیں جلتے تھے؟"

"تم نہیں سمجھ سکیں مس ٹراورڈ۔" میں اپنے آپ کو نہ روک سکی۔ "ہم تو مرتی ہی اس لیے ہیں کہ ہماری عمریں بھی ہمارے مردوں کو لگ جائیں۔"

"تمہاری بات اور ہے۔" مس ٹراورڈ نے مجھے فوراً داد دی۔ "تم تو نہ جانے کس صدی میں رہ رہی ہو۔ میں مسز چودھری کی رائے دریافت کرنا چاہتی ہوں۔"

"میرا چوہدری تو بڑا خود غرض آدمی ہے مس ٹراورڈ۔ اسے اپنی جان بڑی پیاری ہے۔ ظاہر ہے میری جان بھی کوئی مفت کی نہیں۔ اگر کچھ ایسی ہی گڑبڑ ہو جائے تو میں تو سب سے پہلے چوہدری کی انشورنس پالیسی کی رقم وصول کروں۔"

"مجھے تمہاری صاف گوئی بہت پیاری لگتی ہے مسز چوہدری! تم تو ہم امریکیوں سے بھی بڑھ چڑھ کر ہو۔"

مسز چوہدری نے میری طرف تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا اور اپنے پھیلے پھیلے جسم کو مزید پھیلا کر کہا۔ "نیویارک میں میری ایک بین فرینڈ ہے وہ بھی ہمیشہ یہی لکھتی ہے۔"

"مسز لنکن!" مسز ناڈوے کو مسز لنکن کے مٹن کٹلس بہت پسند آئے تھے اور وہ تیز تیز ان پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ "ناڈوے نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے لنکن نے آسٹریلیا میں بہت دولت جمع کر لی ہے۔"

میں ٹھٹک کر رہ گئی کیونکہ مسز لنکن نے مجھے بتا رکھا تھا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے۔

بات ٹالنے کی خاطر وہ مسز چوہدری سے مخاطب ہوئی۔ "ہم آئندہ بدھ وار ہوم میکرز کی میٹنگ تمہارے ہاں ہی کریں گے۔"

لیکن مسز ناڈوے نے اپنی بات کو جاری رکھا۔ "اگر تم اس سے علیحدہ نہ ہوتیں تو آج ٹھاٹ سے رہتیں مسز لنکن۔"

جھلاہٹ سے مسز لنکن کے چہرے سے انگریزی اخلاق کا ملمع یکبارگی اتر گیا۔ "میرے لیے وہ مر چکا ہے مسز ناڈوے! اور تمہاری اطلاع کے لیے کہہ رہی ہوں کہ ہم برٹش لوگوں کو مُردوں کی باتیں کرنا قطعاً ناپسند ہے۔"

مس لوہیا تیزی سے اٹھی اور اپنی ٹیچر کی پریشانی کم کرنے کے لیے مٹن کٹلس کا ٹرے اٹھا کر باری باری ہر ایک کے آگے کرنے لگی —

"تھینک یو!"

"تھینک یو!"

"تھینک یو!"

"آئی ایم ساری مسز ناڈوے!" مسز لنکن نے ذرا سنبھل کر پھر اپنے چہرے پر اخلاق کا پاؤڈر تھوپ لیا۔ "پلیز ڈونٹ مائینڈ اٹ۔"

"ناٹ ایٹ آل!"

"تم —— تم اب مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ!" راے اور میں ایک دفعہ کسی معمولی بات پر آپس میں اُلجھ گئے۔ میں نے بہت ضبط سے کام لیا مگر اس کی بے صبر طبیعت ہر بات کا فوری ردِ عمل چاہتی ہے، محبت کا بھی اور نفرت کا بھی۔ اس نے میرے سرد پن سے بے چین ہو کر بچوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے ذرا مداخلت کی تو اس نے مجھے پرے جھٹک دیا اور گرج کر کہا۔ "تم —— اب ہماری نہیں نبھ سکتی —— تم مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ! —— "علیحدہ ہو جاؤں؟ اپنے بچوں کے باپ سے علیحدہ ہو جاؤں؟" میں سناٹے میں آ گئی۔ جیسے میں بڑی بے تابی سے راے کے گھر لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی —— "آج اس نے اتنی دیر کیوں کر دی ہے؟ بے تحاشا گاڑی دوڑاتا ہے۔ کہیں۔ کہیں ——" اور باہر سے کسی کی سراسیمہ آواز آئی: "راے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے!" —— "ہاں! مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ! —— میں تمہارے لیے مر چکا ہوں!" اور میں ہری بھری سہاگن کھڑی کھڑی بیوہ ہو گئی اور اپنے روتے ہوئے یتیم بچوں کو سمیٹ کر خود بھی بے اختیار رونے لگی —— ہائے رام! میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟ میرے بیتے دن

نہ ہیرے جواہرات سے لدے پڑے ہیں، ہنس ہنس کر بھی تو کئی بار آنکھوں میں آنسو بھر ہی آتے ہیں، پھر کبھی کبھار اَن بن بھی ہو گئی تو کیا ہے
میرا رائے مجھ سے سو سو جھگڑے کر لے مگر وہ میرے بنا پل بھر نہیں رہ سکتا۔ بے شک مجھ سے بولتا نہیں مگر چپ سادھے ساگر کی طرح
اندر ہی اندر متلاطم لہروں کے تھپیڑے کھاتا رہتا ہے۔ کل رات آتے دن کے جھگڑوں کے متعلق سوچ سوچ کر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی
اور وہ میرے پہلو کے بستر پر سویا پڑا تھا، میں نے بے چین ہو کر سرعت سے جو بجلی کا بٹن دبایا تو دیکھا کہ اس کی گرانبار کھلی آنکھوں
کی جلن سے پتھریلے چھت میں چھید ہو رہا ہے۔ اگر میں آج سویرے یونہی منہ پھلا کر نہ بیٹھی رہتی تو وہ ضرور بات چیت شروع کرنے کا کوئی
حیلہ ڈھونڈ لیتا۔

"گرہری!"

میں خود ہی چپکے سے اس کے گلے میں باہیں جا لٹکاؤں گی، پُرش استری کے جھگڑے میں کس کی جیت اور کس کی ہار؟ میں آج
ہی ——— ابھی ———)

"سسٹر!" میں نے مسز لنکن سے کہا "پلیز، مجھے اپنی گاڑی میں گھر چھوڑ آؤ۔"
سب ہوم میکرز مسز لنکن کے ناخوشگوار ذکر کو بھول کر اب پھر چہک چہک کر گفتگو کرنے لگی تھیں۔
"ہوم بریکرز!" میں نے جی ہی جی میں کہا۔
"لیکن ابھی تو ہماری باقاعدہ میٹنگ بھی شروع نہیں ہوئی۔" مسز لنکن میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی "مسز وُوڈ کا امریکن ریسیپی
بھی نہیں سُنو گی؟ بڑی لذیذ ڈش ہے۔"
"نہیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" گھر سے چلی تھی تو تہیہ کیا تھا کہ رات کو ہی واپس آؤں گی مگر اب ایک ایک گھڑی پہاڑ
معلوم ہو رہی تھی۔

"میں بھی نوٹ کر رہی ہوں کہ تمہاری طبیعت ناساز ہے، پر کوشی ———"

"نہیں سسٹر! مجھ پر احسان کرو۔ اگر تم نہیں جا سکتیں تو میں رائے کو فون کرتی ہوں۔" (بنٹی کا پنڈا آج سویرے ذرا ذرا
گرم تھا، شاید اسے بخار چڑھ گیا ہو۔ اس کی طبیعت ذرا بھی گرنے لگے تو رائے سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے) "پلیز، سسٹر ———!"
"اچھا۔" مسز لنکن نے غیر رضامند لہجے میں کہا اور کھڑی ہو کر دوسری ہوم میکرز سے مخاطب ہوئی "تم باتیں کرو، میں کوشی
کو چھوڑ کر ابھی آتی ہیں۔"

میں بھی اٹھی تو مسز اوڈ نے بڑی تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا گویا کہہ رہی ہو "بڑی عجیب عورت ہو۔ دن رات ایک ہی
مرد کے ساتھ رہتی ہو، پھر بھی اس سے بور نہیں ہوتیں!"
مسز لنکن کی پرانی آسٹن کسی نئی گاڑی کی طرح فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی اور میں بھی بیٹھی بیٹھی تیز تیز دوڑ رہی تھی۔
میں رائے سے جھگڑے کا قصہ چھیڑوں گی ہی نہیں۔ بس مسکرا مسکرا کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دوں گی جیسے ہمارا جھگڑا ہوا
ہی نہ ہو۔ اماوس کو چاند جب رات سے روٹھ کر کہیں چلا جاتا ہے تو پھر ملاقات پر وہ پرانی تکرار تھوڑا ہی لے بیٹھتے ہیں۔ وہ تو دوبارہ
ملتے ہی ہنسنا کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ چاند بڑھنے پھیلنے لگتا ہے اور رات اس کی پُرحدت خنکی میں منہ چھپا کر کھل اٹھتی ہے۔ بس میں

راٹے سے کوئی شکایت نہیں کروں گی، چپ چاپ اس کے گلے میں باہیں ڈال دوں گی اور پھر —— اور پھر

گاڑی ہمارے بنگلے کی پورچ میں پہنچ کر رک گئی۔ سامنے راٹے کھڑا تھا۔

"ہیلو مسز لنکن!" وہ دوڑ کر ہمارے قریب آگیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے اس کی نظریں تابندہ ہو اٹھیں۔

"لو بھئی، اپنی کرسٹی کو سنبھالو، بڑی ناٹی گرل ہے۔"

میں گاڑی سے باہر نکل آئی۔

"تم بھی آؤ نا مسز لنکن۔" اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"نہیں، میرے گھر ہوم میکرز بیٹھی ہیں۔" مسز لنکن نے کہا۔ "آج تم بڑے خوش نظر آرہے ہو؟"

"ہاں، مسز لنکن! اگلے سوموار میں ہنی مون پر جا رہا ہوں۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "کیا —— ؟!"

"ہنی مون؟" مسز لنکن بھی گاڑی کا انجن اسٹاپ کر کے اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

"ہاں! ہنی مون —— مسز لنکن! یہ سوموار ہماری شادی کا دن ہے!"

"اوہ ——!" میں نے زور سے اس کا ہاتھ دبایا اور ہنسنے لگی۔

"اری آہستہ!" چاند بڑھنے پھیلنے لگا۔ "مسز لنکن! بار بار ہمارا نیا بیاہ ہوتا ہے، بار بار ہم ہنی مون مناتے ہیں۔"

"ناٹی چلڈرن!"

اپنے نئے ملن کی اس اُجول گھڑی پر مجھے مسز لنکن کا ریاکارانہ چہرہ بھی بڑا پیارا معلوم ہو رہا تھا!

انتشار

احمد شریف

اس زمانے میں کسی کا یہ کہنا کہ وہ اپنی بیوی سے نفرت کرتا ہے بیٹھے بٹھائے سولی پر چڑھنے والی بات ہے، پھر بھلا میں کیوں کھلم کھلا اس حقیقت کا اعتراف کروں۔ دیکھا جائے تو کل تک ایسی کوئی بات بھی نہ تھی۔

گزری ہوئی کل ہی کا ذکر ہے، میں صبح سے تین بار شیو بنا چکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ بلقیس کی سہیلیاں آنے والی تھیں جن میں ایک سونیا بھی تھی۔

جس فلیٹ میں ہم رہتے ہیں شادی سے پہلے میں اس فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا۔ بلقیس کے آنے سے اس فلیٹ کی قسمت اس شہر کی طرح جاگ اٹھی ہے جس کو حکومت نے اپنا نیا دارالخلافہ منتخب کر لیا ہو۔ اس کی سہیلیاں نئی نویلی دلہن کا نیا گھر دیکھنے آ رہی تھیں۔

میں کمرے میں پلنگ پر لیٹا اِندر کے اکھاڑے کا تصور باندھ رہا تھا۔ میری اس بات سے آپ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ خدانخواستہ میں کوئی بے وفا قسم کا شوہر ہوں۔ آپ خود خیال کریں کسی مرد کی زندگی میں اس سے بڑھ کر خوشی کا لمحہ اور کون سا ہو سکتا ہے کہ اس کے اردگرد حسین و جمیل لڑکیوں کا جمگھٹا ہو اور وہ ان کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہو۔ ایسی ہی فطری سی خواہش میرے دل میں بھی جاگ اٹھی تھی۔ خوشی سے میرا دل نئے ہی انداز میں دھڑک رہا تھا۔ بلقیس کو بنی ٹھنی دیکھ کر دل چاہتا تھا جی بھر کر پیار کروں — خوشی کا وہ موقعہ اسی کی بدولت تو میسر آنے والا تھا۔

زینے میں کسی نے بہت سارے گھنگھرو لڑھکا دیے۔ کھڑکی کا پردہ یوں ہلا جیسے کسی حنائی ہاتھ نے اسے چھُو کر چھوڑ دیا ہو۔ میں بظاہر چپ چاپ لیٹا رہا حالانکہ اس وقت میری حالت چینی کے اس پیالے کی سی تھی جس کو کسی نے ابھی ابھی چمچ سے بجایا ہو۔ رسیلے اور مترنم قہقہوں کے ساتھ صحن میں لال، نیلے، اودے، پیلے، کاسنی اور گلابی رنگ بکھر گئے۔ ماتھے رِم جھم کرتے اور گنگناتے موسم میں آنگن میں قوس قزح اتر آئی۔ مہمانوں کی آمد پر فلیٹ کی ایک ایک اینٹ مسکرا رہی تھی اور میرا دل ڈبکیاں لے رہا تھا۔ حسینوں کی محفل میں مرد ایک میں ہی میں تھا۔

لیکن جونہی بلقیس کی سہیلیاں دوسرے کمرے میں داخل ہوئیں اس نے جلدی سے درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ میری حالت یکبارگی تاش کے اس جوکر کی سی ہو گئی جس کو تاش بانٹتے وقت کھلاڑیوں نے نکال کر الگ پھینک دیا ہو۔ وہ حالت بڑی تکلیف دہ

تھی۔ ظلم یہ تھا کہ وہ سب کی سب باہر سے مجلے پر دہ آئی تھیں، میرے ہی گھر میں پردے کا یہ اہتمام مجھے بہت ناگوار گزرا۔ اگر ان کا قرب ممکن نہ تھا تو کم از کم درمیانی دروازہ ہی کھلا رہتا۔ دل کو تھوڑی بہت تسلی تو رہتی۔

میں پلنگ پر پڑا انگاروں پر لوٹتا رہا۔ پھر بھی ایک موہوم سی آس ابھی تک باقی تھی ——— شاید دوسرے کمرے میں باتوں باتوں میں بہرا ذکر آ جائے اور میں وہاں بلا لیا جاؤں۔ ان حسینوں کا کیا اعتبار! دل میں آئے تو حسن کی بادشاہت بخش دیں لیکن معلوم ہوتا تھا اس روز میرے مقدر میں فقیری ہی لکھی تھی۔

تاؤ مجھے اس بات پر بھی آ رہا تھا کہ اگر اسی طرح ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا تھا تو صبح سے اتنے سندر اور سہانے خواب کیوں دیکھے تھے۔ بلقیس نے میرے پاس بیٹھ کر کئی بار اپنی سہیلیوں کا اس طرح ذکر کیا تھا جیسے وہ میری بھی سہیلیاں ہوں حالانکہ ان میں سے میں صرف سونیا کو جانتا تھا۔

سونیا سے ملاقات بلقیس ہی کے ہاں ہوئی تھی۔ پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میں اسے پہلے سے جانتا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کیسے دن تھے۔ جب بھی کسی اجنبی لڑکی کی ایک جھلک نظر آتی یہی گمان ہوتا کہ ہمارے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہے جس کا کوئی نام نہیں۔

سونیا کے سراپا میں ایک عجیب سی بات تھی۔ جب وہ شرما کر اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کرتی تو اس کا انگ انگ آپ ہی آپ نمایاں ہو جاتا۔ کبھی کبھی وہ سکرٹ کی بجائے شوقیہ شلوار قمیص پہنتی تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ بالکل ننگی ہے۔

شاید میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ بلقیس میرے ماموں کی لڑکی ہے۔

ماموں اور سونیا کے پپا گہرے دوست ہیں۔ دونوں شطرنج کے رسیا ہیں۔ سونیا اور اس کے پپا اکثر ماموں کے ہاں آتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سونیا کے ساتھ میری ملاقاتوں کا سلسلہ بھی طویل ہوتا چلا گیا ——— مگر اس وقت دوسرے کمرے میں وہ بھی اس طرح انجان بنی بیٹھی تھی جیسے ہم میں کبھی کوئی راہ و رسم نہ تھی۔

یونہی پڑے پڑے پتہ نہیں کتنی صدیاں گزر گئیں۔ دوسرے کمرے میں زندگی اپنے شباب پر تھی اور میرے کمرے میں موت کا سا سناٹا تھا۔ بھولے سے کوئی مترنم قہقہہ میرے کمرے میں در آتا تو محسوس ہوتا میرے دل میں اندھیرے کا تیر سنسناتا ہوا آن لگا ہے۔

لیٹے لیٹے اچانک مجھے خیال آیا کہ دوسرے کمرے کا صحن کی طرف کھلنے والا دروازہ باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پڑتا ہے۔ میں اٹھ کر ننگے پاؤں باورچی خانے کی طرف ہو لیا۔ صورت حال بڑی مضحکہ خیز تھی۔ میں اپنے ہی گھر میں چور بن کر رہ گیا تھا۔ میں نے صحن میں نکل کر دیکھا دوسرے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں پنجوں کے بل، دھیرے دھیرے اس دروازے کے سامنے سے گزرا اور دزدیدہ نگاہوں سے کمرے میں جھانک کر دیکھا ——— لیکن بیچ میں پھول دار بھاری پردہ حائل تھا۔ ساری محنت پر ایک دم پانی پھر جانے سے میں بجھ سا گیا اور نہ جانے کس جذبہ کے تحت میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ میں جلدی سے قدم بڑھا کر باورچی خانے میں جا گھسا اور وہاں خلاف توقع سونیا کو پا کر ٹھٹک گیا۔ وہ ایڑیاں اٹھائے الماری کے اوپر والے خانے سے پلیٹیں اتار رہی تھی۔ میں گھڑی بھر کو اس کے تنے ہوئے سراپا کے نشیب و فراز میں کھو گیا اور جب وہ مڑی تو میں نے ہنستے ہوئے اس کے

قریب جا کر بڑے پیار سے اس کا ایک ہاتھ تھام لیا۔ وہ سرک کر پیچھے ہٹ گئی اور قدرے برہم ہو کر کہنے لگی ۔

"شرم نہیں آتی؟ بلقیس سے کہہ دوں گی۔"

میں سمجھا مذاق کر رہی ہے۔ اس لیے بے تکلفی سے اس کے جسم سے جسم ملا کر کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کہہ دو گی؟"

"یہی کہ تمھیں پٹا ڈال کر رکھے۔"

وہ ہنسی اور میں نے لمحہ بھر میں کئی غوطے کھائے۔ اس نے پلیٹیں اٹھائیں اور میری طرف دیکھے بغیر چل دی۔ میں اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے اس کے پیچھے لپکا اور اس کے شانے کو چھو کر آہستہ سے پکارا۔

"سونیا!"

"ہوں!"

اس نے میری طرف ذرا سی مڑ کر ہنکارا بھرا۔ میں نے کہا۔

"پہلے تو تم ایسی نہ تھیں۔"

کہنے لگی۔

"پہلے اور بات تھی۔"

"پہلے کیا بات تھی؟"

میں نے پوچھا۔ اس نے مڑ کر بھرپور نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔"

وہ چلی گئی اور میں اس شاخ کی مانند جھولتا رہ گیا جس پر سے ابھی ابھی بے دردی سے پھول توڑا گیا ہو۔

اب گریبان میں منہ ڈالنے والی بات درمیان میں آئی ہے تو کیوں نہ آپ کو بتا ہی دوں۔

اس روز بلقیس کی سالگرہ تھی چونکہ شادی سے پہلے والدین کے گھر میں وہ اس کی آخری سالگرہ تھی اس لیے بڑی دھوم دھام سے منانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اور لوگوں کے علاوہ سونیا اور اس کے پپا بھی شریک تھے۔ میری شرکت تو لازمی تھی کیونکہ بلقیس پر میرا حق بچپن ہی سے تسلیم کیا جا چکا تھا۔

لیکن عین موقع پر سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ بادل صبح سے گھر کر آئے ہوئے تھے۔ شام ہوتے ہوتے بارش چھما چھم برسنے لگی۔ آئے مہمان افراتفری کے عالم میں رخصت ہو گئے۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی ماموں، سونیا کے پپا کا ہاتھ پکڑ کر انھیں سٹڈی میں لے گئے۔ اُدھر ان کی شطرنج کی محفل جمی اِدھر ساتھ والے کمرے میں بلقیس، سونیا، ممانی اور میں لحاف اوڑھ کر قالین پر بیٹھ گئے اور رمی تاش ملا کر رمی کھیلنے لگے۔

باہر تیز آندھی چل رہی تھی اور مینہ ٹوٹ کر برس رہا تھا۔

رمی کھیلتے کھیلتے جب کافی رات بیت گئی تو ممانی جان نے تھک کر ڈھیلی سی انگڑائی لی اور اٹھ کر سونے کے لیے چلی گئیں

سونیا نے شاید واپسی کے خیال سے سٹڈی کے نیم وا دروازے کی طرف دیکھا مگر وہاں شطرنج کے کھلاڑی پُرامن ماحول میں جنگ کے نقشے جمائے بیٹھے تھے۔ ہم بتی بجھا کر قالین پر ہی لیٹ گئے۔ میرے اور سونیا کے درمیان بلقیس لیٹی ہوئی تھی۔

سامنے والے روشندان میں بجلی کا کوندا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چلمن سے لگی کسی چنچل لڑکی کی طرح جھلک دکھا کر چھپ جاتا۔ سٹڈی کے اُدھ کھلے دروازے سے روشنی کی دودھیا لکیر قالین پر لیٹی اس طرح لگ رہی تھی جیسے سوتے میں کسی لڑکی کی شلوار ذرا اوپر سرک گئی ہو۔ تاریکی کے چہرے پر آتشدان میں دہکتے انگاروں کا غازہ سا ملا ہوا تھا۔ اس الف لیلوی ماحول میں جلدی ہی میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں اور میں سو گیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ بجلی بڑے زور سے کڑکی۔ ساتھ ہی کسی کی چیخ سُنائی دی۔ دھندلی دھندلی روشنی میں مجھے سونیا کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ میرے پیروں کی طرف کھڑی تھی۔ بلقیس بھی جاگ پڑی۔ میں نے سونیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتی رہی اور پھر گٹھڑی سی بن کر میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ سوتے میں بجلی کی کڑک سُن کر ڈر گئی تھی۔ میں تھوڑی دیر اس کی طرف منہ کر کے لیٹا رہا اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ سو گئی ہے تو میں بھی بلقیس کی طرف کروٹ لے کر سو گیا۔

اور پھر جو میری آنکھ کھلی تو میرے کانوں کے قریب سونے کی گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ دبی دبی سرگوشیاں سرسرا رہی تھیں۔ سانسوں کی جو پھوار میرے چہرے کو چھو رہی تھی اس میں آگ سی لگی ہوئی تھی ——— وہ سونیا تھی ——— میں اپنا مستقبل صلیب پر الٹا لٹکا ہوا پا کر کانپ اٹھا اور سونیا کو پرے دھکیل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسی گھبراہٹ میں بلقیس کا بازو میرے نیچے آ گیا اور وہ بھی جاگ پڑی ——— اس وقت اپنی اپنی جگہ ہم تینوں جاگ رہے تھے۔ میں سانس روک کر لیٹا رہا۔ سونیا بھی چپ سادھے پڑی رہی۔ بلقیس نیند ہی نیند میں بڑبڑائی اور پھر سو گئی۔ باہر طوفان تھم چکا تھا لیکن میرے سینے میں دیر تک بے تحاشہ جھکڑ چلتے رہے۔ صبح جب ہم جاگے تو سونیا اپنے پپا کے ساتھ جا چکی تھی۔

اس واقعہ کے بعد بھی میں اور سونیا اکثر ملتے رہے مگر کبھی گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنے کا تذکرہ نہ ہوا۔ وہ اٹوٹ رشتہ جو پہلی ہی ملاقات پر استوار ہوا تھا جوں کا توں قائم رہا۔ مگر اب . . . . . .

باورچی خانے میں جس وقت میں نے سونیا کا ہاتھ پکڑا میری نیت میں کوئی فتور نہ تھا۔ میں تو بلقیس کی سہیلیوں کے آنے اور اپنے یوں بُری طرح نظر انداز کیے جانے پر اندر ہی اندر جل رہا تھا اور چاہتا تھا کسی طرح وہ آگ سرد پڑ جائے لیکن سونیا کے رویّے سے وہ آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ میں باورچی خانے میں کھڑا دیر تک اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس سے وہ ابھی ابھی گئی تھی اور پھر اس ایکا ایکی رونما ہونے والی تبدیلی پر حیران اپنے کمرے میں آ کر نڈھال سا پلنگ پر گر گیا۔

پتہ نہیں میں کتنی دیر بے سدھ پڑا رہا۔ جس وقت بلقیس نے مجھے جگایا شام ہو رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں جا چکی تھیں درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ فلیٹ بیوہ کی کلائیوں کی طرح، جن کی چوڑیاں ابھی ابھی توڑی گئی ہوں، اُجڑا اُجڑا اور ویران تھا۔ ندامت کا احساس ابھی تک باقی تھا۔ میں باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ بلقیس اپنے سراپا کو بل سا دے کر میری طرف آئی اور میرے کندھے پر جھول کر پوچھنے لگی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"جہنم میں۔"

میں نے بلاوجہ اسے جھڑک دیا۔ وہ ہنسی اور اٹھلا کر بولی۔

"میں بھی جاؤں گی۔"

میں نے بچپن سے اس کی کوئی خواہش رد نہ کی تھی۔ پھر میں اس وقت کون سا جھولا جھولنے جا رہا تھا، اس لیے خاموش رہا۔

جب ہم گلی سے گزرے تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ سارا ماحول بدلا بدلا سا ہے۔ ایسے لگتا تھا جیسے تیز و تند آندھی کے بعد ہر شے گرد و غبار میں لپٹی ہوئی ہو۔ وہ پہلا سا نکھرا نکھرا پن مفقود تھا۔

اور بازار میں آکر تو میرے وجود میں لگی رہی سہی کلف بھی اتر گئی۔ ہوا یوں کہ اپنے حسن سے باخبر ایک جوان لڑکی ہمارے قریب سے گزری۔ میں نے یونہی اس کا سرسری سا جائزہ لیا۔ اس نے ایک نظر بلقیس پر ڈالی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے ٹٹولا اور پھر اس طرح بے اعتنائی سے منہ پھیر کر آگے بڑھ گئی جیسے چلتے چلتے کہہ گئی ہو۔

"فٹے منہ"

اور ساتھ ہی میرے اندر سے کسی نے ہنس کر طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"یار دیاں لیراں لیراں۔"

میری نظریں جھک گئیں اور اس وقت مجھے پتہ چلا کہ شادی کے بعد میں، میں نہیں رہا تھا۔ میرے جی میں آئی بلقیس کو لے کر سیدھا ریلوے سٹیشن جاؤں اور چپکے سے آنے والی پہلی گاڑی کے سامنے لیٹ جاؤں لیکن ایسے کاموں کے لیے جس بلند حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ شادی سے پہلے مجھ میں ہو تو ہو اس وقت نہیں تھا اس لیے ریلوے سٹیشن جانے کا ارادہ ترک کرنا پڑا ویسے مجھے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ کیسے کیسے نازک رشتے ایک دم ٹوٹ گئے تھے۔

اور پھر قدم قدم پر یونہی پھٹکاریں برستی رہیں۔ میں بلقیس کو ساتھ لیے، سر جھکائے ڈلہوزی روڈ کا چکر کاٹ کر سبزی کی طرف نکل آیا۔ سینما گھر کے سامنے سے گزرتے وقت میری نظر فلم کے بورڈ پر پڑی۔ وہاں ایک جنگی فلم چل رہی تھی جو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ شروع سے تین چوتھائی فلم میں یوں تو گھپ اندھیرا چھایا رہتا ہے لیکن ماحول کی ہولناکی اور فضا کے تناؤ کی وجہ سے آدمی محسوس کرتا ہے جیسے سوئی کی نوک پر بیٹھا ہو اور آخر میں جو دنادن گولے پھٹتے ہیں تو گویا قیامت آ جاتی ہے۔ میں نے سوچا کیا پتہ اُدھر پردے پر کوئی گولہ پھٹے اور اِدھر بلقیس کا دل چپکے سے چُپ سادھ لے۔ میں اسے لے کر سینما میں جا گھسا۔

فلم شروع ہو چکی تھی۔ ہم ایک جگہ دو خالی کرسیاں پا کر بیٹھ گئے۔ بلقیس بیٹھتے ہی انہماک سے فلم دیکھنے لگی اور میں اندھیرے میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس کا وجود کلف لگا کر دھوپ میں ڈالے ہوئے کپڑے کی طرح اکڑنے لگا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو کر دنادن گولے پھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔

اتنے میں بلقیس کے پرلی طرف اندھیرے میں ستارے سے جھلملائے۔ اب اندھیرے کے اسراروں سے میں اتنا

ناواقف تو ہوں نہیں کہ کسی کے کانوں میں پڑے بُندوں کے جگمگاتے نگینے بھی نہ پہچان سکتا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں ان ستاروں کو کوئی اہمیت نہ دیتا لیکن اس وقت محرومی اور شکست کا جو احساس مجھ پر طاری تھا اس سے چھٹکارا پانے کے لیے میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ ایک مبہم سے اشارے، ایک ذرا سی نگاہِ التفات کا متمنی تھا۔ بلقیس فلم دیکھتی رہی اور میں کسی کی قربت کے خیال سے دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔

وقفہ ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بلقیس سے اگلی سیٹ پر نگاہ ڈالی۔ مبادا کہیں پھر پھٹکار نہ برسے۔ وہاں میرے خیالوں کی ہو بہو تصویر ایک حسین عورت بیٹھی تھی۔ اس نے لمبی لمبی پلکیں دو تین بار جلدی جلدی جھپکائیں۔ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور منہ پھیر کر اپنے ساتھی سے باتیں کرنے لگی جو آنکھوں پر موٹے فریم کی عینک چڑھائے کرسی میں دھنسا بیزار سا بیٹھا تھا۔ اس عورت کے یوں منہ پھیر لینے میں اجنبیت کے باوجود نفرت نہ تھی۔ میں نے محسوس کیا جیسے ہم میں ان دو مسافروں کی سی جان پہچان تھی جو ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہوں۔ کچھ نئے رشتے تھے جو آپ ہی آپ استوار ہو رہے تھے۔ میں پرانے رشتوں کے ٹوٹ جانے کا غم کسی حد تک بھول گیا اور بلقیس کو لے کر باہر چلا آیا۔

عام حالات میں میں کبھی ایسی حرکت کا مرتکب نہ ہوتا جو میں نے وقفے کے بعد کی۔ میں دانستہ دیر سے اندر آیا اور اندھیرے میں بلقیس سے جگہ بدل کر بیٹھ گیا۔ دراصل اس اجنبی عورت نے میری شخصیت کو چکنا چور ہونے سے بچا لیا تھا اور اب وہ میرے اتنی قریب تھی کہ میں ذرا سا ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔ میں نے بظاہر غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ اس طرح کرسی کے بازو پر رکھا کہ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھو گیا۔ میرا رواں رواں جاگ اٹھا۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ ہٹانے کی کوشش نہ کی۔ میں نے حوصلہ کر کے اپنا ہاتھ اس کے نرم و نازک ہاتھ پر رکھ دیا۔ نرم نرم ریت میرے ہاتھ کے نیچے سمٹی، پھسلی، تھرتھرائی اور پھر میرا ہاتھ پسیجی ہوئی ریت میں دب گیا۔ اس نے میرا ہاتھ دھیرے سے دبایا اور یوں نیا رشتہ گہرا ہوتا چلا گیا۔

مسافر منزلیں مارتے بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ پردے پر پہلا گولہ پھٹا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ گولا میرے سر پر پھٹا ہو۔ میرے پہلو میں اجنبی عورت کی بجائے اس کا ساتھی بیٹھا تھا جس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ ابھی تک دبا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ چھڑایا اور بلقیس کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اس نے مجھے بوکھلایا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

"[illegible] ـــــ کیا ہوا۔"

تھکے ہوئے لمحے

رتن سنگھ

اُس وقت میں ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا۔

بات صرف اتنی سی تھی کہ میری سات آٹھ سالہ لڑکی رانی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ اگر کل بھی میری گڑیا کے لیے ہار نہ آیا تو اس کا بیاہ کیسے ہوگا؛ کل بارات آنے والی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا، جن کی میں تاب نہ لا سکا۔ شرم کے مارے میری نظریں جھک گئیں۔ میری جھکی ہوئی نظر بُوٹوں پر جم کر رہ گئی؛ جن کا چمڑا کئی دنوں سے پالش نہ ہونے کی وجہ سے خراب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ خراب بُوٹ مجھے ایک اور کمی کا احساس دلا رہے تھے۔ میں نے اپنی لڑکی سے شرمندہ ہو کر ذہن پر پناہ لینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ناکام رہا۔ آخر میں نے رانی کی طرف نہ دیکھ کر سامنے دیوار پر نظریں جما دیں۔ لیکن سامنے شیلف پر رکھے ہوئے خوبصورت سے پھولدانوں کے جوڑے نے مجھے ایک اور کمی کا احساس دلایا۔ لکڑی کے یہ پھولدان جن پر بہت عمدہ مینری بنی ہوئی ہے، ایک نہایت ہی عزیز دوست، بڑی محبت اور پیار سے، میرے لیے سجے پور سے لایا تھا۔ پچھلے دو مہینوں سے میں اُن پھولدانوں میں سجانے کے لیے کاغذ کے پھُول تک نہیں خرید سکا تھا۔ جب بھی کبھی وہ دوست میرے گھر آتا تو میں بڑی شرم محسوس کرتا۔ جیسے میں نے اُس کے تحفے کی بے قدری کی ہو۔ ان پھولدانوں پر بنی ہوئی مینری کی طرف بھی میں زیادہ دیر کے لیے نہ دیکھ سکا۔ شیلف کے نیچے رکھے ڈرائنگ ٹیبل کے ٹوٹے ہوئے شیشے پر سے پھسلتی ہوئی میری نظر ایک کونے میں رکھی ٹائم پیس پر جم کر رہ گئی۔ جس کی بڑی مدھم آواز میں ٹِک ٹِک سنائی دے رہی تھی۔ ٹھیک چھ بج رہے تھے۔ منٹ کی سوئی بارہ کے ہندسے پر پہنچ چکی تھی۔ اور سیکنڈ کی سوئی پورے ڈائل کا چکر کاٹ کر بارہ کے ہندسے پر پہنچنے ہی والی تھی۔

گھڑی کی یہ مدھم سی ٹِک ٹِک میرے پریشان شدہ دماغ کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ گھڑی سے نظریں اُٹھا کر میں نے رانی کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اب تک میرے پاس کھڑی تھی۔ میں نے پیار سے اُسے اپنی گود میں کھینچ لیا۔ وہ اور زیادہ سسکنے لگی۔ اُس کے سسکیاں بھرنے اور رونے کے انداز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی گڑیا کے لیے موتیوں کے ہار کی کمی کو بہت شدت سے محسوس کر رہی ہے۔ اُس کو اس طرح روتا دیکھ کر میں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے رانی جوان ہو گئی ہے۔ اور اُس کی شادی کے لیے میں مناسب جہیز اور خرچ کے لیے روپوں کا انتظام نہیں کر پایا۔ ایک ہی لمحے میں مَیں اُن تمام پریشانیوں

کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگا جو ایسے نازک موقعے پر ہوا کرتی ہیں۔ ہر ایک دوست، رشتہ دار اور بہن بھائیوں کے سامنے عزت بچانے کے لیے تھوڑی تھوڑی مدد کے لیے گڑگڑانا ساُن کے طعنوں اور طنزیہ مسکراہٹوں کو چپکے سے پی جانا اور نہ جانے کیا کیا۔ میرا دماغ اس طرح سوچتے سوچتے چکرانے لگا۔ رانی کی آنکھوں سے گرم گرم دو تین آنسو میرے بازو پر گرے اور میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ میری جیب میں وقت بے وقت کے لیے دو تین روپے پڑے تھے۔ انہی میں سے ایک روپیہ رانی کو دیتے ہوئے کہا "جاؤ۔ گڑیا کے لیے ہار لے آؤ۔" نوٹ ہاتھ میں لے کر رانی آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی۔ اور میں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے رانی کی شادی کے تمام کام خوش اسلوبی سے انجام پا گئے ہوں اور وہ سسرال جا رہی ہو۔ اس خیال سے میری وقتی پریشانی میں کسی طرح کی کمی نہ ہوئی۔ رانی کے جاتے ہی میں نے میز کو قریب کھینچ کر پاؤں اس پر ٹیک دیئے اور کرسی پر نیم دراز ہو کر خیالات میں کھو گیا۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک کی آواز کمرے کی خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ ٹِک۔ ٹِک۔ ٹِک..........

میری آنکھوں کے سامنے زندگی بھر کی تمام محرومیاں ایک۔ ایک کر کے آتی جا رہی تھیں۔ پچھلے چند سالوں سے مالی مشکلات نے میری زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ اکثر مجھے دس دس پانچ پانچ بلکہ کئی مرتبہ تو ایک ایک روپیہ تک بھی دوستوں سے ادھار لینا پڑا تھا۔ وہ سب کے سب واقعات کچھ دھندلے کچھ ادھورے اُس وقت کانٹے بن کر میرے دل و دماغ پر چبھ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ایسے ہی چند روپوں کے لیے مجھے ہر دوست ہر رشتہ دار سے شرمندہ ہونا پڑا تو زندگی کیسے پار ہوگی۔ ننھے ننھے بچے ہیں۔ اُن کو عمدہ تعلیم دینے کی خواہش ہے۔ اُن کی ننھی ننھی معصوم سی ضرورتیں ہیں، جو میں نے کبھی پوری نہیں کیں۔ اُن کے لیے کبھی خوبصورت سے کھلونے خرید کر نہیں لایا۔ انھیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ ان کا جنم دن آ کر گزر جاتا ہے۔ اُن کو کبھی کبھی بلاوجہ ڈانٹ دیتا ہوں۔ دل میں کئی امنگیں، کئی امیدیں لیے وہ میرے پاس آتے ہیں۔ کوئی میرا بازو تھام لیتا ہے اور پیار سے کہتا ہے "پاپا جی مجھے امین آباد لے چلیے نا! کوئی کہتا ہے پاپا جی! میرے لیے مٹھائی کیوں نہیں لائے؟" اس وقت میں اُن سے شرمندہ ہوتا ہوں۔ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے میں اُن کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر جب وہ ٹالنے پر بھی نہیں ٹلتے تو میں اُن کو جھڑک دیتا ہوں۔ اُن کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیتا ہوں۔ اُف! میں مجرم ہوں پرماتما۔ مجھے بخش دو۔ اس طرح سوچتے سوچتے میرا دل بیٹھنے لگا۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک رہ رہ کر میرے خیالات تتر بتر کر دیتی تھی۔ جس طرح ذہن میں زندگی کی محرومیاں ایک۔ ایک کر کے سامنے آتی جا رہی تھیں۔ اسی طرح گھڑی کی ٹِک ٹِک مسلسل جاری تھی۔

پھر میرے ذہن میں دادی اماں کی یاد اُبھری جو آج سے چار سال قبل اس جہان سے کوچ کر گئی تھیں۔ دادی ماں کی یاد آتے ہی میری آنکھیں بھر آئیں۔ اس زندگی میں وہی ایک عورت، نہیں نہیں۔ وہی ایک دیوی تھی جس نے مجھے پیار دیا تھا۔ مجھ سے پیار کیا تھا۔ جب میرے ماں باپ، میرے دوسرے بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر کوئٹے چلے جاتے تھے، اور مجھے اکیلا دادی اماں کے پاس چھوڑ جاتے تھے، تو شدتِ غم سے میری روح تڑپ اٹھتی تھی۔ ایسی حالت میں کافی دیر تک دادی اماں کی گرم گود میں سر رکھ کر رو لیتا تھا۔ اکثر انہی کی گود میں پڑا پڑا سو جاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار جب میرے والدین چھوڑ کر گئے تو میں اپنے کھیت کی ایک منڈیر پر روتا روتا سو گیا۔ جب میں

سو کر اٹھا تو بخار کی گرمی سے میرا جسم جھلسا جا رہا تھا۔ ایک قدم بھی اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ ایسے میں نہ جانے کہاں سے دادی اماں مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس طرف نکل آئیں۔ اور قریب آدھ میل پر واقع گھر تک، اپنی بوڑھی کمر پر مجھے اٹھا کر گھر لے گئیں۔ اب پھر مجھے یاد آیا کہ دادی اماں کی آخری بیماری کا مجھے دو مہینے تک پتہ ہی نہ چل سکا۔ میں اُن سے دور خلیج کچھ کے کنارے سمندر کی لہروں سے دل بہلاتا رہا۔ اور جب میں لکھنؤ لوٹا۔ تو وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ صرف جان نکلنا باقی تھی۔ اس واقعہ کی یاد آتے ہی میرا دل پھر بیٹھنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تاکہ کہیں کمرے میں آتے جاتے ہوئے میری بیوی مجھے روتا ہوا نہ دیکھ لے۔ گھڑی اب بھی ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔

ماں باپ کا پیار نہ ملنے کی وجہ سے میری زندگی میں پیار کی جو تشنگی پیدا ہوئی ہے وہ کبھی نہیں مٹتی۔ کسی طرح نہیں مٹتی۔ اس پیاس کو مٹانے کے لیے جہاں بھی کسی کا ذرا سا جھکاؤ اپنی طرف دیکھتا ہوں تو اس پر جان نچھاور کر دینے کو دل چاہتا ہے۔ ان سے میل جول بڑھاتا ہوں۔ ان کے گھر آتا جاتا ہوں۔ لیکن دوسری طرف سے جب ویسی گرم جوشی نہیں ملتی۔ تو دل پر شدید ٹیس لگتی ہے۔ پیار سے بھوکے دل کے ہاتھوں کئی بار تو شرمندہ ہونا پڑا۔ پیار کی بھیک مانگنا پڑی۔ لیکن وہ تشنگی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی بیوی سے بھی شکایت ہے۔ اکثر اُسے کہتا ہوں تمہیں بھی مجھ سے پیار نہیں۔ پیار کی اس تشنگی کا احساس میری زندگی کا درد بن گیا ہے۔ میں ہر لمحہ پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ میرے ہونٹ یوں کانپ رہے ہیں۔ جیسے پانی سے باہر پھینک دینے پر مچھلی کا منہ بار بار کھلتا ہے اور بند ہوتا ہے، کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک مسلسل میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

محرومیوں کے متعلق سوچنے کا سلسلہ نہ معلوم کہاں تک چلتا کہ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ ان محرومیوں کے لیے میں خود کافی حد تک ذمہ دار ہوں۔ اگر محنت کر لیتا تو بی اے میں اچھی ڈویژن آ سکتی تھی۔ اور اگر اچھی ڈویژن آ جاتی تو اچھی نوکری بھی مل سکتی تھی۔ بلکہ ایک اچھی ملازمت تو میں نے محض اس لیے کھوئی تھی کہ کافی موقعہ ملنے پر بھی اس کے لیے امتحان کی مکمل تیاری نہیں کر سکا تھا۔ اور پھر یہ کہ میں بہت سست اور کاہل ہوں۔ صبح آٹھ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتا۔ دفتر سے لوٹ کر اپنے وقت کا صحیح استعمال نہیں کرتا۔ اگر اپنے وقت کا صحیح استعمال کروں تو کوئی وجہ نہیں کہ مالی مشکلات دُور نہ ہو سکیں۔ اسی طرح مجھے خیال آیا کہ کتنے دوست میری خط و کتابت میں کاہلی کی وجہ سے ناراض ہیں۔ جگدیش کے ہی چندی گڑھ سے کتنے خط آ چکے تھے۔ ایک کا جواب بھی نہیں دیا۔ پھر مجھے کیا حق ہے کہ دوسروں پر گلا کروں۔

اس وقت میری زندگی کی تمام محرومیاں اور خامیاں مجموعی طور پر میرے درد میں اضافہ کر رہی تھیں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دل کی حرکت درد کی شدت کی وجہ سے بند ہو جائے گی۔ یا میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ اصل واقعات شاید اتنے تکلیف دہ نہیں تھے، جتنی اُن کی یادیں۔ یادیں جو مکمل درد بن کر میری ہستی پر اُس وقت اس طرح چھائی ہوئی تھیں، جیسے شدید سردی کے موسم میں کسی آدمی پر اچانک ٹھنڈے پانی کا گھڑا انڈیل دیا جائے۔ بس مجھ میں اور زیادہ سوچنے کی ہمت نہ تھی۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک اب بھی میرے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنی توجہ دوسری طرف کرنے کے لیے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صرف چھ بج کر تین منٹ ہوئے تھے۔ پورے تین منٹ بھی نہیں۔ سیکنڈ کی سوئی ابھی دس کے

ہندسے کے اوپر ہی سے گزر ہی رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ میں اتنی باتیں سوچ رہا تھا۔ اتنے سارے دکھوں کا بوجھ ایک ساتھ محسوس کیا تو وقت گزرنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ٹک ٹک ٹک۔ گھڑی برابر چل رہی تھی۔

اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی نے دروازہ کھولا۔ سنتوش اور اس کی بڑی بہن پُشپا تھیں۔ سنتوش نے کرسی پر بیٹھتے ہی میری بیوی کی طرف نوٹوں کی ایک گڈی بڑھاتے ہوئے کہا "بھابی۔ یہ دو سو روپے ہیں۔ آپ کی کمیٹی نکلی ہے۔"

"کمیٹی۔ لیکن ہم نے تو کوئی ڈالی نہیں۔" ہم دونوں میاں بیوی نے ایک ساتھ حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے ڈال دی تھی اپنی طرف سے" سنتوش کہنے لگی "پچھلے دو مہینے سے میں آپ کی طرف سے دس دس روپے ماہوار کمیٹی میں ڈالتی رہی تھی۔ سوچا تھا۔ ابھی آپ کا ہاتھ تنگ ہے۔ کیا پیسے مانگوں۔ اب آپ دس دس روپے مہینہ کر کے دیتے رہیے گا۔ پتہ بھی نہیں چلے گا۔" ہم محلے والے اکثر دس دس روپے جمع کر کے کسی ایک کو دے دیتے ہیں۔ اس طرح باری باری ہر ایک کو اکٹھی رقم مل جاتی ہے۔

اس دن ایک ساتھ اِتنی رقم مل جانے سے ہم دونوں میاں بیوی خوش ہو گئے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں جس قدر ذہنی طور پر پریشان تھا۔ اتنی ہی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ میری بیوی رسوئی میں چائے بنا رہی تھی کہ پھر دستک ہوئی۔ اب کی رمیش، رمیش کی بیوی، کانتا اور نردیو تھے۔ رمیش نے کمرے سے ہی آواز دیتے ہوئے کہا:

"بھابی آج آپ کو دو سو روپے ملے ہیں۔ مبارک ہو۔"

اتنے میں پھر دستک ہوئی۔ اب کی لیلا آئی تھی۔

میری بیوی چائے کا پانی انگیٹھی پر رکھ کر لوٹی تو لیلا نے پرشاد بانٹنا شروع کیا۔ وہ ابھی ابھی سومناتھ کے درشن کر کے لوٹی تھی۔ کہنے لگی۔ وہاں کا پرشاد ہے۔ لیلا نے ہر ایک کو چلغوزے، بادام، پستے، ہری الائچی وغیرہ کا ملا جلا پرشاد دیا۔ پرشاد لیتے ہی کوئی تو انگلیوں میں دبا کر چلغوزے توڑنے میں مصروف ہو گیا اور کوئی دانتوں تلے دبا کر بادام توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین منٹ تک جب کوئی بھی کسی چیز کو توڑ کر نہ کھا سکا تو کچھ لوگ سمجھ گئے کہ اس میں ضرور کوئی شرارت ہے۔ میں ابھی تک سر نیچا کیے چلغوزے کو دونوں انگلیوں میں دبائے ناخن سے چھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اس طرح چلغوزے سے اُلجھا دیکھ کر سب کے ملے جلے قہقہے سے سارا کمرہ گونج اٹھا۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ یہ سُوکھے پھل لکڑی کے بنے ہیں۔ میری ہنسی بھی سب کی ہنسی کے ساتھ شامل ہو گئی۔ لیلا مزے لے لے کر اور ہنس ہنس کر سب کو بتا رہی تھی کہ کیسے وہ کن کن لوگوں کا اس طرح مذاق اڑا چکی ہے۔ نردیو کو بہت سی بھانڈوں کی نقلیں یاد ہیں۔ اس نے اتنی عمدہ عمدہ نقلیں اتاریں کہ ہنستے ہنستے سب کے پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ چائے پیتے ہوئے بھی نقلوں کا سلسلہ جاری رہا۔

جب سب لوگ چلے گئے تو کمرے میں پھر پہلے کی سی خاموشی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک پھر میرے کانوں میں سنائی دی۔ میری بیوی نے کہا:

"جلدی جلدی کھانا کھا لیا جائے۔ نو کب کے بج گئے۔ گڈی تو سو بھی گئی ہے۔"

"نو" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ "ابھی نو نہیں بجے ہوں گے۔"

لیکن گھڑی پر نظر پڑتے ہی میں حیران ہو گیا۔ واقعی نو بج چکے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ ہم لوگ قریب تین گھنٹے خوش گپیوں میں مشغول رہے۔

اور میں نے سوچا کہ دکھ کا وقت تو کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ پہلے تین منٹ بیتتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے تین صدیاں بیت گئی ہوں اور اب پتہ بھی نہیں چلا تھا کہ تین گھنٹے کیسے بیت گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وقت پر لگا کر اڑ گیا ہو۔ لیکن گھڑی تو ایک ہی رفتار سے چل رہی تھی۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک.......

من مانی

محسن شمسی

پہلی بار جب اس نے اسے دیکھا تو وہ بیٹھی عبادت کر رہی تھی۔ اسے ہنسی آگئی، ایسی ہنسی جس میں افسوس اور رحم دونوں کے عنصر شامل تھے اور اس نے سوچا "عبادت تو وہ کرتے ہیں جنہیں دنیا سے کچھ نہیں ملتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی اَن دیکھی طاقت سے مانگتے ہیں مگر یہ لڑکی تو ایسی ہے کہ اس کے ایک اشارے پر دنیا کی نعمتوں کے ڈھیر لگ جائیں۔ اس کے پاس تو خود آنا ہے کہ وہ ملکاؤں کی طرح دوسروں کو زندگی کی خوشیاں بخشے۔ ان خوبصورت ہونٹوں کی مسکراہٹ، جسے دیکھ کر غم سے بھری دنیا مسکرا اٹھے۔ یہ حسین چمکتی آنکھیں کہ جس طرف یہ نظریں اٹھ جائیں وہ گوشہ چمک اٹھے۔ چہرے کا یہ دلکش رنگ کہ جسے دیکھ کر شفق بھی للچا اٹھے۔ اس خوبصورت پیکر کو تو دنیا کے لطف اٹھانے چاہئیں۔ یہ یہاں بیٹھی الٹی سیدھی دعاؤں میں کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہے زندگی کے لطف بھلا کہیں دعاؤں سے بھی حاصل ہوتے ہیں" وہیں کھڑے کھڑے اس نے سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ اس کا دوست سامان رکھوا کر اندر آگیا۔

"لو بھئی ان سے ملو۔ یہ ہیں میری شریکِ حیات اور میں ہوں ان کا شریکِ موت...... اور یہ ہے میرا دوست....."

اس نے مدھم سی آواز میں اسے خوش آمدید کہا اور پھر مہمان کے لیے انتظام کرنے کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ وہاں چھٹیوں کو تفریح میں گزارنے آیا تھا اور دوسرے ہی دن سے اس نے تفریح کرنے کے مواقع تلاش کرنے شروع کر دیے۔ دوست کے دفتر چلے جانے کے بعد وہ گھر میں اکیلے رہ جاتے مگر اس کے خیال میں اس کے دوست کی یہ بیوی جسے وہ بھابی کہتا تھا باوجود خوبصورت ہونے کے بڑی بور تھی۔ صبح کو عبادت، دوپہر کو عبادت، شام کو عبادت، وہ اس کی عبادت گزاری سے تنگ آکر کہتا کہ کس مصیبت میں پھنس گیا مگر اس کی حُسن پرست آنکھوں کو اپنی پسندیدہ چیز مل گئی تھی اور وہ برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑ کی اس حسین چوٹی کو گرم آتشدان پر ترجیح دیتی تھیں ——— اور پھر ان معاملوں کے اس کے اپنے اصول تھے اور وہ سماجی رشتوں کی بندشوں کو بالکل نہ مانتا تھا۔

تو شروع شروع میں وہ اس عبادت پر ہنستا رہا۔ اسے اپنے پُرکشش مردانہ چہرے پر بڑا اعتماد تھا اور اس کے اس حد سے بڑھے ہوئے اعتماد کی وجہ اس کے پچھلے کامیاب تجربات تھے۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتا یا وہ اس کے کمرے میں چلی آتی اور وہ دونوں باتیں شروع کر دیتے۔ چند دن تک ایسا ہوتا رہا اور پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سے باتیں بھی کرتی جاتی ہے اور گھر کے

انتظامات بھی کرتی جاتی ہے یا سلائی کرتی رہتی ہے یا موزے بننے اور ترکاری کے چھلکے اتارنے جیسا کوئی غیر رومانی کام۔ اس نے ذومعنی جملوں میں ڈھکے چھپے اشارے بھی کیے۔ کئی دفعہ پھولوں کی خوشبو سے معطر، نیم اندھیرے کمروں میں ہلکے سُروں والی موسیقی کے درمیان لمبی بات چیت ہوئی مگر ایک دفعہ بھی تو وہ محسوس نہ کر سکا کہ اس کی آنکھیں کسی خاص ترنم میں ڈوب گئی ہوں یا اس کی آواز میں کوئی نیا اتار چڑھاؤ محسوس ہوا ہو یا کبھی بھی جذبات سے وہ ذرا سی بھی مضطرب نظر آئی ہو۔ وہی پرسکون واضح آواز تھی۔ وہی ٹھہری ٹھہری نظریں اور وہی مطمئن انداز۔ اور اسے جھٹکا سا لگا اور اس نے سوچا کہ وہ ساری لڑکیاں جو اس کی محبت کی قسمیں کھاتی رہی ہیں، اس سے راتوں کی نیند اڑ جانے کی شکایت کرتی رہی ہیں سب بے وقوف تھیں اور اپنے ساتھ وہ اسے بھی بے وقوف بنا گئیں اور پھر اس نے سوچا، "غیر آدم خور شیر خود بخود آدمی کو نہیں چھیڑتے" اور دوسرے دن اس نے اسے عبادت کے لیے جاتے ہوئے راستے میں روک لیا۔

"یہ پھول دیکھتی ہو؟" اس نے اپنے کوٹ کے کاج کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں یہ بڑا پیارا ہے۔"

"مگر اس میں ابھی خوشبو نہیں آئی اور اس کے رنگ ابھی ہلکے ہیں۔"

"تو تم اسے کیوں توڑ لائے، اس کو پنپنے، رنگ اور خوشبو حاصل کرنے کا موقع کیوں نہیں دیا؟"

"یہ مجھے بہت اچھا لگا۔ ایسا لگا جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو کہ مجھے توڑ لو۔"

"ہوں...... مجھے معلوم ہے بعض پھول رنگ اور خوشبو سے محروم ہی رہتے ہیں۔"

اس نے پھول پر نظر ڈالی وہ مرجھا گیا تھا اور اس کے کوٹ کے کاج میں گردن جھکائے ایک طرف لٹکا تھا۔ قدموں کی آواز پر اس نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ وہ جا رہی تھی۔ اس کی پتلی کمر چلنے میں لچکی جا رہی تھی اور رکوعوں کو چھوتی لمبی چوٹی اچھل اچھل کر دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں یہ تصویر لیے واپس چلا آیا اور پھر وہ آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور رکوعوں پر جھولتی ہوئی اس چوٹی کی تصویر اس کی نظروں کے سامنے آ گئی اور وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

اور پھر جیسے کوئی اسے جگا کر کہیں اور لے آیا۔ ایسا لگا کہ وہ اپنی زندگی کی ساری گہما گہمی کے درمیان ہے۔ چاروں طرف جذبات اکسا دینے والی موسیقی ہے۔ ساتھ ناچتے ہوئے قدموں کی تال ہے۔ ہونٹوں کی سرگوشیاں ہیں۔ شراب کے بھبکوں میں ڈوبے بک بک جاتی وعدے ہیں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ سے اُبھرتی بوسوں کی آواز ہے۔ چاروں طرف ایک پُراسرار سرسراہٹ ہے جیسے کوئی پردے کے پیچھے کپڑے تبدیل کر رہا ہو اور جیسے اسے سہارا مل گیا۔ وہ خوش ہو گیا کیونکہ وہ ان آوازوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس شور میں اس نے زندگی کو خوب اچھی طرح ٹٹول ٹٹول کر دبا دبا کر دیکھا تھا۔ وہ اس شور اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیت سے چمٹ جانا چاہتا تھا۔ اس نے اب تک یہی کیا تھا اور ان ہنگاموں میں رہتے رہتے اسے ان کی عادت ہو گئی تھی۔ ایسی عادت جو اپنے پرانے تکیے کی ہو جاتی ہے اور اس طرح سے وہ ان ہنگاموں کے بغیر بے کلی محسوس کرتا تھا۔

اور پھر اسے ایک بار ایک سائرن سنائی دیا۔ بہت مختلف، اس کے لیے بالکل نیا۔ اس شور میں جیسے دبا دبا سا اور اس کے تصور پر چھائے ہوئے جذبات اکسانے وہ کولھے اور ان پر ناچتی وہ چوٹی جیسے فضاؤں میں تحلیل ہونے لگے۔ اس کے دل میں جمے برف کے ٹکڑے پانی بن بن کر بہنے لگے۔ یوں لگا کہ وہ چوٹی اور وہ کولھے تحلیل ہو کر ایک خوشبو بن گئے ہوں۔ وہ خوشبو جو

یہاں سے وہاں اس کے آس پاس چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پھر یوں لگا کہ یہ خوشبو ان پھولوں میں سمائے جا رہی ہے جو خوش نما تو ہیں مگر بُو سے محروم ہیں اور چاروں طرف پھیلے ہوئے یہ پھول اس خوشبو کو پا کر اور زیادہ خوش رنگ ہو گئے اور ایسے پھول بن گئے جو صرف مقدس قدموں میں بچھانے کے کام آتے ہیں اور پھر آس پاس کا سارا شور غائب ہونے لگا جیسے فتح مندوں کو آتا دیکھ کر شکست خوردہ جھینپ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ ساری آوازیں جن کو اس کے کان اچھی طرح پہچانتے تھے کھو گئیں گم ہو گئیں اور پھر جیسے وہ نئی آواز چاروں طرف چھا گئی۔ اس آواز میں کوئی اضطراب نہ تھا۔ کوئی الھڑ چنچل پن نہ تھا۔ اس میں ایک من موہنی کشش تھی اور اس ٹھہری ٹھہری پُروقار گمبھیر آواز میں ایک وعدہ تھا ابدی سکون کا، جیسے محبت جو تخلیق سے وابستہ ہے مجسم آواز بن گئی ہو اور پھر اسے ایسا لگا کہ سنہری دھوپ ہرے ہرے درختوں پر چمک رہی ہے۔ پھول معطر ہوا میں اپنے سر ہلا رہے ہیں اور رنگ برنگی تتلیاں ان کے چاروں طرف ناچ رہی ہیں۔ سامنے صاف شفاف پانی سے لبریز ندی گنگنا رہی ہے اور اس میں تیرتی ننھی ننھی مچھلیاں ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ دور پہاڑی کے پیچھے ہمیشہ چھائی رہنے والی قوسِ قزح جھانک رہی ہے اور پرندے اپنی اپنی بولیوں میں امن اور چین کے پیغام سُنا رہے ہیں —— یہ دنیا بڑی رنگ برنگی تھی یہاں بڑا سکون تھا۔ بڑا آرام تھا۔ یہاں سب مطمئن تھے، سب فارغ تھے۔ یہاں غصّے، لالچ، جلن اور نفرت کا کسی کو پتہ تک نہ تھا نہ ہی کسی قسم کی کوئی اضطرابی کیفیت طاری ہوتی تھی مگر یہ دنیا اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ اپنے آپ کو پہچان نہ پا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بدل گیا ہو۔ جو کچھ وہ تھا اس کے علاوہ کچھ اور بن گیا ہو مگر کچھ اور کیا؟ اور یہ وہ نہ جانتا تھا اور وہ گھبرا گیا۔ وہ تو بدلنا نہ چاہتا تھا جہاں اتنے دنوں سے وہ زندگی گزارتا آیا تھا اسے بھلا کیسے چھوڑ دیتا۔ اس کی وہ زندگی، اس کے مزے، اس کی تفریحات اور ان کے فضول لوازمات، یہ ساری چیزیں اب اس کے لیے ایک ناقابلِ تردید ضرورت تھیں، انھیں چھوڑ کر اب وہ اس نئی اجنبی دنیا میں کیسے آ سکتا تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ وہاں بیٹھی بلند آواز سے اپنی مقدس کتاب پڑھ رہی تھی۔

اور پھر اسے بڑا شدید غصّہ آ گیا اور جھنجھلاہٹ میں بے قابو ہو کر وہ اس کے پاس چلا گیا۔

"اتنے زور زور سے کیوں چیخ رہی ہو؟"

"کیا ہوا!! میں تو پاک کتاب پڑھ رہی ہوں، بنانے والے کی عبادت کر رہی ہوں۔"

"ہونہہ! بنانے والے کی عبادت، دل کا دھوکا۔ اس سے کسی کو کبھی کچھ ملا بھی ہے؟"

"وہی تو دینے والا ہے۔ وہ سب کو دیتا ہے۔ دیر یا سویر —— اور پھر سکون سے بڑھ کر کون سی نعمت ہے؟"

"ہوگی۔ مجھے ان ڈھکوسلوں سے کبھی سکون نہیں ملتا۔ میرے دکھوں کا علاج یہ نہیں۔ اگر وہ ہے تو کیوں میرے دُکھوں کا علاج نہیں کرتا۔ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟"

"ہائے ہائے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں —— کیا آپ ناستک ہیں؟"

"مجھے یوں گھور گھور کر نہ دیکھو۔ میں ناستک نہیں ہوں —— اور اگر ہوں بھی تو کوئی چڑیا گھر کا جانور تو نہیں یا میری چار ٹانگیں اور پانچ ہاتھ تو نہیں۔"

وہ نظریں جھکا کر نیچی آواز سے پڑھنے لگی اور وہ جھلایا ہوا واپس چلا آیا اور پھر اس نے اپنی کمزوری محسوس کی۔ وہ اس

کمزور سی عورت سے جھلانے کیوں لگا ہے۔ یہ نازک سی عورت جو ہر وقت اپنے خدا اور بھگتی میں ڈوبی رہتی ہے اس کے سامنے جاکر اس کے اعتماد کو کیا ہو جاتا ہے۔ وہ بھول کیوں جاتا ہے کہ وہ دل والوں کی محفلوں کا شہزادہ ہے اور پھر ایک زبردست شبہ نے اس کے دل میں سر اٹھایا "کہیں وہ عشق میں تو مبتلا نہیں ہو گیا" اور مجرا سامنہ بنا کر اس نے اپنے پاؤں کو زمین پر پٹخا "اب کیا وہ اتنا گر جائے گا کہ سولہ سترہ سال کی چھوکریوں کی عادتیں اور مشغلے اپنا لے گا" اس نے دل میں اٹھتے ہوئے شبہوں کو دبا دیا اور اپنے غرور کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ اور سوچنے لگا اور پھر اسے خیال آیا کہ آج اس نے خلافِ عادت صنفِ نازک سے بدتمیزی سے بات کی تھی۔ تو کیا وہ اس سے معافی مانگے۔

مگر اس سے پہلے ہی وہ کھانے کے لیے بلانے آگئی اور کھانے کی میز پر خود اس نے ہی معذرت کی کہ وہ آئندہ اپنی کتاب زور زور سے نہیں پڑھا کرے گی، اور اسے اپنے حلق میں نوالہ اٹکتا ہوا محسوس ہوا اور کھانے پر وہ اپنی شادی کے شروع کے دنوں کے قصے سناتی رہی۔ اپنے شوہر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا اور کھانا ختم کرتے ہی اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے لیے بہت سے رسالے کمرے میں لائی مگر وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا اور اس کو سوتا سمجھ کر اس نے آہستہ سے رسالے میز پر رکھ دیے، ریڈیو کو بند کر دیا اور دبے پاؤں باہر چلی گئی۔ وہ دل ہی دل میں تلملاتا رہ گیا۔ یہ چاؤ یہ خدمت، یہ توجہ! اس کا تو وہ عادی نہ تھا۔ لڑکیوں کو جفاکار، خود پسند، مغرور، شوخ وشنگ اور بے وقوف ہونا چاہیے۔ یہ خدمت گزاری، یہ دھیمے دھیمے دل میں اُترتے جانے اور آہستہ آہستہ کسی کے دل و دماغ میں سموجانے کی کیفیت سے تو وہ واقف نہ تھا۔ اس کی چاہت تو آوارہ اور عیاش نگاہیں تھیں جن میں غلام بنانے کی خواہش ہو اور جو چاروں طرف مسکرا مسکرا کر دعوت دیتی نظر آئیں نہ کہ یہ شرم بھری نگاہ جو اپنی الفت سے پتھر کو پگھلاتی تھی۔

رات کے کھانے پر اس کا دوست اپنی شادی کے قصے سناتا رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو شادی کا ذکر کرکے چھیڑتے رہے گویا اعلان کرتے رہے کہ ان کی زندگی بے حد پُرسکون اور مکمل ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات میں بھی اپنے شوہر کا کتنا خیال رکھتی تھی اور کھانے کے بعد اس کے کمرے میں آکر اس کے دوست نے پوچھا کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں، تو وہ بھنا اٹھا۔ کتنی چالاک تھی یہ عورت، گویا برف کی سل اس کے سینے پر رکھ کر اپنے شوہر سے پچھواتی ہے کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں۔ اس نے بڑے اخلاق سے اپنے آرام سے ہونے کا اعلان کیا۔

اور رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اس نے سوچا کہ وہ کیا کرے آخر، اس کے دل میں جیسے کوئی گرہیں لگاتا جا رہا تھا۔ کوئی آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کو جیسے ریشم کی نرم چادر سے ڈھانپتا جا رہا تھا اور جو حصہ اس چادر میں چھپتا جا رہا تھا وہ اس پُر سحر چادر کے مس سے بدلتا جا رہا تھا۔ تو وہ اس سحر کو توڑ ڈالے، وہ اس تقدس اور پاکیزگی کو ختم کر ڈالے جو اس کی معصیت کے درپے تھی؟ اور اس نے سوچا کہ وہ اسے اپنی دنیا دکھائے گا اور وہ نہیں دیکھے گی تو اسے اس کا جسے وہ گناہ سمجھتی ہے مزا چکھائے گا۔ اسے بتائے گا کہ فضول اصولوں کے پیچھے وہ زندگی کی کیسی لذتیں کھو رہی ہے۔

اور دوسری صبح جب وہ گھر پر اکیلے رہ گئے تو وہ مکمل ارادہ کرکے اس کے کمرے کی طرف چلا مگر اس کے باوجود بیچ میں ایک دفعہ پھر اٹھتے ہوئے قدم رک گئے اور اس کے چہرے پر شدید ترین الجھن کے آثار نمایاں ہو گئے —— اور پھر اس نے

اپنی بکھری ہوئی طاقتوں کو ایک بار پھر جمع کیا۔ اگر وہ تقدس کے اس سحر کو نہیں توڑتا تو اس کی اپنی معصیت کس طرح زندہ رہ سکتی ہے۔
کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ پیٹھ دروازے کی طرف کیے وہ کسی کام میں مصروف ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے گردن گھما کر دیکھا "آئیے! آجائیے۔ میں آپ کے پاس آنے ہی والی تھی۔ واقعی اکیلے میں آپ گھبرا جاتے ہوں گے۔ ریڈیو کا بھی تو وقت نہیں ہے۔ اچھا بتائیے آج کھانے میں آپ کے لیے کیا پکایا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ اور وہ بالکل بھائیوں کی طرح ہیں۔ دیکھئے اگر آپ بلا تکلف نہیں بتائیں گے تو آپ کو پورا آرام کس طرح ملے گا؟ اب آپ یہاں آئے ہیں تو کم از کم سات آٹھ پونڈ وزن تو بڑھنا ہی چاہیے۔"

وہ سٹپٹا گیا۔ اتنی شدید قسم کی معصومیت اور یہ گھریلو قسم کی محبتیں۔ ان گھریلو قسم کی محبتوں سے دراصل وہ بالکل ناآشنا تھا اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا بات کہنی مناسب ہوتی ہے۔ اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک مشفق مسکراہٹ تھی۔ اس نے اس کی آنکھوں کو دیکھا وہاں وفاداری تھی اور دوستی، اور وہ بھول گیا کہ وہ وہاں کس ارادے سے آیا تھا اور وہاں بیٹھ کر اس سے گھریلو قسم کے انتہائی غیر رومانٹک مسائل پر باتیں کرنے لگا۔ ایک لمحے کو بھی تو اس نے اپنے اعصاب میں کوئی تناؤ نہ محسوس کیا اور ایک گھنٹے تک وہاں باتیں کرتے رہنے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو پہلی دفعہ اسے یاد آیا کہ وہ مٹ چکا تھا۔ اس کے سامنے جا کر اس کی قوتِ ارادی بے کار ہو جاتی تھی۔ اس نے اپنی چمکیلی دنیا کے لیے جو اصول بنائے تھے وہ سارے کے سارے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ وہ اس سحر کو ختم کرنے میں ناکام رہا تھا جو آہستہ آہستہ اسے ختم کر رہا تھا۔ وہ تقدس جو آہستہ آہستہ اس پر اثرانداز ہو رہا تھا اور اس آہستہ آہستہ کی موت سے بچنے کی صرف ایک راہ تھی۔

وہ وہاں سے بھاگ نکلا اور بھاگ کر اس نے اپنی پرانی زندگی کی گہما گہمی میں پناہ ڈھونڈی۔ اس جانی پہچانی زندگی میں جس کے ہر موڑ سے وہ پوری طرح آشنا تھا۔ وہ زندگی جہاں اس نے اپنی شخصیت کو تعمیر کیا تھا۔ وہ ماحول جس میں اس نے اپنے آپ کو فٹ کیا تھا اور اس خیال سے اسے ذرا سکون ملا کہ وہ زیرو درجہ حرارت کی اس عورت سے اب دور ہے جو اپنی ٹھنڈک آہستہ آہستہ اس کی ہڈیوں میں اتارتی جا رہی تھی۔ اب وہی پرانی عیاشی کی محفلیں تھیں وہی رات دن کی آوارہ گردی، کلچرل پروگراموں کے انتظامات اور رنگین مزاج عورتوں سے چٹپٹے جملے بازیاں۔ وہ ان میں گم ہو جانا چاہتا تھا اور چند دنوں کے لیے وہ ان میں گم ہو گیا۔

مگر اب بھی رات کو سونے سے پہلے اونگھتے ہوئے اسے لگتا تھا کہ کوئی دھیمی آواز سے کھانے کے لیے پوچھ رہا ہے۔ کسی کی آواز کا جادو ہے جو کانوں سے ہوتا ہوا دل و دماغ پر چھاتے جا رہا ہے اور وہ آنکھیں بند کر کے جلدی سے سونے کی کوشش کرتا اور پھر اسے لگتا کہ کوئی چپکے سے کمرے میں آ کر بجتے ہوئے ریڈیو کو بند کر رہا ہے، جلتی ہوئی بتی کو بجھا رہا ہے۔ اب وہ جاننے لگا تھا کہ کمرے میں بڑی بے ترتیبی ہے۔ اس کی قمیص کے بٹن غائب ہیں اور اس کے کپڑوں پر صحیح استری نہیں اور ان خیالات سے فرار کے لیے اس نے اپنے آپ کو اور زیادہ محنت سے اپنی تفریحات میں ڈبو دیا۔ اس کی زندگی اب تک ایک خاص دائرے میں مقید تھی اور اس دائرے میں تیز یا آہستہ دوڑنے کا نام اس نے محنت اور کوشش اور تدبیر اور سکون و خوشی رکھ لیا تھا۔ پر سکون کہاں تھا۔ وہ ساری جگہیں جہاں وہ سکون ڈھونڈا کرتا تھا اب بیکار ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہر نئی چیز چند دنوں میں پرانی ہو جاتی اور بے حد فضول و بے کار لگنے لگتی جیسے شام کے وقت صبح کا اخبار یا جلسہ ختم ہو جانے کے بعد جلسے کا پنڈال۔ اس نے اپنی اس الجھن کا رخ اپنے اندر کی طرف کر لیا اور

اس پر خاموشی کے سائے بڑھنے لگے۔

اور ایک دن اس کی تازہ ترین دوست نے ریسٹورنٹ میں اسے ٹوکا کہ وہ آخر کس خیال میں کھویا ہوا ہے اور جب اس نے اس بے توجہی کی شکایت کرتے ہوئے اس سے مذاقاً کہا کہ کہیں وہ کسی اور حسینہ کے خیال میں تو نہیں گرفتار ہے تو ایک دم سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ وہ پردہ جو اس نے اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے اپنی آنکھوں کے سامنے ڈال رکھا تھا سامنے سے ہٹ گیا اور اسے لگا کہ وہ اب تک دل میں ایک نامعلوم سا درد لیے پھر رہا تھا۔ وہ درد جو متعین نہیں کیا جا سکتا۔ واضح طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بس ہلکا ہلکا سا احساس تھا جو بیک وقت تکلیف دہ بھی تھا اور مسرور کن بھی۔ اسے سردیوں میں گرم پانی سے نہانا یاد آگیا جب گرم پانی کی ایک بوند چہرے سے بہتی ہوئی سارے جسم سے گزر جاتی تھی اور سردی کے احساس سے سارا جسم سکڑ کر رہ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی جسم کے سارے مسام کھل کر بوندوں کے اس سیلاب میں ڈوب جانا چاہتے تھے اور وہ جلدی سے بہت سارا پانی اپنے سر پر ڈال لیتا تھا۔ اسے مسکراتی ہوئی عورتوں کے برہا کے غمگین گانے یاد آگئے۔ درد میں ڈوبی لے جس میں پرانی دنیا سے چھٹنے کا غم بھی چھپا ہوتا اور محبت کی خوشی سے بھرپور نئی دنیا میں پہنچنے کی مسرت بھی۔ یہ درد بھی کچھ ایسا ہی تھا جس سے گھبرا کر دل بھاگنا بھی چاہتا تھا اور جس میں دل ڈوب جانا بھی چاہتا تھا اور یہ درد اسے بے حد عجیب معلوم ہوا۔ پھلجڑیوں جیسے بخاروں، تپے ہوئے چہرے کو خنک ہوا کا ایک جھونکا چھو جاتے۔ وہ سوچتا تھا کہ جس کی زندگی شعلوں سے کھیلتے گزر گئی ہو اس پر بجھے ہوئے شعلوں کی راکھ کا کیا اثر ہوگا۔ اس نے راکھ کو بکھیرنے کی کوشش کی۔ راکھ تو بکھر گئی مگر ایک چنگاری معمولی سی اٹھی۔ بہت معمولی سی، جس کی زندگی لمحوں سے بھی کم ہوتی ہے اور اچٹ کر اس کے دل میں چپک گئی۔ نہ معلوم اس دل میں کیا تھا کہ وہ چنگاری بجھ نہ سکی اور نہ جلتی رہی اور دل کو جلاتی رہی اور دل جو جل کر، بجھ کر پھر جل کر پھر بجھ کر کالا ہو چکا تھا جوان شعلے کی طرح دہکنے لگا۔ یہ دل جو لوچدار جسموں اور چھوتے ہوئے سینوں سے مل کر ناچتے ہوئے خمدار ہونٹوں کے معطر سانسوں کے درمیان آس پاس کو بھولتے ہوئے، خوبصورت بانہوں کو اپنے گلے کے گرد جھولتے ہوئے بھی ویسا ہی بے جان، ویسا ہی بجھا ہوا رہتا تھا یکلخت زندہ ہو گیا جیسے برسات کے معمولی چھینٹے سے گرمی کی ماری مردہ زمین میں جان پڑ جاتی ہے۔

اور یہ نئی زندگی پا کر اس نے اپنے آس پاس نظر دوڑائی۔ اسے چاروں طرف ایک نئی دنیا دکھائی دی۔ ایک نئی دنیا جس میں ہر طرف نئے نئے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اسے معلوم ہوا کہ اب تک وہ آنکھیں بند کیے اپنے آس پاس کو نابیناؤں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر صرف اندازے سے ہی پہچانتا رہا ہے اور اب اسے اپنے دل و دماغ میں آنکھیں ہی آنکھیں پیدا ہوتی معلوم ہوتیں۔

اسے لگا سنہری دھوپ ہرے درختوں پر چمک رہی ہے۔ پھول معطر ہواؤں میں اپنے سر ہلا رہے ہیں اور رنگ برنگی تتلیاں ان کے چاروں طرف ناچ رہی ہیں۔ سامنے صاف شفاف پانی سے لبریز نہر گنگنا رہی ہے۔ اس کے پانی میں جو دودھ کے مزے کا ہے ننھی ننھی مچھلیاں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ قوسِ قزح پہاڑی کے پیچھے سے جھانک رہی ہے پرندے چہچہا رہے ہیں۔ اس جگہ شہد کی مکھیوں کی آواز بھی ایسی ہے جیسے ستار پہ کوئی دُھن بج رہی ہو اور چاروں طرف لوگ ہیں جو پُر خلوص ہیں اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ہے اور وہ مصیبت میں کام آنے والے ہیں اور ان کی دوستی دُکھ اور سُکھ دونوں میں یکساں رہتی ہے۔ یہ بڑی خوش رنگ دنیا تھی۔ یہاں بڑا سکون تھا بڑا آرام تھا۔ یہاں سب مطمئن تھے، سب قانع تھے۔ یہاں کسی کو غصہ، جلن، لالچ اور نفرت کا پتہ تک نہ تھا اور یہاں کوئی اضطرابی

کیفیت نہیں طاری ہوتی تھی —— اور اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے ایسا ہی محسوس کیا تھا۔

اور پھر ایک دم سے ریسٹورنٹ کے ہال کی بتیاں بجھ گئیں اور طاقتور سرچ لائٹ کی روشنی میں چمکتی میزوں کے درمیان ایک نیم عریاں لڑکی اپنے جسم اور آواز سے لوگوں کے جذبات کو اکساتی چلی آئی۔ اس کے پاس بیٹھی اس کی دوست لڑکی اس کے بازو سے چمٹ گئی اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبانے لگی اور اس نے جیسے حیران ہو کر دیکھا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ یہاں تاریکی تھی اور دھواں تھا، عریاں جنسی جذبات تھے اور خود غرض اور جھوٹی مسکراہٹیں تھیں —— اور طاقتور سرچ لائٹ کی روشنی میں ناچتی ہوئی یہ نیم عریاں لڑکی جس نے پرانی طوائف کی مارکیٹ پر پورا قبضہ کر لیا تھا۔

اور اس نے متحیر ہو کر سوچا —— تو وہ یہاں کیسے آن پہنچا، وہ تو یہاں اجنبی تھا۔ وہ یہاں کسی کو نہ جانتا تھا۔ یہ تو اس کی دنیا نہ تھی۔

اور پھر جیسے اس فضا میں اس کا دم گھٹنے لگا اور پاس بیٹھی ہوئی نہایت نفاست سے کھانا کھاتی لڑکی ایسی عفریت لگنے لگی جو کھانا نہ کھا رہی ہو بلکہ کھانے کی پلیٹ میں رکھے ہوئے اس کے دل و دماغ اور روح کو چھری سے کاٹ کاٹ کر اور کانٹے میں لگا کر آہستہ آہستہ نگل رہی ہو —— اور وہ اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر وہاں سے باہر نکل بھاگا۔

چوبیس گھنٹے کے سفر کے بعد جب وہ وہاں پہنچا تو وہ وہاں بیٹھی اپنی عبادت کر رہی تھی۔ وہ بے جھجک اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور بولا، "بھابی! مجھے بتاؤ تمہاری اس کتاب میں کیا لکھا ہے۔"

آتش فشاں

محافظ حیدر

سبز پشواز پہنتے ہوئے حور بیا کے کانوں میں شہزادی بیا کا فیصلہ گونج رہا تھا اور جس انداز سے شہزادی بیا نے اپنا یہ فیصلہ سنایا تھا وہ بھی انھیں اچھی طرح یاد تھا۔ شہزادی بیا کی میٹھی میٹھی مترنم آواز جس میں ایک خاص قسم کا جذباتی رنگ تھا ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور اُس لہجے میں جو بہت ہی دلکش طور پر ٹوٹا پھوٹا تھا شدت کی یک رنگی پیدا ہو گئی تھی۔ مثلاً "میں وہاں نہیں جاؤں گی" انھیں کہنا ہوتا تو وہ یوں کہتیں "وہ......اب......میں......وہاں......نہیں جاؤں گی میں اب"۔ دوسری لڑکیوں کی رائے میں یوں وہ بنتی تھیں لیکن لڑکوں کا کہنا تھا کہ ان کا ٹوٹا پھوٹا اور بے جوڑ لہجہ بالکل فطری تھا جس سے وہ بڑی بھولی بھالی لگتی تھیں جبھی تو وہ مسحور ہو جاتے تھے اور انھیں ہمیشہ باتوں میں لگائے رکھتے تھے۔ ویسے آواز اور لب و لہجے کے علاوہ ان کی شخصیت اور ان کے سراپا میں کشش اور جاذبیت والی کئی اور چیزیں بھی تھیں۔ وہ صحیح معنوں میں ایک مکمل عورت تھیں، بھوپال کی حسین ترین دوشیزاؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا، اور پھر ان کا خاندان بھوپال کے انتہائی معزز اور دولت مند طبقے سے تھا۔

حور بیا اور شہزادی بیا میں بڑا بہناپا تھا۔ دونوں کے خاندانی مراسم بھی بہت گہرے تھے۔ دونوں کے بنگلے بھی بڑے تالاب کے اس کنارے احمد آباد کے پُرسکون چٹانی علاقے میں قریب قریب تھے۔ دونوں کا سن بھی لگ بھگ ایک ہی تھا۔ بچپن ہی سے ساتھ بڑھیں اور ساتھ پڑھیں۔ جبلپور کے کانونٹ اسکول سے سینئر کیمبرج کیا، وہاں ہوسٹل میں بھی ساتھ رہیں۔ پھر علی گڑھ میں بھی یہی حال رہا۔ دونوں نے عمرانیات میں گریجوئشن کیا۔ پھر بھوپال اپنے اپنے گھر واپس آگئیں۔ اس موقع پر کسی منچلی نے سارے بھوپال میں یہ افواہ اڑا دی تھی کہ ان دونوں نے ایک ہی لڑکے سے شادی کرنے کی ٹھان لی ہے۔ اعلیٰ طبقے کے بعض بگڑے دل نوجوانوں کو اس افواہ کی صداقت ناممکن نہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ بڑی بوڑھیاں کہتی رہتی تھیں آج کل کے زمانے میں سب کچھ ہو رہا ہے اور سب کچھ ہو سکتا ہے جو بھی ہو کم ہے۔

پائنچے کی موریاں چُنتے چُنتے حور بیا چپکے سے اپنے آپ ہنس پڑیں۔ انھیں یاد آیا کہ شہزادی بیا نے پہلی دفعہ جب یہ افواہ سنی تھی تو حور بیا کو گدگدا کر پوچھا تھا "بول۔ سوت بنے گی میری؟"

"تمہاری کوئی بات ٹالی ہے آج تک؟" حور بیا خلوص سے وارفتہ ہو کر بولیں اور شہزادی بیا نے وحشت سے

بھرپور قہقہے لگائے۔

حور بیا اپنی پنڈلیوں پر پشواز کی شکنیں کیا سنوار رہی تھیں گویا ماضی کا ایک ایک ورق الگ الگ کرکے دیکھ رہی تھیں۔ ویسے پرانی یادیں انھیں کئی دنوں سے ستا رہی تھیں لیکن ان یادوں کو چھاننے کی فرصت انھیں آج ہی ملی تھی خاص طور پر وہ شام جبکہ وہ اور شہزادی بیا بھوپال سے پہلی دفعہ علی گڈھ جا رہی تھیں، اسکول کی زندگی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ کالج کی زندگی سامنے نظر آ رہی تھی، لڑکپن کے انداز کا پت جھڑ گذر چکا تھا۔ ذہنی بلوغ کے احساس کی شمع روشن ہو چکی تھی، عجیب شام تھی وہ جب وہ اپنے نئے سفر پر روانہ ہو رہی تھیں۔ خاندان والوں اور جان پہچان والوں سے اسٹیشن بھرا پڑا تھا۔ اعلیٰ طبقے کا ہر ایک نوعمر لڑکا ان دونوں کو امام ضامن باندھنے کے لیے دوسروں پر سبقت کی کوشش کر رہا تھا۔ حور بیا بڑے شوق سے بازو بڑھا بڑھا کر امام ضامن بندھوا رہی تھیں اور ان کو بڑا لطف آ رہا تھا۔ وہ سمجھ بھی رہی تھیں کہ یہ ڈھیر سارے امام ضامن اصل میں ان نوعمروں کے عشق کا چڑھاوا ہیں۔ اتنے بہت سے گھائل دیکھ دیکھ کر ان کے رخسار تمتما رہے تھے جب گاڑی چل پڑی اور دور تک دروازے میں کھڑے کھڑے وہ اسٹیشن کی بھیڑ کو ہاتھ ہلا ہلا کر وداع کرتی رہیں اور اب جب اسٹیشن بہت دور نکل گیا تو اندر پلٹیں، شہزادی بیا پر نظر پڑی، انھوں نے سوائے ایک امام ضامن کے باقی سب اتار کر رکھ دیئے تھے اور ان کی بھیگی بھیگی غزالی آنکھوں میں ڈوبتے سورج کے شرارت سے چھڑکے ہوئے رنگ تیر رہے تھے۔ کچھ شوخ، کچھ اداس، بڑی دلگداز آمیزش تھی۔ حور بیا پاس بیٹھ گئیں۔ پہلی دفعہ شہزادی بیا کو یوں چپ چاپ اور گم سم دیکھا تھا حیرت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر کہا نہ جاتا تھا۔ کہیں تو کیا کہیں۔ گھر والوں کی باتیں کریں، بھائی بہنوں کی، سہیلیوں اور دوستوں کی، بھوپال کی، جبلپور کے کانونٹ کی، علی گڈھ کی، انٹر میں لیے ہوئے مضامین کی، امام ضامن باندھنے والے نوعمروں کی، شفق پر لحہ بہ لحہ بدلتے ہوئے رنگوں کے امتزاج کی، ماضی، حال، مستقبل، یہ، وہ، ہیں، تم، سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کہیں۔ کہنے کو تو اتنی ساری باتیں زبان پر دھری تھیں مگر زبان کم بخت کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔

شہزادی بیا کی پلکوں سے ایک بڑا سا آنسو سنبھالا نہ گیا اور ان کے دہانے کے ایک کونے پر مسکرانے کی کوشش میں لرزش ہونے لگی۔ جو امام ضامن ان کے بازو پر بندھا رہ گیا تھا۔ اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"مجھے...... وہ...... اس سے...... ایسا لگتا ہے...... کہ محبت ہو گئی ہے......"

حور بیا کو محسوس ہوا جیسے وہ طوفان زاد ٹرین یک لخت ٹھہر گئی اور زلزلے کا سا ایک شدید جھٹکا لگا۔ سارے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئے، چنگاریوں کے جگنو ان کی پلکوں پر جھول رہے تھے، اور شوخ نارنجی اور اداس گہرے اودے رنگ ان کی رگوں میں دوڑنے لگے۔

سبز پشواز ابھی ایک پیر میں ہی ٹھیک نہ ہوئی تھی۔ شکنوں کو حور بیا سجا رہی تھیں، انگلیاں اور کلائیاں دکھنے لگی تھیں، پھر بھی وہ یہ سوچ کر مسکرا رہی تھیں کہ اس وقت شہزادی بیا کی محبت کا اعلان کس قدر اچانک تھا۔ طوفان سے پہلے کے سکوت کو انھوں نے اپنے بھولپن سے بھانپا ہی نہ تھا۔ وہ ذہنی طور پر کسی ایسے سمجھوتے کے لیے آمادہ ہی نہ تھیں جس کی رو سے شہزادی بیا ان کے علاوہ کسی اور کی بھی ہو سکتی تھیں۔ شاید اسی لیے اس وقت انھیں اس لڑکے سے جس کا

نام ابھی نہیں سُنا تھا نفرت ہونے لگی کیونکہ اس سے شہزادی بیا کو محبت ہو گئی تھی۔

مگر بہت ہی جلد یہ غبار دُھل گیا۔ حور بیا شہزادی بیا کی ہمدرد بھی بن گئیں، غمخوار بھی بن گئیں۔ شہزادی بیا کو بھی اپنی کم سنی کے روایتی جذباتی روگ میں بڑا اچھا تیماردار مل گیا۔ ان کی ٹھنڈی سانسوں پر حور بیا آنسو بہانے لگتیں اور وہ آنسو بہاتیں تو حور بیا کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔

"اُف۔ حد ہو گئی بیوقوفی کی، کس قدر سیدھے سادھے تھے ہم اُس وقت خدا کی قسم!"

کم سے کم وہ ضرور سیدھی سی تھیں۔ شہزادی بیا صرف دیکھنے ہی سیدھی تھیں لیکن اصل میں چالاک۔ پہلے تو حور بیا نے انھیں بہت سمجھایا کہ کیا پتہ وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے یا نہیں، تم رو رو کر کیوں اس کے پیچھے مری جاتی ہو تو نہایت ہی حزنیہ انداز سے وہ کہہ دیتیں "عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ" اور جب یہ مصرع سُن سُن کر اُن کے کان پکنے لگے تو مشورہ دیا کہ اُس لڑکے کو خط لکھنے کے سوائے اب کوئی علاج نہیں۔ پتہ تو معلوم ہی ہے، فوراً ایک رومانٹک سا ڈرافٹ تیار کیا جائے جس میں غالبؔ اور اختر شیرانی کے اشعار کا مضمون کی مناسبت سے حوالہ ہو۔ شہزادی بیا اس پر بھی تیار نہ ہوئیں۔ کیا خبر واقعی وہ ان سے محبت ہی نہ کرتا ہو، یا جواب میں لکھ دے کہ وہ کسی اور لڑکی سے محبت کرتا ہے، یا جواب ہی گول کر جائے تو ان کی بڑی سبکی ہو گی۔ یہ توہین وہ برداشت نہ کر سکیں گی کیونکہ خاندانی حیثیت سے وہ اس لڑکے سے بلند مرتبہ ہیں۔ اور پھر محبت کا اظہار پہلے لڑکی کی طرف سے ہرگز نہ ہونا چاہیے، فرض کرو اس لڑکے نے انھیں قبول بھی کر لیا تو زندگی بھر دباؤ میں رکھے گا، کہے گا میں کب تم سے محبت کرتا تھا، تم ہی مجھ پر مرمٹیں، اور مجھے پھانس لیا۔ یہ بھی شہزادی بیا کو گوارا نہ تھا۔

ایسی داستانی محبت سے حور بیا کو اُلجھن ہونے لگی۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ کبھی اس قسم کی محبت نہ کریں گی۔ محبت آخر محبت ہے، ہو گئی تو ہو گئی، ظاہر کر دو، جواب مل گیا تو کیا کہنے، نہ ملا تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی، یہ آہیں بھرنے، تارے گننے، اور خط لکھ لکھ کر پھاڑنے کی ہابی انھیں بالکل پسند نہ تھی۔ مگر حسن، دولت اور خاندان کے بارے میں کچھ ایسا احساس کمتری بھی تھا کہ شہزادی بیا کی ان حرکتوں پر ڈانٹنا اور جھڑکنا تو کیا بے چاری سے کبھی ناک بھوں بھی نہ چڑھائی گئی۔

علی گڑھ کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں شہزادی بیا نے بھی دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی شعرا کی غزلوں کے کامیاب شعر نوٹ کر لیے۔ کم بخت نے ایک شعر بھی تو اپنے محبوب کو نہیں لکھا، ہر وقت حور بیا ہی کو سُناتی رہتی۔ یہاں تک کہ حور بیا کو اُردو شاعری سے نفرت ہو گئی۔ ایک دفعہ تو چڑ کر حور بیا کا جی چاہا کہ شہزادی بیا کا جذبہ اُن سے چھین لیں یا اپنی جگہ ان کو رکھ دیں اور ان کی جگہ خود لے لیں اور اُن کے محبوب کی محبت جیت لیں پھر اُن سے کہیں دیکھو محبت اس طرح کرتے ہیں، محبت میں وَن وے ٹریفک نہیں ہوتی، دو دلوں کی کراسنگ اور تصادم ہونا ہی چاہیے۔

یہ بھی خلوص ہی کا ایک پہلو تھا۔ حور بیا کی دِلی خواہش تھی کہ شہزادی بیا کی محبت کامیاب ہو اور وہ اپنے محبوب کو حاصل کر لیں۔ شہزادی بیا نے مستقل طور پر دل میں جو آتشکدہ تعمیر کر لیا تھا اور ہر وقت اس کی آگ میں جلتی رہتی تھیں وہ حور بیا سے دیکھا نہ جاتا تھا۔

"بچاری۔ اذیت کے مارے کیا حال تھا اس کا۔ اور وہ حال دیکھ کر مجھے کتنی اذیت ہوتی تھی۔ توبہ ہے۔"

ایک سال۔

دو سال۔

تین سال۔

پورے چار سال یونہی گذر گئے اور اس اللہ کی بندی نے اپنے محبوب کو پتہ ہی نہ چلنے دیا۔ اُس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ شہزادی بیا اُس سے محبت کرتی تھیں۔ کرسمس کے موقع پر، عید کے دنوں میں، گرمیوں کی اُکتا دینے والی چھٹیوں میں بھوپال دونوں چلی جاتی تھیں اور وہاں شہزادی بیا اپنے محبوب کے ساتھ فلمیں دیکھتیں، پکنک مناتیں، ٹینس کھیلتیں، ڈانس کرتیں، ادبی، سیاسی، اور عمومی بحثیں کرتیں، شکار کو جاتیں لیکن ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا جس سے اُسے اپنی زندگی کی ویران و سنسان اور سیدھی سپاٹ راہ پر ایک خوبصورت سنگِ میل ایک دلکش موڑ دکھائی دینے لگتا۔ اور نہ ہی اس نے کوئی ایسی بات کی جس سے شہزادی بیا کی دھڑکنیں شہنائی کے مدھر سروں میں بدل جاتیں اور ان کے جیتے جاگتے خوابوں کی دنیا بعید ترین کہکشاں میں گم ہو جاتی اور وقت اور فاصلے ایک دوسرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جاتے۔

وقت کے لحاظ سے محبت کے سفر میں شہزادی بیا کو چار سال گذر گئے تھے۔ فاصلے کے لحاظ سے چار سال میں وہ جہاں سے چلی تھیں وہیں پر تھیں۔ اپنے محبوب سے کس قدر قریب ہو گئی تھیں اور پھر بھی اس قدر دُور تھیں۔ ایسی افلاطونی محبت حور بیا نے صرف دقیانوسی کتابوں اور قصوں میں پڑھی تھی۔ یہ محبت ایک حقیقت، اور ایسی بھیانک اور اتنی دُکھ دینے والی ہو سکتی تھی اس کا انھیں یقین ہی نہ ہوتا تھا۔ سوشیالوجی کی گریجوئٹ، روشن خیال، ترقی پسند، آزاد منش، دھواں دھار مقرر، سلجھی ہوئی بحث کرنے والی، انگریزی وضع کے بالوں کی شوقین، مغربی رقص اور کلاسیکی کی دلدادہ، مخلوط محفلوں کی رونق، اپنے محبوب سے اتنا نہیں کہتی "مجھے تم سے محبت ہے۔" بھئی انتہا ہے برداشت کی اور صبر کی معراج ہے۔

یہاں تک کہ شہزادی بیا کی منگنی بہار کے ایک بہت بڑے زمیندار گھرانے کے لڑکے سے ہونے لگی اور کئی روز کی ٹال مٹول کے بعد انھوں نے دل کو مسوس کے ہاں کر دی۔ اور جس روز انھوں نے "ہاں" کی تھی حور بیا "نہیں نہیں" کہتی ہوئی ان سے لپٹ پڑی تھیں اور دونوں مل کر خوب روئی تھیں۔

شہزادی بیا بڑی سج دھج کے دلہن بنیں اور بڑی دھوم دھام سے ان کا نکاح ہوا۔ شادی کے دوسرے روز جب چوتھی کے لیے وہ میکے آئیں تو حور بیا سے انھوں نے اپنی عادت کے خلاف نہایت ہی صاف اور رواں لہجے میں کہا "میں اب وہاں نہیں جاؤں گی حور۔ میں واپس نہیں جاؤں گی۔" اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ روتے روتے التجا کرتی جاتی تھیں کہ ان کے ماں باپ سے کہہ دو وہ اپنے شوہر کے پاس واپس نہیں جائیں گی کیونکہ وہ شادی کے لیے آمادہ ہی نہ تھا اور اس کے ماں باپ نے زبردستی اس کی شادی کی ہے۔ فوراً ان کی طلاق کا بندوبست کیا جائے اور ان کے محبوب کو کسی طرح ہر قیمت پر اُن سے شادی کے لیے تیار کیا جائے۔ وہ اپنے محبوب کی کنیز بن کر رہیں گی اور چاہے وہ اُن سے کیسا سلوک کرے وہ نباہیں گی۔

حور بیا نے خفیہ کارروائی شروع کر دی، شہزادی بیا کے والدین کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، جب انھوں نے حور بیا سے کہا کہ شادی کوئی بچوں کا کھیل تھوڑی ہے، ایسے کیسے طلاق ہوسکتی ہے تو حور بیا نے دانت پیس کر صرف اتنا کہا "آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ طلاق بے حد ضروری ہے۔"

والدین یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ انھوں نے دنیا میں سب کچھ دیکھ لیا ہے اور اب کچھ دیکھنے کی حسرت نہیں رہی مگر اس نئے کھیل کو دیکھ کر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ باپ کے منہ سے بے ارادہ نکلا "اور عزت؟" حور بیا جانے کے لیے گھومتی ہوئی بولیں "عزت کی ضرورت ہی کب ہے؟"

مگر کچھ بھی ہو خاندان کی عزت کا سوال سب سے زیادہ اہم تھا۔ بڑی مشکل سے شہزادی بیا کو منایا گیا کہ ابھی چند مہینے شوہر کے ساتھ کسی طرح گذار لیں پھر سب ان کی مرضی کے مطابق کر دیا جائے گا۔ شہزادی بیا کو ان کے والدین نے بڑی ہنسی خوشی رخصت کیا اور وداعی پر جب وہ حور بیا کے کندھے پر سر رکھے رو رہی تھیں تو حور بیا کے کانوں میں ان کا فیصلہ، ان کی آواز، ان کا لہجہ گونج رہا تھا "میں اب وہاں نہیں جاؤں گی، میں نہیں جاؤں گی۔۔۔۔۔" مگر بچاری کو جانا ہی پڑا۔ وہ چلی گئیں اور آج بھی وہ فیصلہ ان کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

شہزادی بیا کی رخصتی کے بعد ان کا محبوب بھی بھوپال سے یکایک لاپتہ ہو گیا۔

حور بیا نے قیاس آرائی کی کہ شہزادی بیا کے والدین نے انھیں بھاری رقم دے کر بھگا دیا ہوگا ورنہ ان کے لاپتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی۔ سارے بھوپال پر سنسنی کی اوس پڑ گئی۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنا خوبصورت، قد آور، اور مضبوط نوجوان ہوا میں پُراسرار طور پر کیونکر تحلیل ہو گیا تھا۔

وقت کے پہیئے زندگی کی سخت پتھریلی زمین پر اپنے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ نشان اوچھے ہوتے ہیں مگر کہیں کہیں گہرے بھی ہو جاتے ہیں۔ اور یہ گہرے نشان بھی گرد و غبار کی تہوں میں دب دب کر مٹنے لگتے ہیں۔ حور بیا کے ذہن سے کچھ نشان ابھی مٹے نہ تھے۔

حور بیا سے شہزادی بیا شادی کے بعد یوں بچھڑ گئیں جیسے ہوا کے ایک تند جھونکے سے کلی اپنی شاخ سے الگ ہو جائے۔ کتنی دفعہ دونوں نے آپس میں شادی بیاہ سے متعلق باتیں کی تھیں لیکن اس طرف کبھی دھیان نہیں گیا کہ شادیوں کے بعد وہ ایک۔ دوسرے کے بجائے اپنے اپنے شوہروں کی ہو جائیں گی اور اس امکان کو تو سوچا ہی نہ تھا کہ بھوپال سے باہر بھی شادی ہوسکتی ہے اور اس کے بعد دونوں کی جوڑی ٹوٹ جائے گی۔

اور پھر دونوں کی جوڑی ٹوٹ گئی۔ شہزادی بیا اپنے سسرال شہر چلی گئیں۔ ان کے ماں باپ نے بیٹی کی زندگی مسرتوں کی لاش پر خاندانی روایات کی چادر ڈال دی۔ شہزادی بیا بھی آخر اپنے باپ کی بیٹی تھیں، اور پھر اُن کی ضد میں جوانی کی اُٹھان تھی، شادی کے چند مہینوں بعد حور بیا کو ان کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا:۔

"۔۔۔۔۔۔ میں نے ایک بنگلہ کرائے پر لے لیا ہے۔ شوہر سے علیحدہ رہنے لگی ہوں۔ بڑی رنگین محفلیں جمتی ہیں۔ یہاں کی ساری اونچی سوسائٹی جمع رہتی

ہے۔ چند روز کے لیے یہاں ضرور آؤ۔ زندگی کا لطف آجائے گا...... تمہیں یہ
معلوم کر کے بے حد مسرت ہوگی کہ میں امید سے ہوں ...."

یہ سب راز حوربیا کے لبوں پہ ہمیشہ منجمد رہے۔

حوربیا نے خط پڑھتے ہی جواب لکھ دیا کہ وہ موقع پاکر چند روز کے لیے ضرور آئیں گی۔ مگر موقع انھیں ملا نہیں کیونکہ اب خود ان کی شادی کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ شہزادی بیا کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے کچھ بھوپالی خاندان پاکستان سے بھی آئے تھے۔ حوربیا کو ایک لڑکا بڑا بھا گیا جسے انھوں نے کئی سال کے بعد دیکھا تھا۔ دعوتوں اور محفلوں میں وہ لڑکا بھی جو پاکستان سول سروس کا ممبر تھا حوربیا کے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ شہزادی بیا کی رخصتی کے بعد جب ان پاکستانی مہمانوں کے لیے آپسی خاندانی دعوتیں ہو رہی تھیں تو اس لڑکے نے موقع پاکر حوربیا کو شادی کی تجویز پیش کر دی جو انھوں نے پلکیں جھپکا کر اور نظر جھکا کر منظور کر لی تھی۔

جن دنوں حوربیا دلہن بننے والی تھیں شہزادی بیا ماں بننے لگی تھیں۔ اور جب کبھی حوربیا کے ذہن کو ادھر اُدھر سے فرصت ملتی وہ شہزادی بیا کے بارے میں سوچنے لگتا اور فوراً ہی انھیں یہ محسوس ہونے لگتا کہ شہزادی بیا دکھائی دیئے بنا بھرائی آواز میں اُن سے کہہ رہی ہیں "میں اب نہیں جاؤں گی۔ میں واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی......"

(۲)

ایک پائنچے کی موریاں بڑی خوبصورتی سے ٹھیک ہو گئی تھیں۔ حوربیا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ایک ملکے کو بدن سیدھا کیا، پھر وہ دوسرے پائنچے کی خدمت میں لگ گئیں۔

راولپنڈی میں انھیں اپنے ماں باپ کی چٹھیاں جب بھی ملتی تھیں ان میں ایک سوال ضرور ہوتا کہ مہرو بیا کیلئے وہاں کوئی لڑکا ملا یا نہیں اور ہر جواب میں وہ یہی لکھ دیتیں کہ مہرو بیا کے لیے جیسا لڑکا چاہیئے ویسا تو ملتا ہی نہیں۔ جب شادی کے بعد وہ بھوپال سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہو رہی تھیں تو اُن کی ماں نے کہا تھا کہ مہرو کے لیے وہاں لڑکا ضرور دیکھنا اور لڑکے میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں وہ حوربیا کو معلوم ہی تھیں یعنی لڑکا اونچے گھرانے کا ہو، امیر ہو، خوبصورت ہو، صحت مند ہو، تعلیم یافتہ ہو، اور اعلیٰ کردار کا حامل ہو۔ یہ سبھی خوبیاں مہرو بیا میں تھیں۔ شوہر میں بھی ہونی چاہئیں۔ مگر بھوپال والوں میں کوئی خلوص سے اور کوئی حسد سے کہتا کہ ایسا شوہر آج کل کے زمانے میں بھلا کیا ملے گا۔ کرنل نورالمبین خاں کا خیال تھا کہ اُن کی بیٹی وہ چاند کا ٹکڑا ہے کہ ان کی مرضی کا داماد خود ہی اپنی خوش نصیبی کو ڈھونڈتا آئے گا۔ حالانکہ ہندوستان اور پاکستان میں مہرو بیا کے طلبگاروں کی کمی نہیں تھی، مگر ماں باپ کوئی تارہ توڑنے کی فکر میں لگے تھے۔ بھوپال اور بھوپال کے باہر سے کتنے ہی بڑھے چڑھے پیام آئے لیکن کرنل نورالمبین خاں اور سلمہ بیا نے نہ ہاں کی نہ انکار۔ بڑی خوبصورتی سے سب کو لٹکا رکھا۔ اُن کے خیال میں مہرو ابھی سترہ اٹھارہ کی تھیں، جلدی کی ضرورت نہیں تھی، اور ٹھہر جائیں شاید ان سب سے

اچھی بھی کوئی نسبت آئے۔

مہرو بیا حور بیا کی چھوٹی بہن تھیں اور ان سے کوئی پانچ چھ سال چھوٹی تھیں۔ لیکن حسن میں بڑی بہن ان کے آگے بچی لگتی تھیں۔ ان کا اصلی نام مہرالنسا رتھا۔ یہ نام ان کے سراپا کی فصیح ترین ترجمانی کرتا تھا۔ اگر نور جہاں کے بعد کسی کو مہرالنسا رہونے کا حق تھا تو وہ شاید یہی تھیں۔

مرد بچاروں کا تو ذکر ہی کیا عورتیں بھی مہرو بیا کو دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتیں۔ کہیں شادی بیاہ کی تقریب میں جاتیں تو سب دلہن کو چھوڑ کر مہرو بیا کو دیکھنے لگتے۔ شہزادی بیا کی بھوپال سے روانگی کے بعد وہاں کے لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ ان کی جگہ لینے والی اب بھوپال میں کوئی لڑکی نہیں۔ لیکن دو تین سال ہی میں مہرو بیا پر شباب کا ایسا نکھار آیا کہ بھوپال کے خاندانی لڑکوں کی ہر وقت کی گفتگو کا موضوع بن کر رہ گئیں۔ بلکہ ایک دور تو ایسا بھی آیا کہ کرنل نورالیمین خاں کا گھر ان نوجوانوں کا کلب بن گیا تھا۔ شطرنج اور کیرم تو یہاں کھیلی ہی جاتی تھی، کسی نے اپنے گھر سے بلیرڈ ٹیبل بھجوا دیا کہ وہاں اس کے گھر میں بیکار پڑا ہے کوئی نہیں کھیلتا۔ کوئی اپنے گھر سے ٹیبل ٹینس کے لوازمات اٹھا لایا۔ کرنل صاحب کے بنگلے کا ٹینس کورٹ شہزادی بیا اور حور بیا کی شادیوں کے بعد ویران ہو گیا تھا، کانٹے دار جھاڑیاں اُگ آئی تھیں، ڈھیلے اور پتھر بکھرے پڑے تھے بنگلے کے دریچوں سے پھینکے ہوئے مختلف قسم اور سائز کے ڈبے اور بوتلیں پھیلی رہتی تھیں۔ صرف وہ پرانے، بدرنگ اور بدوضع پول جو زمین میں نصب تھے اُن سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں کسی زمانے میں ٹینس کورٹ ہو گا۔ بعض نوجوانوں نے اُسے اپنے خرچ سے صاف کروا کے پہلے سے عمدہ کورٹ تیار کروا دیا۔ اس کے تیار ہونے کی دیر تھی کہ بیڈ منٹن اور والی بال کے میدان بھی فراہم ہو گئے۔ صبح شام بھوپال کی ایرسٹوکریسی کی نئی پود یہیں رہتی اور چھٹیوں میں تو دن بھر۔ سب کے بنگلوں سے کھانا یہیں آ جایا کرتا۔ اور اگر کسی کا کوئی ہم سن عزیز بھوپال مہمان آیا ہوتا تو اُسے بھی یہیں لے آتے اور سب سے ملاتے اور کبھی دلچسپیوں میں شریک رکھتے۔ اس ماحول میں نہ صرف وہ جلد ہی کھو جاتا بلکہ اس کا جی چاہتا کہ اس ماحول کو وہ کبھی نہ کھونے پائے۔ ایک طرف نسائی حسن کے دلفریب پیکر تھے جن کے دلکش خطوط ململ کے باریک کرتوں میں ملفوف باہر نکل آنے کی مستقل جدوجہد میں دکھائی دیتے۔ چست پشوازیں اور خاص بھوپالی طرز سے اوڑھے ہوئے دوپٹے جو ایسی مہارت سے چُنے ہوئے ہوتے کہ اگر دوپٹے چُننے کی کوئی مشین بنتے تو بھوپال کی لڑکیوں کی انگلیاں کاٹ کر ہی بنائی جا سکے۔ اس خالص مشرقی لباس پر مغربی وضع کے نئے سے نئے فیشن کی تراش کے بال بنے رہتے۔ یہ ایک سے ایک حسین گنگا جمنی مجسمے اپنی معطر سانسوں اور نقرئی قہقہوں سے زندگی کی آرزو کی ترغیب فضا کی رگ رگ میں سموتے رہتے۔ دوسری طرف مردانہ وجاہت اور خوبصورتی کی مثالیں مقابل میں موجود رہتی تھیں۔ غیر ملوث ماحول میں یہ محسوس نہ ہو سکتا تھا کہ کون کس کا آرزومند ہے۔ صرف کوئی غیر معمولی ذہن ہی اس بات کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ سبھی لڑکوں کی زیادہ تر توجہ مہرو بیا پر ہوتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ جس لڑکے کو دیکھئے مہرو بیا پر پھاور ہے۔ اور ہر لڑکے کو یہ غلط فہمی تھی کہ مہرو بیا اس پر ملتفت ہیں حالانکہ مہرو بیا سبھی کو بیوقوف بناتی رہتی تھیں۔ اُدھر ماں باپ نے مہرو بیا پر ایسی کڑی نظر رکھی تھی کہ مہرو بیا کو محسوس بھی نہ ہوئی اور انھیں معلوم ہو گیا کہ کسی لڑکے سے مہرو بیا کی محبت جیسی فضول چیز کا سلسلہ نہ تھا۔ وہ خود ہی لذتِ غمِ دل سے آشنا ہونے کو جیسے تیار ہی نہ تھیں۔ اپنے حسن کا

غرور انھیں اتنا تھا کہ کسی کو اپنے لائق ہی نہ سمجھتی تھیں۔ اور اپنی گہری سہیلی کو ثریا اور بھابی ذی شان بیا سے تو ہر ایک کے ذکر پر مذاق اُڑاتیں اور زنائے کی پھبتی کستیں۔ ذی شان بیا ایک طرح سے اپنی ساس اور خسر کی اس سلسلے میں مخبر بھی تھیں۔ یہاں تک، تو وہ بھی مطمئن تھیں کہ مہرو بیا کسی کی محبت کے پھندے میں آئی ہیں اور نہ آسکتی ہیں مگر پھبتیوں پر تو ان کی جان جل جاتی اس لیے کہ ان پھبتیوں کی زد میں ان کے بھی کچھ سگے اور کچھ رشتے کے بھائی آ چکے تھے۔

حور بیا کو اپنی بھابی ذی شان بیا کے ہر خط سے مہرو بیا کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہوتا رہتا تھا۔ حور بیا کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ مہرو بیا کو کسی سے بھی محبت نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ انھوں نے بڑے پیار سے مہرو کو لکھا بھی کہ اگر اسے کسی سے محبت ہو گئی ہو تو انھیں لکھ دے وہ ماں باپ کو آمادہ کر لیں گی۔ مگر مہرو بیا نے لکھ دیا کہ ابھی تک تو ایسا کوئی سانحہ نہیں ہوا ہے، جب ہو گا وہ اطلاع ضرور دیں گی۔ یہ جواب پڑھ کر حور بیا جھنا کر رہ گئیں۔ گتھی سلجھ بھی گئی نہیں بھی سلجھی۔ اب انھیں مہرو بیا کے بر کی تلاش میں دلچسپی نہ رہی۔

ایک روز انھیں ذی شان بیا کا ایک ایسا خط ملا جسے پڑھ کر انھیں ایک عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔ لکھا تھا کہ زاہد فرید خاں لوٹ آئے ہیں۔ یہ زاہد فرید خاں بھوپال ہی کے ایک متمول خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ بڑا وجیہہ اور خوبصورت۔ وہ سات آٹھ سال پہلے یکایک غائب ہو گیا تھا۔ اس کے غائب ہونے کی وجہ کسی کو نہ معلوم تھی۔ اس کے ماں باپ کو بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ مگر عام خیال یہ تھا کہ ماں باپ سے لڑ جھگڑ کے بھاگا ہے اس لیے ماں باپ کسی کو بتلاتے نہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ماں باپ کو بھی نہ معلوم ہو۔ لیکن حور بیا، اندر کی سب باتیں جانتی تھیں۔ یہی تو تھے شہزادی بیا کے محبوب۔ یہ اونچے پورے گورے چٹے، بڑی بڑی آنکھوں، گھنی بھوؤں، اور چھوٹی سی تلوار جیسی مونچھوں والے، چوڑی ہڈی کی کلائیوں اور پتھر جیسے کسرتی جسم کے مالک زاہد فرید خاں یکایک اسی طرح آ گئے جیسے یکایک چلے گئے تھے۔ پتہ چلا کہ مدراس میں ٹھیکیداری کر رہے تھے اور وہاں انھوں نے لاکھوں روپیہ بنایا۔ اب بھوپال میں ہیوی الیکٹریکلس کے قیام پر تشریف لائے ہیں تاکہ یہاں بھی کوئی اعلیٰ پیمانے کا ٹھیکہ حاصل کر سکیں۔

انھوں نے ذی شان بیا کو خط لکھا کہ وہ مہرو سے زاہد فرید خاں کی شادی کے امکانات پیدا کریں۔ ابھی ان کا خط راستے ہی میں ہو گا کہ ذی شان بیا کا ایک اور خط آیا۔ لکھا تھا کہ واقعات بڑی تیزی سے پلٹا کھا رہے ہیں۔ زاہد فرید خاں کی واپسی کے شاک سے ہی بھوپال کی ایرسٹوکریسی سنبھلنے نہ پائی تھی کہ زاہد فرید خاں کے والدین نے مہرو بیا کے لیے ان کا پیام بھجوا دیا جو اپنے بیٹے کو پھر لا پتہ ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ پیام آتے ہی مہرو بیا سے والدین نے رضامندی طلب کی۔ مہرو بیا تو زاہد فرید خاں سے اچھی طرح واقف ہی تھیں جو کہ شہزادی بیا کے محبوب تھے، وہ شہزادی بیا جو اپنے زمانے کی مہرو بیا تھیں اور جن کو بیاہنے کے لیے کیسے کیسے امیدوار ترستے تھے، اور وہ زاہد فرید خاں جنھیں وہاں کے اعلیٰ گھرانوں کی دوشیزائیں اپنی تمناؤں کے خواب کی تعبیر مانا کرتی تھیں، انھوں نے نہایت سعادتمندی سے سر جھکا کر کہا کہ ماں باپ کی مرضی کو پورا کرنا اور حکم بجا لانا ان کا فرض ہے۔ وہ جس سے بھی ان کی زندگی وابستہ کر دیں انھیں کوئی اعتراض نہیں۔

یہ سن کر سلمیٰ بیا کی آنکھوں میں مسرت سے آنسو بھر آئے۔ بات پکی ہو گئی۔ اور اگلے مہینے تاریخ مقرر ہو گئی۔

حور بیا کے تلوے کھجانے لگے اور انھوں نے اپنے شوہر کو نوٹس دے دیا کہ تم اگلے مہینے آجانا، میں شادی کی تیاری میں ہاتھ بٹانے کے لیے چلی۔

کرنل نور المبین خاں اور سلمیٰ بیا دونوں عرصے سے مہر و بیا کا جہیز جوڑ ہی رہے تھے اب تو تیاری کی رفتار تیز سے تیز تر اور تیز تر سے تیز ترین ہوگئی۔ دونوں میاں بیوی حور بیا کو لے کر آٹھ روز کے لیے بمبئی بھی ہو آئے اور پچاس ساٹھ ہزار کی خریدی کرلی۔ پھر جو واپس آئے تو گھر کی تمام عورتیں، مہر و بیا کی سگی اور رشتے کی بہنیں، چچیاں، پھوپھیاں، خالائیں، ممانیاں، گھر کی کنیزیں، انائیں، چٹاچٹ بلائیں لینے والی بڑی بوڑھی عورتیں جو اس ڈر سے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹی تھیں، رات دن جٹ کر سینے سلانے میں لگ گئیں۔

پاکستان، رامپور، دہلی اور حیدرآباد سے دھڑا دھڑ مہمانوں کی ٹولیاں آنے لگیں۔ کرنل نور المبین خاں اور سلمیٰ بیا کی دعوت پر اور حور بیا سے اتنے عرصے بعد ملاقات کرنے کے لیے اور سب سے بڑھ کر اپنے محبوب زاہد فرید خاں کو ایک بار دیکھنے کے لیے شہزادی بیا بھی دل پر پتھر رکھ کے چلی آئیں۔

سارے بھوپال میں ایک دھوم تھی۔ اب تو مہر و بیا سے حسد کرنے والے بھی قائل ہو گئے کہ کرنل نور المبین خاں اور نوشاہ کے والد نے اپنی اپنی جگہ برابر کے تارے توڑے ہیں۔ نہ مہر و بیا کو ان سے اچھا شوہر مل سکتا تھا اور نہ زاہد فرید خاں کو ان سے اچھی بیوی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے۔ اور کرنل نور المبین خاں اور سلمیٰ بیا لائق صد مبارکباد ہیں کہ جیسا داماد چاہیے ویسا ہی ملا اور مزے کی بات یہ کہ بھوپال کی لڑکی بھوپال ہی میں رہی۔

بڑے انتظار کے بعد بڑی شان سے عقد کا دن آیا اور بڑی آن بان سے برات آئی۔ برات کو دیکھنے کے لیے ساری عورتیں زنان خانے کے برآمدے میں اُبل پڑیں۔ زاہد فرید خاں بروکیڈ کی شیروانی پہنے جو خاص طور سے حیدرآباد میں سلوائی گئی تھی اور ریشمی کلغی دار صافہ باندھے بھاری بھرکم معطر سہرے سے لدے شہ نشین پر گئے۔ اس شان کے دولھے کم ہی دیکھنے میں آئے ہوں گے۔ حور بیا نے کنکھیوں سے دیکھ کر تاڑ لیا کہ شہزادی بیا تصورات کے شامیانے میں اپنا بیاہ زاہد فرید خاں سے رچا رہی تھیں۔

جلوے کی رسم کے وقت شہزادی بیا زاہد فرید خاں کو دیکھ کر اداس ہوئی جا رہی تھیں اور تمام نوجوان دلہن کو دیکھ کر مرے جا رہے تھے۔ ان کا تو جیسے مرگِ انبوہ والا معاملہ تھا۔ کسی کی نظر حسینوں کے سولہ سنگھار سے آراستہ پیراستہ جمگھٹے پر نہ پڑتی تھی اور اگر پڑتی بھی تو صرف اس خیال سے کہ اس کی دنیا میں مہر و بیا کی جگہ اب کون لے گی۔ سب رسمیں ختم ہوئیں رخصتی کا وقت آگیا۔ اور جانے سے پہلے مہر و بیا اپنی ماں بہنوں سے لپٹ لپٹ کر مگرمچھ کے آنسو بہانے لگیں۔

دوسرے پلنچے کی موریاں ٹھیک ہو چکیں تو حور بیا کھڑی ہو گئیں تاکہ پشواز باندھ لیں۔ انھوں نے آج عہد کر لیا تھا کہ اب کبھی وہ پشواز نہیں پہنیں گی۔ کئی برس بعد انھوں نے کل اور آج پہنی تھی تو بس آخری دفعہ۔ لباس سے فارغ ہو کر جب وہ زیور پہن رہی تھیں تو شہزادی بیا بھی آگئیں۔ حور بیا نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں سوج کر انگارہ ہو رہی تھیں۔

تھوڑی دیر میں دلہن بھی آگئی۔ کمرے میں داخل ہوئی۔ اندر سے دروازہ بند کر لیا گیا۔ سہیلیاں اور بی بیاں چمٹ کر

چھیڑنے لگیں۔ یکایک مہرو بیا کی آنکھیں بھیگ گئیں اور بھرائی ہوئی آواز سے بولیں "میں واپس نہیں جاؤں گی۔ کہتے تھے ماں باپ کے مجبور کرنے پر انھیں یہ شادی کرنی پڑی اور ماں باپ کو اپنی مجبوری بتانے کی انھیں ہمت نہیں ہوئی" اور وہ سسکیاں لینے لگی۔
حور بیا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ کبھی وہ مہرو بیا پر رحم کی نظر ڈالتیں اور کبھی شہزادی بیا کو ہمدردی سے دیکھتیں یکایک شہزادی بیا نے ایک قہقہہ لگایا جس سے اور قہقہے نکلتے چلے گئے۔ ہنسی کے مارے ان کا بُرا حال تھا۔ پیٹ پکڑ کر دوہری ہوئی جا رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ قہقہوں کی گونج سارے گھر میں گھوم رہی تھی۔ مردانے سے کچھ لوگ دوڑ پڑے اور بڑی مشکل سے شہزادی بیا کو قابو میں کیا گیا اور وہاں سے لے جانے لگے۔ شہزادی بیا میں بپھری ہوئی شیرنی کی سی طاقت آچلی تھی۔ اپنے آپ کو مضبوط گرفت سے چھڑاتی ہوئی بولیں "ارے مجھے کیوں لے جا رہے ہو۔ مہرو کو لے جاؤ مہرو پاگل ہو گئی ہے۔ مہرو پاگل ہو گئی ہے۔ اُسے لے جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گی...... میں نہیں جاؤں گی......... میں نہیں جاؤں گی........"

محفل محفل تنہا تنہا

تحریر : ارنسٹ ہیمنگوے
ترجمہ : عنایت الٰہی ملک

رات ڈھل جانے کے باعث لوگ ایک ایک کر کے کیفے سے جا چکے تھے مگر کیفے کی ٹیرس میں صرف ایک بوڑھا آدمی قمقموں کی تیز روشنی سے بچنے کے لیے درخت کے پتوں کی اوٹ لیے بیٹھا تھا۔ کیفے کے سامنے والی گلی میں دن بھر دھول اُڑنے کے بعد رات کو اوس پڑنے سے گرد بیٹھ چکی تھی۔ بوڑھے کو رات گئے تک کیفے میں بیٹھنے میں لطف آتا تھا ـــــ! وہ ذرا اونچا سنتا تھا ـــ مگر رات کے ان لمحات میں دن کی نسبت خاموشی اور سکون تھا اور وہ شاید یہ فرق جان چکا تھا ـــــ! کیفے کے دونوں بیرے محسوس کر رہے تھے کہ بوڑھا آج قدرے زیادہ ہی پئے ہوئے ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بوڑھا کیفے کا پرانا گاہک ہے اور اگر وہ زیادہ پی کر بہکنے لگا تو بل ادا کیے بغیر ہی چل دے گا اس لیے وہ اس کی کڑی نگرانی کر رہے تھے ـــــ!!

"پچھلے ہفتے اس بوڑھے نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی!" ایک بیرے نے کہا۔

"کیوں؟"

"وہ ناامید ہو چکا تھا۔"

"کس بات سے ناامید تھا؟"

"بظاہر کوئی بات نہ تھی!"

"تم کیسے جانتے ہو کہ ایسی کوئی بات نہ تھی؟"

"اس کے پاس بے شمار دولت ہے!"

دونوں بیرے کیفے کے دروازے کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی میز پر اکٹھے بیٹھے کیفے کی ٹیرس پر نظریں گاڑے ہوئے تھے جہاں تقریباً سبھی میزیں خالی ہو چکی تھیں سوائے درخت کے نیچے والی میز جہاں بوڑھا گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا اور درخت کے پتے ہوا میں سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے!۔ گلی میں سے سپاہی اور ایک لڑکی گزر رہے تھے۔ قمقموں کی روشنی میں سپاہی کے کاندھے پر لگے ہوئے پیتل کے نمبر چمکنے لگے۔ لڑکی سر سے ننگی تھی اور سپاہی کے پہلو بہ پہلو تیزی سے چلی جا رہی تھی۔

"اگر گارڈ نے اسے پکڑ لیا تو؟" ایک بیرے نے کہا۔

"تو کیا ـــــ وہ جو کچھ چاہتا ہے اسے مل ہی جائے گا۔"

"اسے اب گلی سے نکل جانا چاہیے۔ وہ ضرور اس سے باز پرس کریں گے" تھوڑی دیر ہوتی وہ ادھر سے گزرے تھے۔"
بوڑھا آدمی بیرے کو متوجہ کرنے کے لیے خالی گلاس کے ساتھ میز پر پڑی ہوئی پلیٹ کو آہستہ آہستہ بجانے لگا۔ نوجوان بیرا جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب گیا۔

"کیا چاہیے؟"

"برانڈی کا ایک اور گلاس!" بوڑھے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بہکنے لگو گے!" بیرے نے کہا۔

بوڑھا خالی خالی نظروں سے بیرے کی طرف دیکھنے لگا اور بیرا برانڈی لینے چل دیا۔

"وہ ساری رات یہیں گزارے گا۔" نوجوان بیرا اپنے ساتھی سے کہنے لگا "مجھے اب نیند آ رہی ہے، مجھے کبھی تین بجے سے پہلے سونا نصیب نہیں ہوا، یہ بوڑھا اگر پچھلے ہفتے خودکشی کر لیتا تو کیا ہی اچھا ہوتا!" بیرے نے کاؤنٹر سے برانڈی کی بوتل نکالی اور دوسری پلیٹ میں رکھ کر بوڑھے کے پاس لے آیا۔ پلیٹ میز پر رکھ کر بیرا گلاس میں برانڈی انڈیلنے لگا، "تمہیں چاہیے تھا کہ پچھلے ہفتے اپنی زندگی کو ٹھکانے لگا دیتے!" بیرے نے بوڑھے کو جو ذرا اونچا سنتا تھا نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا اور زیادہ!" بوڑھے نے گلاس کی طرف جو ابھی پورا نہ بھرا تھا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بیرا برانڈی انڈیلتا رہا، یہاں تک کہ گلاس کناروں تک بھر گیا اور باقی ماندہ برانڈی گلاس کے کناروں سے بہہ کر نیچے رکھی ہوئی پلیٹ میں گرنے لگی۔

"شکریہ!" بوڑھے نے کہا۔

بیرے نے بوتل اٹھالی اور کیفے کے اندر جا کر پھر اپنے ساتھی کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔ "وہ اب زیادہ پینے کی وجہ سے بہکنے لگا ہے" اس نے کہا۔

"اس کی ہر رات یہی حالت ہو جاتی ہے!"

"وہ کیوں اپنی جان کے درپے ہے؟"

"میں کیونکر جان سکتا ہوں۔"

"اس نے کس طرح خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"وہ رسّی کا پھندا ڈال کر لٹک گیا تھا۔"

"اسے کس نے بچایا تھا؟"

"اس کی بھانجی نے!"

"اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"وہ ڈرتی تھی کہ خودکشی کے بعد بوڑھے کی روح خلاؤں میں بھٹکتی رہے گی اور کبھی چین نہ پا سکے گی!!"

"بوڑھے کے پاس کس قدر دولت ہو گی؟"

"وہ لاکھوں پتی ہے۔"

"وہ ضرور اسّی برس کے قریب ہوگا؟"

"چلو! اسی بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ وہ اسّی برس کا ہوگا۔"

"کاش وہ اب اپنے گھر چلا جائے! مجھے تین بجے سے پہلے کبھی سونا نصیب نہیں ہوا! وہ اب سونے کے لیے کیوں نہیں چلا جاتا؟"

"وہ کیفے میں دیر تک اکیلے بیٹھنا پسند کرتا ہے۔"

"وہ اکیلا ہے مگر میں تو اکیلا نہیں ہوں! میری بیوی بھی تو ہے جو میرا انتظار کر رہی ہوگی!"

"اس کی بھی کبھی بیوی تھی!"

"وہ اگر ہوتی بھی تو اب اس کے کس کام آتی؟"

"تم ایسا نہیں کہہ سکتے ممکن ہے بیوی کے ہونے سے اس کی حالت قدرے بہتر ہوتی۔ اس کی بھانجی اب اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں تمہیں نے تو کہا ہے کہ اس نے رسّی کاٹ ڈالی تھی! میں اس جتنا بوڑھا نہیں ہونا چاہتا۔ بڑھاپا کس قدر ناگوار ہوتا ہے!!"

"سبھی ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ یہ بوڑھا بڑے اچھے اطوار کا مالک ہے۔ شراب بڑے سلیقے سے پیتا ہے۔ اس قدر پینے کے بعد بھی کتنا پُرسکون ہے ذرا اس کی طرف دیکھو تو۔"

"میں اسے دیکھنا نہیں چاہتا، کاش یہ اب گھر چلا جاتا! اسے ہم لوگوں کا ذرا برابر بھی تو خیال نہیں۔"

بوڑھا گلاس پر جھی ہوئی نگاہیں اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، پھر بیروں پر نظریں جما دیں: "ایک اور برانڈی۔" اس نے اپنے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بیرا جسے گھر جانے کی جلدی تھی لپک کر اس کے قریب آیا۔ "بس اب ختم کیجیے!" بیرے نے خوش خلقی اور وضع داری کی روایات کو نظرانداز کرتے ہوئے ایسے تحقیر آمیز لہجے میں کہا جسے گھٹیا درجے کے لوگ مدہوش شرابیوں اور غیر ملکیوں سے باتیں کرتے وقت اختیار کرتے ہیں: "آج رات اور نہیں ملے گی، ہمیں کیفے بند کرنی ہے۔"

"ایک اور برانڈی!"

"اب نہیں ملے گی —— ختم ہو چکی!" بیرے نے میز صاف کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

بوڑھا خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا —— نظروں ہی نظروں میں پلیٹوں کو گنا —— جیب سے چمڑے کا بٹوا نکالا اور بل ادا کر کے آدھا "پیسٹا" ٹِپ کے لیے میز پر رکھ دیا۔

بیرا اسے ٹیرس کی سیڑھیوں سے اتر کر گلی میں جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ بوڑھا آدمی ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ایک پُروقار طریقے سے چل رہا تھا۔

"تم نے اسے کیفے میں بیٹھ کر پینے کیوں نہ دیا؟ ابھی ڈھائی تو نہیں بجے۔" اس بیرے نے جسے گھر جانے کی جلدی نہ تھی کیفے کی کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔

"میں گھر جا کر سونا چاہتا ہوں۔"

"یہ کون سا سونے کا وقت ہے؟"

"اس کے لیے نہ سہی میرے لیے تو ہے۔"

"وقت تو سبھی کے لیے ایک جیسا ہے۔"

"تم بھی بوڑھوں جیسی باتیں کیے جا رہے ہو ——— وہ بار سے ایک بوتل خرید کر گھر پر بھی تو پی سکتا ہے۔"

"مگر اس طرح کیفے میں بیٹھ کر پینے جیسا لطف تو نہیں آ سکتا۔"

"ظاہر ہے کہ وہ کیفے میں بیٹھ کر پینے والی بات تو نہیں بنتی!" شادی شدہ بیرے کو اس سے پورا پورا اتفاق تھا لہٰذہ بوڑھے کو اٹھا کر زیادتی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ "اور تم ——— تمھیں اپنے معمول سے پہلے گھر جانے کی کوئی فکر نہیں ہوتی؟"

"تم میری توہین کرنے پر آمادہ نظر آتے ہو۔"

"نہیں میرے دوست ——— میں تو مذاق کر رہا تھا ——— مجھے اطمینان ہے ——— میں سراپا اطمینان ہوں ———!!"

"تم ——— تمھارے پاس اطمینان ہے ——— جوانی ہے اور کام ہے ——— تمھارے پاس سبھی کچھ تو ہے۔" دوسرے بیرے نے کہا۔

"اور تمھیں کس چیز کی کمی ہے؟"

"کام کے سوا ہر چیز کی!"

"تمھارے پاس وہ سبھی کچھ ہے جو میرے پاس ہے۔"

"نہیں نہ ——— مجھے کبھی سکون نہیں مل سکا اور نہ ہی میں جوان ہوں!"

"چلو جانے دو ان بیہودہ باتوں کو اور کیفے کو تالا لگاؤ۔"

"میں بھی ان میں سے ایک ہوں جو رات کو ہوٹلوں اور کیفوں میں دیر تک بیٹھنا پسند کرتے ہیں ——— میں انہی کا ساتھی ہوں جو راتوں کو سونا نہیں جانتے ——— میں انہی میں سے ہوں جنھیں سیاہ راتوں میں روشنی کی ایک کرن چاہیے ——— صرف ایک کرن!"

"مگر میں تو گھر جا کر سونا چاہتا ہوں!"

"قطرتاً ہم ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئے ہیں ———" عمر رسیدہ بیرے نے کہا۔ اس نے اب گھر جانے کے لیے ہوٹل کی وردی اتار کر اپنے کپڑے پہن لیے تھے ——— "یہاں صرف جوانی اور سکون ہی کی بات نہیں ——— اگرچہ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ اچھی ہیں ——— مگر ہر رات کیفے بند کرتے ہوئے برگشتہ خاطر ہوتا ہوں کہ شاید کوئی ایسا آدمی آجائے جسے ایسی کیفے کی ضرورت ہو۔"

"میرے دوست ——— شہر میں اور بھی بہت سے بار ہیں جو رات رات بھر کھلے رہتے ہیں۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے ——— یہ کیفے بڑی خوشگوار اور صاف ستھری ہے۔ ایسا ماحول اور کہیں نہیں مل سکتا ——— یہاں روشنی بھی ہے اور پتوں کے سائے بھی ———!!"

"شب بخیر!" جوان بیرے نے کہا۔

"شب بخیر" دوسرے بیرے نے ہوٹل کی بتیاں گل کرتے ہوئے اپنے آپ سے گفتگو جاری رکھی: "دنیا میں روشنی ہی

سب سے بڑی رہبر ہے —— مگر روشنی کے ساتھ یہ بھی تو ضروری ہے کہ جگہ صاف ستھری اور پُرسکون ہو —— ! کوئی محض آرکسٹرے سے پھوٹنے والے شوخ و شنگ نغمے سننا ہی تو پسند نہیں کرتا —— اور نہ ہی بار کے سامنے کھڑے ہو کر پینے سے آدمی باوقار نظر آتا ہے —— اور رات کے اس پچھلے پہر میں بار کے سوا اور کوئی ایسی جگہ بھی تو نہیں —— وہ بوڑھا نہ جانے کس بات کے خوف سے یہاں پناہ لینے چلا آتا تھا —— وہ خوف وہراس تو نہیں ہو سکتا ! اسے شاید فنا اور عدم کا ڈر رہے —— !! یہ سب فنا ہی کا قصہ ہے، انسان خود بھی تو فانی ہے —— اس لیے شاید روشنی خوشگوار ماحول اور ایک خاص قرینے سے سجی ہوئی کیفے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے !! بہت سے لوگ یہاں آکر چلے جاتے ہیں مگر اسے محسوس نہیں کر پاتے —— لیکن وہ جانتا تھا کہ فنا ابدی ہے —— اے فنا تیری اپنی بھی کوئی حقیقت نہیں —— ہمیں بھی فنا کر دے ...... یا پھر اس فنا سے نجات دلا دے —— فنا کے لیے !! اے فنا —— مبارک ہو کہ تیرے اپنے پاس بھی کچھ نہ رہے گا —— !! سب کو فنا کر کے تجھے خود بھی فنا ہو جانا ہے ——" وہ مسکرانے لگا اور ایک بار کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں کافی بنانے کی چمکیلی مشین سے بھاپ نکل رہی تھی —— !

"کیا پیو گے ؟" بار والے نے کہا ۔

"فنا کا جام —— !"

"ایک اور مخبوط الحواس —— !" بار والے نے یہ کہہ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا ۔

"ایک چھوٹا کپ ۔" بیرے نے کہا اور بار والا پیالی میں کافی انڈیلنے لگا ۔

"یہاں روشنی تو بہت تیز ہے —— مگر بار کا رنگ و روغن ذرا ٹھیک نہیں —— !" بیرے نے کہا ۔

بار والے نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہا ۔ رات بہت زیادہ جا چکی تھی اور باتوں میں اُلجھنے کا وقت نہ تھا ۔ "تمھیں دوسرا کپ چاہیے ؟" بار والے نے پوچھا ۔

"شکریہ مجھے اور نہیں چاہیے ۔" اور یہ کہہ کر بیرا چل دیا

اسے بار اور نیم تاریک قہوے خانے سخت ناپسند تھے —— صاف ستھری اور روشن کیفے کی بات ہی کچھ اور تھی —— اور اب کوئی بات سوچے بغیر وہ گھر جانا چاہتا تھا ۔ وہ اپنے بستر میں لیٹ جائے گا —— اور آخر کار صبح کا اجالا پھیلتے ہی اسے نیند آنے لگے گی —— "بہر حال !" وہ اپنے آپ سے کہنے لگا "یہ شاید کم خوابی کی وجہ سے ہو —— اور بہت سے لوگ بھی تو اس کا شکار رہوں گے —— !!!

———

قوسِ قزح کی آغوش میں

منظور الٰہی

"اپنی بیٹی باندھ لیجیے، جہاز اُڑا ہی چاہتا ہے۔" حروف سامنے چمک رہے تھے۔

ایر ہوسٹس کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں بلا کی چمک تھی، اُس کے چہرے پہ پکے ہوئے پھل کی شگفتگی اور تازگی تھی، تندرستی اور بشاشت اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی، وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "میں ابھی نو آموز ہوں اتنی مشاق نہیں کہ TAKE OFF کے وقت چل پھر سکوں، دراصل میں پہلی بار سان فرانسسکو جا رہی ہوں، یہ کیا زبان ہے جو تم دائیں سے بائیں لکھ رہے ہو؟"

جلد ہی روشنیاں دھیمی ہو گئیں، پس پردہ مدھم راگ تھا، سارا ماحول خواب آور تھا، میری آنکھ کھلی تو دیکھا خاکی پتلون قمیص پہنے ساتھ والی سیٹ پہ ایک خوشرو نوجوان محوِ خواب ہے، کچھ دیر بعد وہ چونک کے اُٹھا:

"میں رات بھر جاگتا رہا، اب نیند نے غلبہ پا لیا۔"

"کسی دعوت میں پھنس گئے تھے؟"

"جی نہیں، میں اسی جہاز میں تھا، ہم سان فرانسسکو سے واشنگٹن گئے تھے۔"

"تو یوں کہیے برج کی چوکڑی جم گئی تھی۔"

"جی نہیں، میں اِس جہاز کا پائلٹ ہوں!"

اس تمہید کے بعد میڈگاسکی نے اپنی رام کہانی شروع کر دی، "میرا باپ ایک چھوٹے شہر میں پادری ہے، اُس کی خواہش تھی۔ میں اور میرا بڑا بھائی وہی پیشہ اختیار کریں، میرا بھائی مجھ سے کہیں زیادہ ذہین تھا لیکن اُس نے بے چون وچرا والد کی خواہش پوری کی اور والد کی طرح معمولی مشاہرے پہ پادری بننا قبول کر لیا، اب وہ بیوی بچوں کے جھنجھٹ میں گرفتار ہے، افسوس اُس کی شخصیت گھُٹ کے رہ گئی، اُسے پنپنے کا موقع نہ مل سکا لیکن میرے دل میں بغاوت کی آگ سُلگ اُٹھی، سولہ برس کی عمر میں میں چپکے سے گھر سے بھاگ کھڑا ہوا، میں لاس اینجلیز جا پہنچا۔ جہاں میں نے کافی سختیاں برداشت کیں لیکن پائلٹ بننے کی دُھن ایسی تھی کہ میں کسی قیمت پر گھر لوٹنے کے لیے تیار نہ تھا، میں نے معمولی مزدور کی طرح ٹوکری ڈھوئی، کبھی ایسا بھی ہوا کہ کام نہ ملا اور رات کو کسی باغ سے چند سنترے چُرا کے کھا لیے، دن کے وقت مشقت کرتا اور رات کو نائٹ سکول میں پڑھتا، ایر پورٹ پہ جا کر مختلف جہازوں کی ساخت دیکھنا میرا محبوب مشغلہ تھا، کبھی کسی کو میرا شوق دیکھ کے ترس آ گیا تو اندر سے بھی جہاز کا انجن دکھلا دیا، فنی تربیت کے لیے میں کسی سکول میں داخل نہیں ہوا بلکہ اپنے طور پر متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کر کے میں نے پائلٹ لائسنس

حاصل کیا، ایک لکھ پتی نے مجھے اپنا ذاتی پلین پائیلٹ کرنے کی اجازت دے دی اور یوں امتحان کے لیے پرواز کی شرط بھی پُوری ہو گئی۔ جب میں سُرخرو ہو کر گھر لوٹا تو والد محبت آمیز نرمی سے پیش آئے بلکہ عجیب بات ہے کہ پڑوسیوں کو فخریہ بتلاتے تھے کہ میں ہوائی جہاز کا پائیلٹ ہوں۔"

سوانحِ عمری کا حصّہ ختم ہوا تو میڈ گاسکی ذہنی کشمکش کی دنیا میں آ گیا، "میں نے زندگی میں ہمیشہ خلا محسوس کیا، مجھے حق کی تلاش رہی لیکن میں ہر دروازے سے بے نیلِ مرام لوٹا، میں نے فلسفہ میں پناہ ڈھونڈی۔ برٹرنڈ رسل میرا محبوب مصنّف ہے، فضا میں پرواز میرے لیے ایک حد تک طمانیت کا باعث ہے، جیسے وقتی طور پر انسان علائق دنیا سے آزاد تو ہو جائے مگر اُسے سکون نصیب نہ ہو۔"

"اگر آپ اپنے دوستوں کے کام آ سکیں تو شاید آپ کو کچھ روحانی تسکین ملے ؟"

"مجھے ایسے دوستوں اور ایسی انجمن کی تلاش رہی جو صدقِ دل سے کچھ کر رہی ہو۔ مگر مجھے مایوسی ہوئی۔"

"اپنی بساط کے مطابق ہم انفرادی طور پر بھی کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں، ہمارے گرد و نواح ایسے لوگ بستے ہیں جنھیں ہماری ہمدردی کی ضرورت ہے لیکن ہمیں خبر تک نہیں ہوتی کسی آفت رسیدہ کے لیے دو میٹھے بول یا اُس کی مشکل حل کرنے کے لیے ایک فون کال کبھی روپے سے بھی زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔"

میڈ گاسکی خیالات کی دنیا میں کھو گیا، اُس کا ردِ عمل معلوم نہ ہو سکا۔

'وطن سے "سرکاری ناراضی" کا خط! یہ میرے ساتھ کیا زیادتی ہوئی ہے؟' میں نے سوچا

امتدادِ وقت سے زخم مندمل ہو جاتے ہیں لیکن کسی نے جو چرکا دیا ہو اُسے بھول جانا اور دوستی کا دم بھرتے رہنا اپنے بس کی بات نہیں۔ اُس سے ٹیس اُٹھتی رہتی ہے، زخم ہرا ہوتا رہتا ہے اور یوں بھی تلخ یادوں کو بھلانے کی کوشش کوئی مردانگی نہیں، اہم سوال یہ ہے کہ آیا اُس زخم خوردگی کے باوجود ہم نارمل زندگی گزار سکتے ہیں؟ کیا تلخ تجربوں کے باوجود ہماری شخصیت متوازن رہ سکتی ہے؟ زندگی ہمیشہ اُس ڈگر پر نہیں چل سکتی جیسا کہ ہم نے چاہا تھا، اور ہر شخص وہ نہیں جیسا ہم نے سمجھا تھا پھر اپنے آپ کو غم و غصّہ کی آگ میں بھسم کرنے سے فائدہ؟ ہمیں اپنے زخموں کے ساتھ سمجھوتہ کر لینا چاہیے ہمیں اُن کی موجودگی کا اقرار کر لینا چاہیے۔ اگر ہم اتنے فراخدل نہیں کہ اپنے بدخواہ کو معاف کر سکیں تب بھی...... مسکراتے رہو اور پُر اُمید رہو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، یہ ہزارہا سال پرانی بات ہے۔ اور میں بھی ہزارہا سال پُرانا ہوں، اتنا پُرانا جب پہلے انسان کے ہیولیٰ میں رُوح پھونکی گئی جب پہلے پہل انسان کو زندگی عطا ہوئی، یہ ڈی لکس فلائیٹ، نرم اور دہرا تکیہ، پس پردہ دھیما راگ اور مدھم روشنی اور بادلوں سے کہیں اُوپر یہ پرواز، یہ سائنس کی فتوحات، لیکن میں عتیق ہوں، زندگی عتیق ہے....
سفید بادلوں میں کسی نے سرمئی رنگ گھول دیا ہے۔ بادلوں کے جھنڈ گہرے اور خوفناک ہیں جیسے کوہِ آتش فشاں کے سینے سے دھوئیں کے مرغولے بلند ہو رہے ہوں، یہ بادلوں کے متنوع PATTERNS جیسے تُند غصیلی لہریں بلند ہوتی جائیں نیچے بادلوں کا یخ بستہ دریا ہے۔ جیسے پاکیزہ سیّال برف کا گلیشیر، دُور افق پر بادلوں کے ٹھنڈے نیلگوں آسمان سے جا ملے ہیں، مہربان سُورج برابر چمک رہا ہے۔

"ماضی کے ستون" سان فرانسسکو سے متعلق ایک مشہور پینٹنگ ہے، پیٹر رولوتے یہ منظر کشی تب کی تھی۔ جب شروع صدی میں شہر ایک ہولناک زلزلے اور آتش زدگی کی گرفت میں آ گیا تھا، شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا یا جل رہا تھا، دو ستون باقی رہ گئے تھے۔ تصویر کا پس منظر پُر سکون ہے، درختوں سے گھرے تالاب میں بطخیں تیر رہی ہیں۔ پس منظر کی تخلیق محض نقاش کے تخیل کی مرہونِ منت ہے ورنہ چاروں

طرف بربادی تھی، اس پینٹنگ سے متاثر ہو کر انسان کی چابکدستی نے وسیع و عریض گولڈن گیٹ پارک کے ایک گوشے میں وہی منظر RE-CREATE کر دیا ہے، شاید یہ پہلی مرتبہ منظر سے پہلے منظر کشی کی گئی تھی۔

کلف ہاؤس کے سامنے سمندر میں بیڈھب چٹانیں سر اٹھائے کھڑی ہیں، ہماری نظریں سیل کی بے سود متلاشی رہیں، ہمارے گائیڈ نے بتلایا کہ MATING سیزن کی وجہ سے سیل نظر نہیں آ رہیں، فیشن ایبل ریستوران غروب آفتاب کوفی شاپ کے سامنے ایک دربان کا مجسمہ ایستادہ ہے۔ جو توند لٹکائے ہاتھ میں نیزہ لیے ہنس رہا ہے۔ نیچے کتبہ لگا ہے "یہ دربان پندرھویں صدی عیسوی میں ایک مشرقی معبد کا نگہبان تھا۔ اس کی توند کو ہاتھ لگانا خوش قسمتی کو دعوت دینا ہے۔ ایک اچھی WISH سوچیے اور بکس میں سکہ ڈال دیجئے"۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اپنی رفیقہ سے سرگوشی کرتے ہوئے بکس میں سکہ ڈال دیا۔ میں نے سوچا اب توند چھونے کی سعادت بھی حاصل کرے گی۔ مگر میری وجہ سے جھجک گئی۔

الکاطراز کا جزیرہ اس دلفریب جگہ سے دور نہیں، ساحل سے گمان ہوتا ہے کہ سمندر کے بیچوں بیچ LUXURY ہوٹل بنا ہے۔ دراصل یہ مشہور قید خانہ ہے ۱۹۳۲ء سے قبل یہ فوجی جیل تھی لیکن اب حبس دوام کے علاوہ ایسے لوگ جو سخت جان مشہور ہوں اور فیڈرل گورنمنٹ کے قانون کے تحت کسی جرم میں ماخوذ ہوں یہاں رکھے جاتے ہیں، یہ قید خانہ چاروں طرف پانی سے گھرا ہے یہاں سے بھاگ نکلنا ناممکن ہے، الکیپون بھی یہیں مقید رہا۔ رسوائے زمانہ ٹھگ ہونے کے باوجود وہ چند حلقوں میں بے حد ہر دلعزیز تھا۔ اسی مقبولیت کے ڈر سے اسے یہاں رکھا گیا تھا، ایک قیدی کو یہاں رکھنے کا خرچ نیویارک کے فیشن ایبل ہوٹل کے لگ بھگ پڑتا ہے، پانی تک کشتی کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے، نگرانی اتنی کڑی ہے کہ محافظ سنتریوں کے ملاقاتی بھی ہفتہ دس دن انتظار کرتے ہیں۔

بس ایک اونچے کوچے پر چڑھ رہی تھی، گائیڈ روانی کے ساتھ RUNNING COMMENTARY دے رہا تھا، "یہ لوگ بڑے خوش مزاج ہیں، بسوں اور راہگیروں پہ کبھی کبھی کوڑا کرکٹ اور انڈوں کے چھلکے پھینک دیتے ہیں، یہ اودے رنگ کا گھر بڑا دلچسپ ہے...... (کچھ وقفہ کے بعد) دراصل یہ میرا مکان ہے امید ہے آپ نے تصویر لے کر اپنی فلم ضائع نہ کی ہو گی"۔ سان فرانسسکو کا DOWN TOWN نیچے نشیب میں پھیلا تھا۔ گائیڈ کہہ رہا تھا "لاس اینجلز کی طرح یہاں SMOG نہیں ہوتی، آپ نے سنا ہو گا پروفیسر براؤن نے لاس اینجلز SMOG کا مسئلہ حل کر لیا تھا،

"وہ کیسے؟" کسی نے پوچھا

"پروفیسر براؤن نقل مکانی کر کے کالوراڈو سپرنگ چلے گئے تھے"۔

یہ مسخرہ اپنی ہانک رہا تھا، گو سورج چمک رہا تھا لیکن دن کے بارہ بجے بھی اتنی دھند تھی کہ ۸½ میل لمبا اوک لینڈ برج نظروں سے اوجھل تھا۔

یکدم سورج دھندلا گیا، فضا میں خنکی آ گئی، سبزہ، دراز قامت درخت، پہاڑ کی اوٹ، چڑھائی اترائی اور دائیں جانب ساحل سمندر قوس کی شکل میں، ہم مضافات میں ساؤسالیٹو کے فیشن ایبل علاقہ سے گزر رہے تھے، پہاڑیوں کی ڈھلوان پر ترشے ترشائے مکانات، سفیدے کے درخت ہوا کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور منظر! روپہلی بتیوں کا لحظہ لحظہ رنگ بدلنا بھلا معلوم ہو رہا تھا، ایک معمر خاتون اپنے خوبصورت مکان کے PATIO سے دور بین لگائے نظارے سے محظوظ ہو رہی تھی، بس دائیں بائیں مڑتی نشیب و فراز طے کرتی آگے بڑھ

رہی تھی۔ جب بس ڈھلوان پر لڑھکتی کوئی پیچھے ہٹتی ہوئی بستی اپنے خوبصورت مکانوں اور درختوں کو سنبھالے بلندی کی طرف اُٹھ جاتی، ہم میور وُوڈ کی طرف رواں دواں تھے جو سان فرانسسکو کے شمال میں ہے۔ بلند بالا ریڈ ووڈ درختوں کی چھتری ایسی گھنیری تھی کہ سُورج کی شعاعیں بمشکل چھن کے فرشِ زمین تک پہنچ رہی تھیں۔ جنگل میں خُنکی محسوس ہو رہی تھی اور خشک پتّوں کی مہک فضا میں رچ بس گئی تھی۔ سردی کے سبب اس جنگل میں بسیرا نہیں کرتے، کیڑے کوڑے بھی شاذ ہی ہوتے ہیں، جنوبی کیلیفورنیا کے علاوہ ریڈ ووڈ کہیں اور نہیں ہوتا۔ درختوں میں قدیم ترین دو ہزار سال سے زیادہ پُرانے ہیں —— دنیا میں قدیم ترین جاندار چیز، بلند ترین درخت، جو ۳۶۴ فٹ ہے۔ بجلی گرنے سے چند درختوں کے تنے زمین پر آ رہے تھے، اُن کے تنے دیکھنے میں بے جان معلوم ہوتے تھے لیکن ایک ایسے تنے سے بھی متعدد درخت پھُوٹ کر آسمان کی طرف بڑھ رہے تھے، یہ عجیب بات ہے کہ ریڈ ووڈ کی زندگی جڑوں میں نہیں بلکہ چھال کے بیرونی دائروں میں ہے یہی وجہ تھی کہ بجلی گرنے سے بھی درخت نیست و نابُود نہ ہوئے تھے، جلے ہوئے حصّے پر ربڑ کے ٹائر کی طرح بل کھاتی ہوئی سیاہ لکیریں پڑ گئی تھیں لیکن تنے کے باقی حصّے پر زندگی کی رمق موجود تھی اور وہاں سے نئے درخت پھُوٹ چکے تھے، چند درخت پیسا کے ٹاور کی طرح ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ لیکن اُنھیں بھی تنے سے نکلے ہوئے نوزائیدہ درختوں نے سہارا دے کر تھام لیا تھا، ایک "مردہ" درخت کے کمان آسا تنے پر بے شمار شاخیں اُگ آئی تھیں اور سیدھی سیدھی بڑھ رہی تھیں۔ گمان گزرتا تھا کہ اُن کے پنپ جانے پر کمان درختوں کے بوجھ سے زمین پر آ رہے گی لیکن ہونا ہی تھا۔ ایسے موقعہ پر نوزائیدہ درخت زمین میں پاؤں گاڑ کے اپنی "ماں" کو سہارا دے دیتے، فطرت نے طویل عمر بخشنے کا نیا حل سوچا تھا!

میں ایک قہوہ خانے میں ناشتہ کر رہا تھا کہ مالک نے ایک گاہک کو کہا "بل میری بیوی کو ادا کر دیجئے۔"

"معلوم ہوتا ہے اس ملک میں بھی بیگمات پرس کنٹرول کرتی ہیں؟" میں نے برسبیلِ گفتگو مالک کو کہا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عورتیں ہر کام میں برابر کی شریک ہیں، تمھارے ساتھ جو دو عورتیں کوفی پی رہی تھیں ٹیکسی چلاتی ہیں۔" ایک صاحب نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا، چھوٹا قد گھٹا ہوا جسم نچلا ہونٹ موٹا اور اُبھرا ہوا، سر پہ گرم کپڑے کی جھبے دار ٹوپی، میں ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ اُس نے دوسرا موضوع شروع کر دیا "اس ملک میں LOBBYING کا بہت رواج ہے، فرنیچر خریدو تو برابر کئی سال تک اصل پہ سُود دینا پڑتا ہے حالانکہ قسط کی ادائیگی کے ساتھ اصل گھٹتا رہتا ہے، LOBBYING کی وجہ سے ایسی باتوں میں رائے عامہ بے بس ہو کے رہ جاتی ہے، سفید پوش طبقہ کی کوئی یونین نہیں حالانکہ یونین کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہے۔ ان مالکوں کو دیکھو لاکھوں یہ ثابت کرنے کے لیے تو خرچ کر دیں گے کہ یونین غیر قانونی ہے لیکن مزدوروں کو نہیں دیں گے۔"

ٹیسڈ باتیں کرتا کرتا میرے ساتھ قہوہ خانے سے نکل آیا اور اب چوراہے پہ کھڑے ہو کر اپنے نقطۂ نظر کی شدّ و مد سے وضاحت کرنے لگا، میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں اور میرا صبر بھی میں دل میں کہہ رہا تھا "خدا کے لیے اب مجھے معاف کرو اور جانے دو، سوا دس بج رہے ہیں، میڈ گاسکی باہر چلا جائے گا پھر میں اُسے CONTACT نہ کر پاؤں گا" لیکن توبہ کیجیئے فصیح الزّمان بے تکان بولے جا رہا تھا، میں نے سوچا "تم تو کہہ رہے تھے تم نے رتجگا کیا ہے۔ ساری رات ٹیکسی چلاتے رہے ہو تو اتنی انرجی کہاں سے آئی؟ اور تمہارا SEMI STIFF کالر ابھی تک چمک رہا ہے۔" ظاہر تھا کہ میرے خیالات اُس کی روانی میں مخل نہیں ہو سکتے۔ وہ کہہ رہا تھا "جانتے ہو چینیوں نے پانچ بلین درخت لگائے ہیں، جب کوئی پودا مُرجھا جاتا ہے یا پنپ نہیں پاتا تو اُسے اُکھاڑ پھینکتے ہیں۔

اور اُس کی بجائے دوسرا بوتے ہیں، پانچ بلین بڑی تعداد سے کم نہیں ہوتے اور رُوس میں ہر سال پچاس ہزار سائنسدان فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور امریکہ میں صرف بیس ہزار، روسی اپنے سائنسدانوں کو بڑی مراعات دیتے ہیں" میں سوچنے لگا ٹیسبنڈ کا تعلق کسی خاص سیاسی گروپ سے ہے یا وہ محض اُن لوگوں میں سے ہے جو ہر مسئلہ پر اپنی رائے رکھتے ہیں۔

———

یہ ایک غیر معمولی کورس تھا، مختلف عمروں کے اور مختلف عہدوں پر فائز چالیس امریکن مرد اور عورتیں اس کورس کے لیے جمع ہوئے تھے، تنہا میں غیر ملکی تھا، لیک ایرو ہیڈ لاس اینجلز سے تین گھنٹے کی مسافت پر جنوبی کیلیفورنیا کی پہاڑیوں میں واقع ہے، علاقے کی رعنائی سیاحوں کے لیے مسلسل کشش کا باعث ہے، بے شمار سیلانی ایرو ہیڈ کی جھیل میں بوٹنگ اور WATER SKIING کے لیے آتے ہیں، ہماری آماجگاہ گاؤں سے دُور جھیل کے پرلے سرے پہ تھی اور بجائے خود ایک دلفریب آبادی بن گئی تھی، سرسبز لان، اونچے نیچے راستے اور اُس سے ملحق وسیع جھیل جس کے سینے پہ موٹر بوٹ دوڑتے اور لڑکے لڑکیاں مرد اور عورتیں تیز رفتار دُخانی کشتی کے پیچھے اپنے آپ کو بیلنس کر کے سطحِ جھیل پہ "شہسواری" کے کرتب دکھاتیں، سرِ شام سطحِ آب کا رنگ بدلنے لگتا، مُوڈ بدلنے لگتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے زمین و آسمان بدل گئے ہیں، فطرت کا مزاج بدل گیا ہے، شفق کا عکس جھیل کو خون میں نہلا دیتا، پھر آسمان کا اپنا رنگ پانی میں منعکس ہوتا اور لہروں کی ہل جُل بھی اُس کی یکسانیت میں مخل نہ ہوتی، بس ہر طرف آسمانی رنگ کی حکومت، کچھ دیر بعد چاند کی کرنیں مچلتی ہوئی لہروں پہ چاندنی اور تاریکی کا عجب امتزاج پیش کرتیں جھلمل جھلمل اور تاحدِّ نظر جھیل کا زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کرتا۔

پہلی شب میں رات گئے کامن روم سے نکلا تو دیکھا سحر زدہ خواب آلود روشنی میں بڑی بڑی امریکن کاریں قطار در قطار سو رہی ہیں، بار اور رقص گاہ میں ہنگامہ بپا ہے لیکن یہ جگہ کتنی پُرسکون ہے، کیا یہ چاندنی ہے؟ میری نگاہ آسمان کی طرف اُٹھ گئی۔ نہیں یہ چاندنی نہ تھی۔ کچھ فاصلے پر بڑے بڑے نیلگوں بلب آویزاں تھے اور یہ خنک روشنی وہاں سے آرہی تھی، پہاڑی پہ لکڑی کے بنے ہوئے آرام دہ مکان، وادی اور مرصّع جھیل، بیدِ مجنوں کی شاخیں پانی کو چوم رہی تھیں، اُس کی سُبک ٹہنیوں سے ہوا سرگوشیاں کر رہی تھی — بیدِ مجنوں کا سایہ پانی میں ڈول رہا تھا...... باہمی تعلقات استوار کرنے کا کورس یہاں منعقد ہو رہا تھا۔

ہم لوگ بیس بیس کے گروپ میں بٹ گئے، پہلی گروپ میٹنگ شروع ہوئی، سٹاف کے ایک ممبر کچھ ہٹ کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ جیسے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں حضرات شروع کیجیے۔ کچھ تامّل کے ساتھ ہر ایک نے اپنا حسب نسب اور شغل بتلایا، جیسے ایک دوسرے کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کر رہے ہوں جیسے کہہ رہے ہوں میں اچھا آدمی ہوں، اُمید ہے آپ بھی شریف انسان ہوں گے، میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں لیکن دو ایک روز میں ہی معلوم ہو گیا کہ دوستی اور شرافت کا یہ پردہ بہت مہین تھا۔ دورانِ گفتگو ہم نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ ایک دوسرے کی عیب جوئی کی پھر اُن نقائص کو دُور کرنے کے لیے ہمدردانہ مشورے دیے، نکتہ چینی طعنے، چھینٹیں، کج بحثی، کج دماغی، احساسِ برتری، احساسِ کمتری، ایک حمام تھا جس میں سب ننگے تھے، کوئی بہت بھدّا تھا، کوئی تکلیف دہ طور پر سنجیدہ اور باوقار (سالا اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے!) کوئی سخت باتونی محفل پہ چھا جانے والا (وڈّا افلاطون دا پتّر تاں ویکھ!) کسی کا ناک ضرورت سے زیادہ لمبا یا توند ضرورت سے زیادہ بڑی ہم یہ بھول گئے کہ ہم مختلف انسانوں سے برتنے کا طریقہ سیکھنے آئے ہیں۔

جان نے کہا کہ جنگ کے فوراً بعد اُسے جاپان جانا پڑا اور اُس کے کئی ساتھی شادی کیے بغیر جاپانی عورتوں کے ساتھ رہنے لگے

مکان میں رہتے تھے۔ جان کا اقرار کرنا تھا کہ اپنے گرد و پیش یہ نظارے دیکھ کر اُسے احساسِ گناہ ہوا کہ یار لوگ تنجے جھاڑ کے اُس کے پیچھے پڑ گئے "ارے میاں لونڈے ہی نکلے تمہارے خیالات میں ابھی پختگی نہیں آئی۔" جب جان کے کانوں کی لوئیں سُرخ ہو گئیں تو گروپ کی بڑی بوڑھی جون اُس کے آڑے آئی "جان تو مجھے اچھا ٹائپ معلوم ہوتا ہے، معصوم اور بے ضرر سا، اس کا ردِ عمل ٹھیک ہی تو تھا، بے چارہ جان!"

کون کہہ سکتا تھا کہ بظاہر بھاری دانہ فقرہ ڈیوڈ کو شیرِ غراں بنا دے گا، فربہ اندام ڈیوڈ کا دستور تھا کہ کلاس میں آتے ہی آرام کرسی پہ یوں دراز ہو جاتا کہ توند نمایاں ہو جاتی، وہ بیزاری کے عالم میں اِدھر اُدھر تکتا جیسے گروپ کی گفتگو یا بحث سے اُسے قطعاً دلچسپی نہیں، جب اُسے کسی بات سے شدید اختلاف ہوتا تو ایسی جلی کٹی سُناتا کہ بولنے والا ہکا بکا رہ جاتا "عجیب آدمی ہے" میں نے ایک دو بار سوچا "پتہ نہیں یہ موٹا سؤر اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔"

ڈیوڈ غرّایا "جون یہ تم ایسی ٹائپ ہو جو جان جیسے نوجوان کی تباہی کا باعث ہوتی ہیں" بات بڑھ گئی اور جون نے رونا شروع کر دیا۔ تب بھی ڈیوڈ کا دل نہ پسیجا "یہ آنسو مجھے کبھی متاثر نہیں کر سکتے، یہ مسکینی اور دلگیری بیتہ نہیں۔ اس نے کتنی زندگیاں تباہ کی ہیں، میرا باپ بچپن میں مر گیا تھا، میری ماں نے مجھے پالا اور جوانی تک یہی حربہ مجھ پہ استعمال کرتی رہی اُس نے مجھے پنپنے نہیں دیا، جس جگہ میں نے جانا چاہا نہیں جانے دیا، دوست، جگہ، شغل، ملازمت، جو چیز اُسے ناپسند ہوتی اُس کا مقابلہ آنسوؤں سے کرتی اور میں بے بس ہو کے رہ جاتا اُس عورت نے میرا کیریر برباد کر کے رکھ دیا، اے لوگو جون ایسی عورت سے خوف کھاؤ، یہ مادرانہ شفقت زندگی تباہ کر سکتی ہے، ایٹم کا سائنسدان ڈیوڈ دل کی گہرائیوں سے بول رہا تھا، چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔

میں نے ایک دو بار گرین کو کہا کہ تم پادری ہو لیکن جب شام کے وقت بھی سیاہ چشمہ لگا لیتے ہو تو مجھے شبہ ہونے لگتا ہے۔ جیسے مونٹی کارلو کے قمار خانے سے وابستہ کوئی انٹرنیشنل قسم کا کروک ہو' یہ بات سُن کے وہ ہنس دیتا لیکن اپنی عادت کا پکّا تھا، کلاس میں آتے ہی فرش پر لیٹ کر منہ ایک طرف کر لیتا اور سرِ شام بار میں کھڑے ہو کر خوب وسکی پیتا، ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا پھر جانے کیا بات ہوئی کہ اُس کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا اور خوابیدہ سوتے اُبل پڑے، ہر لہو و لعب میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینے والا بھوری مونچھوں والا گرین زار و قطار رو رہا تھا، سیاہ چشمے نے آنکھوں کو ڈھانپ رکھا تھا مگر رواں آنسو کہاں چھپتے تھے، گرین کہہ رہا تھا "میرا باپ معمولی خاندان سے تھا، اُس نے ایک اونچے خاندان کی لڑکی سے شادی کی لیکن میرے ننھیال اُسے کبھی خاطر میں نہ لائے وہ ہمیشہ اُسے دہقان ہی سمجھا کئے، میرا مظلوم باپ! یہ جانتے ہوئے کہ اس کام میں اور مجھ میں بُعد المشرقین ہے میں نے پادری بننے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی ایک پیشہ تھا جو محنت کئے بغیر مجھے لوگوں کی نظروں میں عزت اور وقار بخش سکتا تھا!"

اگلے روز ہی ہلڈا کی باری آ گئی، دُبلی دراز قامت متوسط العمر ہلڈا: "میرا خاوند جنگ میں اپاہج ہو گیا تھا، اب وہ کوئی کام نہیں کر سکتا، میں روزی کمانے کے لیے کافی مشقّت کرتی ہوں۔ مجھے کوئی گلہ نہیں لیکن جب تھکی ہاری میں گھر لوٹتی ہوں تو مجھے دلاسہ دینے والا میری ہمت بندھانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ بچوں کے علاوہ مجھے اپاہج خاوند کی نگہداشت بھی کرنی ہوتی ہے، کاش کوئی مجھے بھی سہارا دے سکتا، میں اس بوجھ کو کب تک برداشت کروں میں عاجز آ گئی ہوں۔"

جین زاہن کسی کالج میں سوسیالوجی پڑھاتی ہے، اس کی باتوں میں مٹھاس ہے، جب کہتی ہے "میں تم سے بالکل متفق ہوں" تو

مجھے آگ لگ جاتی ہے کیونکہ میں خوب سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ سے ذرہ بھر اتفاق نہیں کر رہی۔ جین اچھے آداب کی مالک ہے، بات بات پر مسکرا دیتی ہے لیکن بناوٹ اور ملمع بھلا کہاں چھپتا ہے وہ اس کی بات بات سے ترشح ہے۔

"ان سے آپ ملی ہیں؟ ہمارے پاکستانی دوست؟" کسی نے جین سے میرا تعارف کروایا۔ "جی ہاں یہ تو ہمارے گروپ میں ہیں بلکہ ڈنر کے وقت میری میز پر تھے، سچ کہتی ہوں یہاں آ کر ایسی پر لطف نشست نہیں ہوئی تھی۔" جین ہاتھ باندھتا ہوں۔ جانے دو۔ کہاں تک بنو گی اور دنیا کو بناؤ گی، دنیا سخت گیر ہے، ہنسنے والوں کو کہاں بخشتی ہے۔

پال اور میں ایک ہی کمرے میں مقیم تھے، سن پچاس کے لگ بھگ ہوگا، وہ ایک خوش خلق اور شریف آدمی تھا، یونیورسٹی میں فزکس کی پروفیسری چھوڑ چکا تھا، اب وہ اور اس کی بیوی ایک فارم پر مقیم تھے، اس کا کہنا تھا "لوگ باہمی تعلقات کے سلسلہ میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں، اس دنیا میں انسان کو انسان کی ضرورت ہے لیکن خود اپنی بیوی کے ساتھ میرے تعلقات ہمیشہ خوشگوار نہیں رہے، میں بیوی کے معاملے میں خوش نصیب ہوں۔ وہ بڑی سمجھدار عورت ہے لیکن مجھے پیرانوئے کی تکلیف ہو گئی تھی، ایسے لوگ نہ صرف بے حد حساس ہوتے ہیں بلکہ ان میں احساسِ کمتری بھی شدت سے ہوتا ہے، میں کبھی اپنے آپ کو حقیر کیڑا سمجھتا ہوں اور کبھی شہنشاہ، میں نے تمہیں بتلایا تھا میری ماں کا خیال تھا کہ اس کا بیٹا بہت بڑا سائنسدان بنے گا اور ایک دن آئن سٹائن کی طرح نام پیدا کرے گا۔ میں بھی آئن سٹائن بننے کا خواب دیکھنے لگا، وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا بلکہ اس شکست سے ذہن میں ایسا الجھاؤ پیدا ہوا کہ مجھے یونیورسٹی کی پروفیسری سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

پندرہ روزہ کورس کے اختتام پر ہم ایک دوسرے کو کسی حد تک سمجھنے لگے تھے، انسان اپنے دکھوں کا بوجھ پیٹھ پر لادے پھرتا ہے، دیکھنے میں کوئی مطمئن نظر آتا ہے کوئی مسرور کوئی مغموم، ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی انسان سے صرف اس لیے متنفر ہو جائیں کہ اس کی توند بڑی ہے یا ناک لمبا ہے اس کی طرزِ گفتگو مختلف ہے یا وہ غیر معمولی طور پر حساس اور زود رنج ہے، اس کی تہہ میں ضرور کوئی وجہ ہو گی، انسانی فطرت کی بہت سی گتھیاں ہمدردانہ سلوک سے سلجھ سکتی ہیں، انسانی تہذیب و تمدن کی صدیاں گزر گئیں لیکن امتدادِ زمانہ کے باوجود انسانی فطرت اک معمہ رہی۔ انسان انسان کو سمجھ نہ سکا۔

پندرہ روز کی ایسوسی ایشن کیا ہوتی ہے لیکن پال کو اصرار تھا کہ واپسی پر لاس اینجلز میں میں اس کے ساتھ کیلیفورنیا کلب میں ٹھہروں، میں نے ایک دو بار کہا مجھے اسی ہوٹل میں جانے دو جہاں لیک ایرو ہیڈ جاتے ہوئے ٹھہرا تھا لیکن بالآخر پال کے خلوص کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، کلب پہنچنے پر پال نے کہا "میں تمہارے لیے بہت کچھ نہ کر سکوں گا۔ کل میری مصروفیتیں مختلف ہوں گی لیکن جب تک تم لاس اینجلز میں ہو میرے مہمان ہو۔ جب کوئی بل آئے اس پر میرا نام لکھ دو، کھانا کمرے میں کھانا چاہو تو بلا تکلف منگوا لو۔ بال ترشوانے اور کپڑے دھلوانے کا انتظام بھی کلب میں ہے۔"

پال شائستگی کی تصویر تھا، اسے ہمیشہ میری خاطر مقصود ہوتی جیسے میں اس اجنبی ملک میں اسی کا مہمان ہوں۔

جاپان کی جانب طویل پرواز بیحد بے کیف تھی۔ جہاز کے انجنوں کا مدھم مسلسل شور ایک تھکی ہوئی بے جان آواز کی مانند تھا، مسافر سیٹوں سے چپک کے رہ گئے تھے اور خیالات کی دنیا میں گم جیسے آسیب زدہ ہوں، جیسے کسی بددعا کے زیر اثر اس سفر کا انت نہ ہو۔ باہر سین

کی یکرنگی طبیعت پہ گراں گزر رہی تھی، جہاز ساکت تھا، نیچے نیلگوں سمندر ساکت تھا۔ دونوں یوں ہم آہنگ تھے جیسے ساکت ہوں، جہاز کی VIBRATIONS تک محسوس نہیں ہو رہی تھیں، بچپن میں ریل کی تیز رفتاری کا اندازہ اُن کھمبوں سے لگاتے تھے۔ جو اُلٹی جانب بھاگتے تھے لیکن یہاں تو ایسا کوئی نشانِ راہ نہ تھا، سورج ساکت تھا، جہاز ساکت تھا۔ نیچے پانی کی لہریں جیسے منجمد ہو کے رہ گئی ہوں اُن پہ سورج بے رحمی سے چمک رہا تھا۔ ہاں سطحِ سمندر پر جہاز کا مجوب سایہ اس بات کا پتہ دیتا تھا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں ——— سورج STEADY تھا۔ جیسے آج نہیں چھپے گا، جیسے وہ دن جو صبح چار بجے SEATTLE سے شروع ہوا آج نہیں ڈھلے گا جیسے سورج ہم سے اس پرواز کا انتقام لینے پہ تُلا ہو جو DATE LINE کے خلاف تھی جو قدرتی نظام کے خلاف تھی، میری گھڑی شام کے سات بجا رہی تھی لیکن یہ وقت درست نہ تھا، اُس مقام پہ صحیح وقت چار بجے سہ پہر تھا۔ جہاز والے مروّت برت رہے تھے، رات کا کھانا چار بجے SERVE ہو رہا تھا ——— اب سین بدلا ——— ہم دھوپ میں نہائی ہوئی دُھند کے نرغے میں آ گئے ہیں، باہر چکدار دُھند کے سوا کچھ سُجھائی نہیں دیتا، جہاز اُسی بے مقصد انداز میں دُھند کے بیچ اُڑ رہا ہے۔

جاپان کے ساتھ چیری کے شگوفوں کی ایسوسی ایشن تھی، جاپان اُس پیارے افسانے کی یاد دلاتا تھا جو بہت سال ہوئے کسی رسالے میں چھپا تھا۔ "جاپان میں رومان" جس میں سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ایک جاپانی مصوّر اپنی فرنگی محبوبہ کی خاطر جان سے جاتا ہے...... ٹوکیو کا شہر خوابوں کی ایک دنیا تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھروندے اُن میں رنگدار کاغذ کی سکرین لکڑی کے بنے ہوئے ننھے پُل، کمونو میں ملبوس باوقار عورتیں مسکراتے ہوئے بچوں کی آنکھوں پر ہلکی سی سرخ، رات کے وقت جاپانی ٹی گارڈن میں لالٹینوں کا ٹمٹمانا مختلف مقامات اور مختلف وقتوں میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر تو ضرور ہوا لیکن چونکہ خواب اور زندگی میں بُعد ہے اس لیے ٹوکیو کے تنگ اور کثیف گلی کوچوں اور بازاروں میں مردوں اور عورتوں کا ہجوم غیر ملکی دیکھا، پتھریلی زمین سے نانِ شبینہ نوچ لینے والے غیرت مند جاپانی نہ صرف رہنے کا قرینہ جانتے تھے بلکہ محنتِ شاقہ بھی اُن کی گھُٹی میں پڑی تھی یونیفارم میں ملبوس سولہ سالہ تنومند لڑکی ٹورسٹ بس کی کنڈکٹر تھی اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں بیحد مستعد۔ ہر شاپ پر سب سے پہلے باہر پھلانگ جاتی اور سیٹی بجا کے ڈرائیور کو گاڑی REVERSE کرنے میں مدد دیتی، وقتِ مقررہ پر تھرموس سے گرم چائے نکال کر مسافروں کو پیش کرتی اور جب بس پہاڑی علاقے سے گزرتی ہوئی ایک دلفریب مقام پر پہنچی تو لڑکی نے میکانکی طور پر ایک جاپانی راگ الاپنا شروع کر دیا گویا وہ بھی فرائض میں شامل تھا، باتوں باتوں میں اُس نے بتلایا۔" میرا گاؤں ٹوکیو سے سو میل کے فاصلے پر ہے، ہم چھ بہن بھائی ہیں، میرے ابّا کی چھوٹی سی کاغذ بنانے کی فیکٹری ہے، ایک سال ہوا میں ملازمت کے سلسلے میں ٹوکیو آ گئی تھی ہماری رہائش اور خورد و نوش کا انتظام کمپنی ہی کرتی ہے گو ہماری تنخواہ سے رقم کاٹ لی جاتی ہے......

"آپ نے کام صبح آٹھ بجے شروع کیا تو ٹوکیو لوٹنے پر آپ کی ڈیوٹی ختم ہو جائے گی؟"

"جی نہیں ہم ٹوکیو رات کے آٹھ بجے پہنچیں گے، کھانے کے لیے ایک گھنٹے کی چھٹی ہو گی پھر نو سے گیارہ بجے تک میرے ذمے بس کو دھونے اور صاف کرنے کا کام ہو گا......!"

"ہفتہ میں ایک دو چھٹیاں ہو جاتی ہوں گی؟"

"جی ایک ماہ کام کرنے کے بعد چار روز کی چھٹی ملتی ہے، چھٹیوں میں بالعموم میں والدین کے پاس ہو آتی ہوں۔"

تاکاشمایا کے عظیم ڈیپارٹمنٹ سٹور کے ریستوراں میں کھانا کھا چکنے کے بعد میں بل کی رقم میز پر رکھ کے چل دیا، مغربی رواج کے مطابق ویٹرس کے لیے کچھ ریزگاری چھوڑ دی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں ویٹرس ریزگاری تھامے بھاگی آرہی ہے "نو سر نو ٹپ نو ٹپ"۔

یہ ریستوران ڈیپارٹمنٹ سٹور کی سب سے اوپر والی منزل میں تھا، کھانا کھا چکنے کے بعد یوروپین لباس میں ملبوس عورتیں اور مرد نیچے جانے کے لیے بے تاب تھے۔ لفٹ کے دروازے پر خاصا جمگٹا ہو گیا تھا۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک دراز قامت باوقار بزرگ لمبی ڈاڑھی فیلٹ ہیٹ جبہ اور کھڑاواں پہنے چلے آرہے ہیں۔ صورت سے کسی معبد کے راہب معلوم ہوتے تھے۔ دفعتاً رستہ پھٹ گیا۔ لوگ دو رویہ کھڑے ہو کر فرطِ عقیدت سے جھک گئے اور وہ بزرگ مسکراتے ہوئے لفٹ کے دروازے تک پہنچ گئے، جاپانیوں نے مغربی طریقے اختیار کئے ہیں لیکن "مغرب زدہ" نہیں ہوئے!

کابوکی جاپان کا کلاسیکی تھیٹر ہے۔

سٹیج ہماری عام سٹیج سے چار گنا بڑی ہوگی، رنگوں کے استعمال میں جاپانی صناع کمال دکھا رہے تھے۔ طلوعِ آفتاب یوں پیش کیا گیا، نورانی تڑکا پھر نارنجی رنگ کا سیل اور طیور کا چہچہانا، اسی طرح غروبِ آفتاب کا منظر بالکل قدرتی تھا۔ اودے رنگ کا دھواں وادی میں اترنا شروع ہوا جیسے سرِ شام گہرے سایوں کا نزول جاپان کی پہاڑیوں پہ ہوتا ہے، بجلی کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی اور پس منظر میں بادل گرج رہا تھا، جاپانیوں نے متعدد بین الاقوامی مقابلوں میں رنگوں کی آمیزش اور بہترین فوٹوگرافی کا انعام یوں ہی نہیں جیتا۔

ایک المیہ سٹیج کیا جا رہا تھا، گردن زدنی آنکھوں سے نہاں بانس کی سبک تیلیوں کے پیچھے ہو رہی تھی لیکن خوف و ہراس اُن لوگوں کے چہروں سے عیاں تھا جو وہاں جمع ہو گئے تھے۔ اب یکایک ایک لق و دق صحرا سامنے تھا، بے آب و گیاہ، سورج کی چمک بھی بے رونق تھی، یہ اُن ہولناک سفاکیوں کی سزا تھی جو شہزادہ نے روا رکھی تھیں، بے گناہوں کا خون اُس کے ضمیر کو ڈس رہا تھا، انسان صدیوں سے اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ غارت گری سے وہ اپنی عظمت کا سکہ بٹھا سکے گا۔

ٹیسکونا کا رقص بھی ایک قدیم اسطورہ سے متعلق تھا۔ وہ بہت ہی سُندر تھی اور اپنی محبت میں مگن۔ اس کا محبوب جنگ میں چلا گیا۔ پھر واپس نہ لوٹا، غم واندوہ سے نڈھال ہو کر ٹیسکونا نے دریا کی لہروں میں اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ عالم رویا میں ٹیکونا مشہور شاعر اکاہیتو پہ ظاہر ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سبک سار کشتی، نیلگوں سمندر۔ دہقانی ساز اور سحاب کا دزدیدہ نزول، کسانوں کی اس سادہ بستی میں اکاہیتو نے بنسری پر لافانی محبت کا نغمہ گایا، ٹیکونا نے پروانہ وار آخری رقص کیا اور پھر یونر سیتا کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئی، شاعر نے اُسے چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن طلسم ٹوٹ چکا تھا، وہ شمع و فا جل بجھی تھی۔

قوس قزح کی عظیم کمان دریا کے ایک حصے پر محیط ہو گئی تھی۔

اس زاویے سے مرمریں آبشار نے اِک نیا روپ دھار لیا تھا، سپید براق برف کی مانند بے داغ نور کا دھارا نیچے اتھاہ گہرائیوں

میں گم ہو رہا تھا۔ لاکھوں رنگ زدہ قطرے منتشر ہو کر اُبھرتے اور مہین چادر کی صورت اختیار کر لیتے، وہ اس بات کی خبر دے رہے تھے کہ اُن کے ساتھیوں پہ کیا بیتی ہے۔ دراصل انھوں نے باقی ساتھیوں کا پردہ رکھ لیا تھا۔ سورج کی روشنی کا عکس جب ان مہین ذرّوں پہ پڑتا تو قزح کی عظیم کمان بن جاتی جو دریا پہ تاج کی طرح جلوہ فگن تھی، اس نورانی چادر نے بے رحم پتھروں کو چھپا لیا تھا اور زیرین حصے کی گہرائیوں میں گم ہو جانے والے دریا کو بھی، نور کا ایک دھارا تھا جو اپنے آپ میں جذب ہو رہا تھا۔

جیسے قوس قزح مقید نہیں کی جا سکتی، خوشی کو مقید کر لینا انسان کے بس میں نہیں۔ پتھروں سے ٹکرا کے قطرے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور سورج کی شعاعیں اُن پہ قوس قزح بُن دیتی ہیں، انسانی رنج و راحت کی کیا حقیقت ہے؟ دھنکی ہوئی قزح کے پھیلے پھیلے خوبصورت رنگ اور آبشار کے پہلو میں اُس کا بار بار بننا بگڑنا کیا اس بات کی شہادت نہیں دیتا کہ غم اور حسرت دیرپا نہیں۔ خواہ وہ مسرت کا لمحۂ عابیہ ہو یا غم و اندوہ کی جانگداز ساعت!

خوشبو کا گھاؤ

نوید انجم

پہلے اس کا دل چاہا کہ روشن بلب کے عین نیچے کھڑی ہو کر اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دے۔ پر جب اس نے اپنی قمیص اتاری تو اُسے شرم آگئی اور اپنی لمبی پلکوں کو جھکا کر اُس نے جلدی سے بتی بجھا دی۔

کمرے میں تاریکی کا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا تھا!

چند لمحے وہ چارپائی کی پائنتی کھڑی رہی۔ گم سم سی چپ چاپ اور پھر بڑی آہستگی اور نرمی سے اس نے خود کو کپڑوں کی قید سے آزاد کرنا شروع کر دیا اور انھیں اپنے سینے سے لگائے اس نے ہولے ہولے اپنے رخساروں کو ان سے چھو چھو دیا۔۔۔ اس کے سراپے میں جھرجھری کی لہریں دوڑنے لگیں اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا اندھیرا اس کی نس نس میں اترتا چلا گیا۔

بند دروازے کے پیچھے اپنے پنجے مارتے ہوئے بھوری بلی میاؤں میاؤں چلاّئی۔

غڑاپ سے وہ اپنے لحاف میں گھس گئی جیسے چارپائی ایک تالاب کا روپ اختیار کر گئی تھی اور وہ ایک ایسی تیراک ۔۔۔ جو تیرنا جانتی ہی نہ تھی۔

اس حرامزادی کو بھی اسی وقت میاؤں میاؤں کرنا تھا۔ اس نے اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "جانے کیا تکلیف ہے موئی کو ۔۔۔ مرتی بھی نہیں!" اس نے سینے پر رکھے ہوئے ہاتھ کو ذرا سا دبایا اور پھر لبوں نے پھیل کر مسکراہٹ اپنالی۔ "ضرور بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی ہو گی! بدنصیب!"

اُس شام وہ چھت پر اپنے اس دوپٹے کو لینے گئی تھی جسے دھو کر اس نے دوپہر کی دھوپ میں سکھانے کو وہاں ڈالا تھا۔ بھوری بلی اپنا اِتنا بڑھا ہوا پیٹ لئے پانی سے بھری ہوئی مشک کی طرح اس کے پیچھے چھت پر چلی آئی تھی۔ سامنے کے کوٹھے پر عمران کو اپنی طرف مسکراتا دیکھ کر وہ خواہ مخواہ لرزنے لگی اور جھٹ سے دوپٹہ سر پر لیے نیچے اتر آئی پر وہ نصیبوں کی ماری بلی اوپر ہی رہی اور جب اس نے نیچے آکر پچ پچ کر کے اس نامراد کو بلایا تو کمبخت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چھت پر سے نیچے چھلانگ لگا دی اور سیدھی فرش پر آرہی!

بلی کے پنجے دروازے پر لگنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ رضو نے لحاف اپنے جسم کے گرد لپٹا لیا اور اپنی نرم بانہوں پر اپنا بالوں بھرا سر رکھ لیا۔ نامراد کو اور تو کچھ نہ ہوا البتہ تین چار روز بعد جب وہ منہ کھولے چھوٹے سے بچے کی طرح چلاّ چلاّ کر رو رہی تھی

تو اس نے دیکھا منحوس کا اِتنا بڑا پیٹ پچک کر رہ گیا تھا ——— اس لمحے اسے یوں احساس ہوا تھا جیسے چھت پر سے گرنے سے اس کا حمل گر گیا ہو۔

پر اماں کہہ رہی تھی "نامراد جانے کہاں جا کر جُن آئی ہے کہ بلا کھا گیا بلونگڑوں کو ——— اب ادھر بیٹھی نصیبوں کو رو رہی ہے۔ بے ہے ماھتا کی ماری ہے نا!"

اس لمحے اس کا دل چاہا ہوئے سے کہہ دے "نہیں اماں، بیچاری کا حمل گر گیا ہے ـــ" پر کہہ نہ سکی اور معنی خیز نظروں سے بلی کو تکتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اماں پہلے ہی کہتی تھی یہ لڑکی اُلٹی پلٹی باتیں کرتی ہے۔ پر اس صبح جب عمران کی بھابھی سیڑھیوں سے گری تھی تو یہ اماں ہی تھی جس نے ابا کے سامنے پچ پچ افسوس کرتے ہوئے بتایا تھا "بدنصیب کا حمل گر گیا ———"

اور اماں اس بار کہتی تھی "کو کھ جلی بچوں کو روتی ہے حرامزادہ بلا کھا گیا ہے نا"

دیوار کی کھڑکی کے پٹ بند تھے پر ایک ہلکا سا سرد جھونکا جانے کیسے کمرے میں آ گھسا اور لحاف سے باہر اس کی ننگی گردن کو چھو گیا۔ کندھے سکوڑ کر اس نے گردن پر اپنے دونوں ہاتھ دھر لیے۔ لحاف کی نرمی کیسی اچھی تھی اور کسمسا کر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ عمران کے ہاتھ بڑے نرم تھے پر اس رات جب اس کی کلائی اس کے ہاتھوں میں تھی تو اُن کی نرمی نے کیسے اس قدر سختی اختیار کر لی تھی؟ اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے لوہے کی سلاخوں نے اُسے جکڑ لیا ہے ـــ اس نے کلائی کے گرد لحاف لپیٹا پر وہ سختی کہاں! خود کو ڈھیلا چھوڑ کر اس نے ہلکے سے سانس چھوڑ دیا اور پلکیں آہستگی سے جھپک دیں۔

تاریکی گہری تھی اور اُسے لحاف کا گہرا سُرخ رنگ نظر نہ آ رہا تھا۔ البتہ محسوس ضرور ہوتا تھا اور اس وقت اس کا دل چاہا کہ بتی جلا کر اُس کی تیز روشنی میں کھڑی ہو کر اپنے آپ کو دیکھے۔ خود کو اس طرح دیکھنے کی یہ خواہش اچانک ہی بیدار ہو رہی تھی ——— آج سے نہیں کئی دنوں پہلے سے جب عمران کی بہن میکے آئی تھی اور ساریوں نے اُسے گھیر کر کھُسر پھُسر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے لجاتے شرماتے بہت کچھ بتایا مگر ان گھیرنے والیوں کی تسلی نہ ہوئی تھی۔

"پر اس نے بتی کیوں جلائی تھی ری؟"

"ہائے!" کتیا کیسے بن رہی تھی۔

"اری بتا نا ——— کچھ تو بتایا ہو گا نا ———"

"تُو تو شرما گئی ہو گی؟" اس نے ہمت کر کے پوچھا تھا۔

اس نے شرمانے کی بجائے غور سے اُسے دیکھا اور گھیرنے والیوں نے گھور کر پلکیں جھپکائیں "اری چھوڑ! یہ بتا آخر بتی جلانے سے اس کا کیا مطلب تھا؟"

کیسی ڈھٹائی کے ساتھ اس نے نخرے کرنے کے بعد بتایا تھا "اے مجھے دیکھنے کو!"

وہ سب کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ مگر یہ سوچ میں ڈوب سی گئی اور پھر جیسے سوچ کی ندی میں ڈوبتی ہوئی اُبھری، کھلکھلا کر ہنسی اور پھر ڈوب گئی!

پھر وہ موضوع کی تلاش میں رہی پر اماں تو جیسے ایک منٹ بھی اُسے اکیلا نہ چھوڑنے پر تلی بیٹھی تھی۔ مجال ہے جو اُسے چھوڑ کر

خود کہیں بیٹھ کر اکیلی کام کرے۔ سائے کیطرح ساتھ لگی رہتی تھی اور گودام میں سے گوندھنے کو آٹا لاتے وقت اس نے گریبان ذرا سا کھولا اور پلکیں جھکا کر خود کو دیکھا۔ پر یہ دیکھنا بھی کوئی دیکھنا ہوا ــــــ ؟ اماں کے پکارنے پر آٹے سے تھالی بھر کر وہ باورچی خانے میں لوٹ آئی۔

"اے میں کہوں ــــ یہ گلے کے بٹن کیوں کھُلے ہوئے ہیں ؟"

چونک کر اُس نے اماں کے کُرتے کے کھُلے ہوئے ایک بٹن کو دیکھا اور اپنے گلے کے بٹنوں پر اس کی اُنگلیاں تھرکنے لگیں۔

ایک شام موقع مل گیا۔ ابا کسی دوست سے بیٹھے بیٹھک میں باتیں کر رہے تھے اور اماں پڑوسن کو کسی بات کی مبارکباد دینے گئی ہوئی تھی۔ تیزی سے وہ اس کمرے میں آئی جسے ابا اپنا کمرہ کہتے تھے اور اماں اپنا سمجھتی تھی لیکن اب رضو اُسے دل ہی دل میں اپنا کمرہ کہنے لگی تھی اور اپنی اکثر چیزیں اسی جگہ رکھنے لگی تھی جس پر نہ تو ابا نے اعتراض کیا اور نہ ہی اماں کچھ بولی اور یوں وہ کمرہ رضو کا تھا جہاں اب وہ منٹ دو منٹ تنہا بیٹھی رہ سکتی تھی۔

کمرے میں آکر اُس نے دیکھا۔ اندھیرا کچھ زیادہ نہ ہوا تھا۔ اُسے افسوس سا ہوا۔ روشنی زیادہ اندھیرے میں کیسی بھلی لگتی ہے اور اس کے چہرے پر افسوس و مسرت کی ملی جلی ایک لہر دوڑ گئی۔ بتی جلا کر وہ پلٹی اور اُس کے ہاتھ اپنی قمیض کے گلے تک جیسے اپنے آپ بہک کر پہنچ گئے۔

اسی لمحے دروازے کو کسی نے کھٹکھٹایا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے ہاتھ گلے سے سینے پر آ کر ٹھہر گئے۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی وہ دروازے تک آئی۔

"کون ہے ؟" اس نے ضبط کر کے پوچھا۔

"میں ــ میں" ہلکی سی آواز آئی۔

وہ دروازہ ہرگز نہ کھولتی پر اس وقت غصے میں اس کے ہاتھ دروازے کی کنڈی پہلے ہی سے کھول چکے تھے اور اب وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ لبوں پر وہی شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہی مسکراہٹ جو اُسے چھت پر دیکھتے ہی اس کے شریر لب اپنا لیتے تھے اور سیاہ لمبی پلکوں والی موٹی آنکھوں میں بھی ایک ایسی چمک تھی کہ اُس سے دروازہ بند نہ کیا گیا۔

"کیا بات ہے ؟" اُس نے اپنی مسکراہٹ پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔

"ایک کام تھا" عمران کی مسکراہٹ اور زیادہ پُر اثر ہو گئی۔

"کیسا کام ؟"

"بس پورا ہو ہی گیا ہے"

"کیسے ہو گیا ہے ؟"

"حضور کو دیکھنا تھا سو دیکھ لیا ہے !"

اُس نے تیزی سے پٹ بند کر دیے اور پھر مشکل سے روکی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر مچلنے لگی۔ اُسے بے حد سکون محسوس ہوا۔

ایسا اطمینان جو خود کو بلب کی تیز روشنی میں دیکھ کر بھی نہ حاصل ہوتا۔ پھر ہلکا سا سانس لے کر اس نے تھوڑا سا پٹ کھولا اور جھانک کر دیکھا۔ وہ ابھی تک باہر کھڑا تھا۔

وہ ہکلانے لگی "بس۔ بس یوں مت کہا کرو۔"

"تم مجھے ملتی کیوں نہیں"

"ہائے — ہائے کوئی دیکھ لے گا" اس نے پٹ تھوڑا سا اور کھول دیا۔

"وعدہ کرو ملو گی — میں تمھیں پیار کرتا ہوں — سچ کہتا ہوں!" عمران نے تیزی سے کہا۔

"اچھا۔ اچھا" وہ گھبرا رہی تھی اور خوشی اس کے رونگٹے رونگٹے میں ڈھل گئی تھی "کوئی دیکھ لے گا۔ اب جاؤ!"

عمران کا لہجہ بدل گیا "ہاں مجھے کام تھا۔ بھابھی نے بھیجا تھا۔ اس نے کوئی نیاز دینی ہے۔ تمہاری اماں کو بلوایا ہے۔"

"ماں ساتھ کے گھر گئی ہے۔ آئے گی تو کہہ دوں گی" اس نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر عمران کو دیکھ کر مسکرائی۔

"تو پھر ملو گی نا — کسی روز اکیلے میں —" عمران نے کہا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے دروازے کے پٹ زور سے بند کر دیے!

پھر تو وہ ایسے خیالوں میں کھوئی کہ اماں دیدے پھاڑ پھاڑ کر اُسے تکنے لگی "میں کہوں کچھ ہوش کر۔ جانا کہیں ہو تو رُخ کہیں کا کرتی ہے۔ پانی مانگو تو روٹیوں کی چنگیر لیے دوڑی آتی ہے — اے تجھے کونسی بیماری لگ گئی ہے ری!"

اور اب وہ جو پہلے کپڑے دھونے سے کتراتی تھی۔ اتنے سارے کپڑوں کو لیے بیٹھ جاتی اور مَل مَل کر دھویا کرتی۔

اماں کہتی "یہ رہنے دو — دھوبن لے جائے گی"

تیزی سے کپڑا اُٹھا کر وہ کہتی "اتنے سے کپڑوں کا کیا ہے — اور پھر دھوبن نے کب مفت میں دھو دینا ہے۔ لاؤ مجھے دو — ایک منٹ کا کام ہے!"

کپڑے دھونے میں ایک منٹ لگتا پر انھیں دھوپ میں ڈالنے کے لیے تین تین منٹ لگتے تھے اور اماں اسی خیال میں اپنا کام کیے جاتی کہ وہ ابھی بیٹھی کپڑے دھو رہی ہو گی!

ان تین تین منٹوں میں کیسے کیسے اشارے ہوئے کیسی کیسی آنکھوں نے باتیں کیں — وہ رات کو سوتے وقت سرگوشیوں میں اپنے آپ کو سُنایا کرتی اور ایک روز ساتھ کی چارپائی پر سوئی ہوئی اماں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"اے کیا کہا؟" پلکیں اُچکا کر وہ بولی "اب چین نہیں آتا۔ کیوں!"

"کیا۔ کیوں کیا؟" سٹپٹا کر اس نے کہا۔

"اے میں پوچھے ہوں مجھے کیا کہا تُو نے — کیا نہیں آتا؟" ہونٹوں پہ اُنگلی رکھے وہ بولی۔

"واہ! میں نے کیا کہا بھلا" اُس نے جھٹ سے کہا "میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ بلّی بیچاری کو بچوں بنا چین نہیں آتا"

"اوہ" اطمینان سے ایک سانس لے کر اماں بولی "پر رات گئے تجھے نامراد بلّی کیوں یاد آ گئی — یہ کوئی وقت ہے؟"

"اے اس کے رونے کی آواز جو آئی تھی!"

"اوہ اچھا!" اماں نے آنکھیں بند کرلیں۔

نچلا لب دانتوں سے دباتے ہوئے دل ہی دل میں رضو نے توبہ توبہ کی — اور کچھ دیر کے بعد پہلو بدل کر اُس نے سوچا۔ اگر اماں ساتھ نہ سوئی ہوتی تو میں سارے کپڑے اتار کر ننگی لحاف میں سو جاتی! اور پھر اُسے اپنے تصوّر میں لا کر کہتی — کیا کہتی؟ کیا کہتی؟ اس نے دل میں یہ فقرہ دہرا کر پوچھا اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

لحاف میں سے ہاتھ بڑھا کر اس نے اپنے کپڑوں کو اپنی طرف کھینچا۔ کیسے ٹھنڈے ٹھنڈے سے ہو رہے تھے۔ پر جب اس نے اتارے تھے تو ہلکے ہلکے گرم تھے — اس کی قمیص میں سے اس کی بُو آ رہی تھی اور اُسے اپنے جسم کی بُو بالکل بُری نہیں لگتی تھی۔ ٹانگیں پھیلا کر اس نے اپنے دائیں پیر کا انگوٹھا ہوتے ہوتے ہلانا شروع کر دیا۔ کتنے عرصے کے بعد اُسے یہ موقع ملا تھا — یوں سونے کا۔ یوں اور اسی رات جب اماں بیٹھک کے ساتھ والے کمرے میں ابا کا دُکھتا ہوا سر دبا رہی تھی تو بھی اُسے یوں لیٹنے کا موقع ملا تھا — کپڑے اتار اندھیرے میں جب اپنے جسم پر اس نے ہاتھ پھیرا تھا تو رُوئیں رُوئیں میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور مدہوش ہو کر پلکوں کے پردے بھاری ہو گئے تھے۔ اس نے لحاف اُٹھا کر لیٹنا ہی چاہا تھا کہ اماں کے آنے کی آواز آ گئی تھی۔ تیزی سے اُس نے قمیص پہن لی تھی اور گلے کے بٹن بند کرنے کی کوشش میں چلائی تھی "اے اماں، اماں —!"

"کیا ہے ری —" اماں نے آتے ہی بتی جلائی اور اُسے گھورنے لگی "کیا ہوا ہے؟"

"اے میں کپڑے جھاڑ رہی تھی نا" وہ اٹک اٹک کر بولی "جانے کوئی کھٹمل تھا کہ کیا کہ سارے بدن میں آگ سی لگ گئی — کہ — کہ ایک چوہا —" اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کہے "ہاں وہ چوہا بل سے نکلا تو میں ڈر گئی!"

"توبہ ہے اتنی بڑی ہو گئی پر بزدل ہی رہی!"

اور وہ واقعی بزدل تھی، اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جھلکی۔ روٹی کھاتے وقت ابا نے کہا تھا "بیٹی بیٹھک کا دروازہ بند کر دے" وہ بیٹھک میں گئی اور گلی کی طرف کھلنے والے دروازے کے پٹ بھیڑتے وقت اسے عمران نظر آیا تو بند ہوتے ہوتے پٹ کھل گئے۔ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا — وہ تیزی سے بیٹھک میں آ گیا۔ اُسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ وہ کانپنے لگی "بھاگ جاؤ —" اس کے منہ سے نکلا۔ عمران نے اُس کی کلائیوں کو سختی سے پکڑا اور زور سے کھینچ کر اسے اپنے چوڑے چکلے سینے سے لگا لیا "چھوڑ — چھوڑ دو" کہتی ہوئی وہ اس کے سینے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگی۔ اُس کی قمیص بغلوں کے قریب سے بھیگ رہی تھی اور رضو کا چہرہ وہاں چھو گیا تو عجیب سی بُو اُسے آئی۔ اُسے اُبکائی آ گئی اور منہ پھیرتے وقت اس کے لب عمران کے جھکے ہوئے چہرے سے ٹکرائے اور پھر عمران نے اُسے زور سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ ایک چیخ اس کے حلق میں دم توڑ کر رہ گئی اور خود کو زبردستی علیحدہ کرتے ہوئے، ہانپتے ہوئے بولی "ہائے۔ جاؤ — کوئی دیکھ لے گا — خدا کے لیے آج جاؤ — جاؤ!"

مسکراتا ہوا عمران دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر نکل گیا اور وہ بیٹھک میں پھیلے ہوئے اندھیرے کے تالاب میں ڈوب گئی! اور پھر اماں نے تالاب میں ایک کنکر پھینکا اور پانی کی سطح پر بلبلے اور گرداب پھیلنے لگے "ارے کدھر ہے رضو!"

ابا نے لاپروائی سے حقے کا کش لگایا "ادھر ہی ہے۔"

چونک کر رضو نے دروازہ بند کیا اور دھڑکتے ہوئے دل پر اپنے ہاتھ رکھے ادھر کو چلی آئی۔ اماں کی تیکھی آواز کانوں میں

شہد ٹپکانے لگی تھی "یہیں کہوں تمھیں کبھی فکر نہیں ہو گی۔ لڑکی بوڑھی ہو گئی تو کیا تب ہاتھوں کو مہندی لگانے کا سوچو گے ؟"

ابّا نے جلدی سے حقے کو پرے کیا اور حسبِ دستور ایک گہرا سانس لے کر باہر دروازے سے قدم رکھنے لگے، اماں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چمٹا زور سے زمین پر پٹخا اور چلائی "اے دیکھ لینا کسی روز بیٹھ کے رو دو گے ——— پتہ ہے گلی کے قصاب کی لونڈیا نے کیا..." وہ رُک گئی۔

"اے اماں کیا کیا چھونے ؟" وہ بے اختیار سوچے سمجھے بغیر پوچھ بیٹھی

اماں نے چونک کر اسے دیکھا اور کڑوے لہجے میں بولی "تجھے کیا ؟" اور پھر آہستہ سے ضبط کر کے کہا "ہر بات میں یونہی دخل نہ دیا کر!" اور نظریں بہک کر رضو کے سینے پر جا ٹھہریں۔

رضو نے جلدی سے دوپٹہ سینے پر پھیلایا۔ سانس روکا اور پھر منہ پھیر کر اُس نے دائیں ہاتھ سے سینے کو آہستہ سے چھوا اور پھر گھبرا کر وہ جھکی اور چمٹا اٹھا کر اماں کی طرف بڑھا دیا۔

اُسے اپنے بائیں پیر پر خارش محسوس ہوئی۔ ہاتھ بڑھا کر وہ اُسے کھجلانے لگی۔ خارش میں یوں کتنا مزا ملتا ہے۔ ہلکے ہلکے رگڑنے سے کیسی عجیب سی مدہوشی حاصل ہوتی ہے۔ اُس نے لحاف ایک طرف سرکا کر اپنا پیر دیکھنے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں اُسے اپنا پیر اپنا محسوس نہ ہوا جیسے کسی اور کا پاؤں اس کے سامنے تھا ——— اس کا جی چاہا۔ ہاتھ بڑھا کر اُسے مضبوطی سے پکڑے اور کھینچ کر اپنے چہرے کے قریب لے آئے اور چوم لے ———

چومنے کے بارے میں عمران کی بہن نے اُسے کیا کچھ نہ بتایا تھا ——— کیسے مزے لے لے کر وہ بتاتی، اس نے اس کی گردن، کان کی لو اور جسم کے اُبھرے ہوئے حصے پر ہونٹوں کی حدت محسوس کی تھی اور اس احساس کا لطف وہ جس انداز سے یاد کر کے اسے بتاتی رہی تھی رضو کو نہ بھولا تھا ——— بھولتا بھی کیسے جبکہ عمران نے بھی اس کی گردن کے پیچھے، بالوں سے نیچے اپنے گرم گرم ہونٹ رکھ دیے تھے اور اسے اُن ہونٹوں کی جلن تنہائی کے ہر لمحے میں بے چین کر دیتی تھی۔

دُور شاید باہر دیوار کے قریب بلّی نے پھر میاؤں کی تھی۔

رضو کو محسوس ہوا جیسے اس کی گردن پر بھی کسی نے جلتے ہوئے ہونٹ رکھے ہوں جنھیں یاد کر کے وہ چلاتی پھر رہی تھی اور یہ سوچتے ہی پاگلوں کی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی اور اس نے لیٹے لیٹے انگڑائی لی۔ اس طرح انگڑائی لینے میں کتنا مزا آ رہا تھا!

عمران کی بہن کا میاں ولایت پڑھنے گیا تھا اور وہاں سے کیا کیا سبق نہ پڑھے تھے اس نے ——— سارے ہی تو بیوی پر آزماتا رہتا تھا اور وہ سارے سبق وہ اپنی سہیلیوں کو فر فر رٹ کر سناتی اور کبھی کبھی دوپٹے کا پلو منہ پر رکھے ہنستی اور ہنساتی رہتی تھی۔

ایک بار تو اُس نے وہ تصویریں بھی دکھائی تھیں جو اس کے میاں نے بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں اور وہ اُسے بتائے بغیر اپنی سہیلیوں کو دکھانے کے لیے اٹھا لائی تھی۔ انھیں دیکھ دیکھ ان سب کا شرم سے بُرا حال ہوا ——— پر اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے تصویریں چھین چھین کر دیکھتی رہیں اور ان بے شرموں کو بُرا بھلا کہنے میں بھی کوئی کمی نہ کی اور اس وقت لحاف کو ایک طرف کیے رضو خود کو ایک تصویر کے انداز میں، اس گھُپ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کا دل ایک بار پھر چاہا۔ بتی جلا دے، پر جیسے بتی جلانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ لیکن یہ ڈر کیسا، ان لمحات کی وہ

مالک تھی۔ اب اُسے کوئی خوف بھی نہ تھا۔ اماں گھر سے باہر گئی ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ اپنی پھوپھی زاد بہن کے میاں کے مرنے پر جو جائے تو وہ قل والے دن تک تو وہیں رہنا ہی ہے۔ بیٹی اور خاوند کو گھر میں چھوڑے وہ اطمینان سے تعزیت کو گئی ہوئی تھی اور ابا بیٹھک کے ساتھ والے کمرے میں اپنے ایک دوست کے آنے پر آرام سے سوئے ہوئے تھے ـــ اور آج رات وہ جو جی میں چاہے کر سکتی تھی۔

وہ تنہا ہے ـــ بالکل تنہا اور یہ لمحات اس کے ہیں۔ اس کے سارے بدن میں پھرتی کی ایک تیز رو دوڑی اور وہ کھڑی ہو گئی۔ اس لمحے بے ساختگی سے اُس نے بتی جلا دی!

اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے بدن کو دیکھا۔ وہ خود کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے جسم کا رنگ سنہری ہو رہا تھا اور نس نس میں کھچاوٹ تھی، بیقراری اور بے تابی کی سی کیفیت تھی اور اس کی آنکھوں میں اضطراب کی ایک جھیل پنہاں تھی۔ اُس نے اشتیاق، خوف اور بے تابی سے اپنے آپ کا ایک جائزہ لیا اور پھر اس کی نظریں اس دروازے پر آ کر ٹھہر گئیں جو باہر گلی کی طرف کھلتا تھا۔

تیزی سے اُس نے بستر کی چادر کھینچ کر اپنے اِرد گرد لپیٹ لی، اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دروازے کی دراڑ میں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رگیں پھول گئیں، شرم سے اس کے رخساروں میں جلن ہونے لگی اور سینے کا سانس لحظہ بھر کے لیے رُک کر رہ گیا۔

جلدی جلدی اُس نے اپنے سب کپڑے پہن لیے اور قمیص کے بٹن بند کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف گھورنے لگی۔ نہیں نہیں وہاں کوئی نہیں ہے۔ یہ سب اس کا وہم تھا ـــ وہم ـــ محض خوف تھا۔ اُس نے بٹن بند کر کے بتی بجھا دی اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر دراڑ میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگی۔ نہیں کوئی بھی تو نہ تھا ـــ اُسے کسی نے نہیں دیکھا تھا ـــ پر جیسے دل کو تسلی نہ ہوئی۔ بڑی آہستگی کے ساتھ اس نے چٹخنی کھول لی اور دروازے کا ایک پٹ کھول کر باہر جھانکنے لگی۔

ایک مانوس ہاتھ نے اس کے منہ کو دبا لیا اور زور سے اُسے دھکا دے کر وہ اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے اس کے کانوں کی لو پر اپنے ہونٹ رکھ دیے ”میں ہوں تمہارا عمران!“

”عمران!“ وہ بولنے کے قابل ہوئی تو بولی ”نہیں ـــ نہیں ـــ جاؤ ـــ جاؤ!“

”میں نے تمھیں دیکھا ہے۔“ وہ اُسے بے تحاشا پیار کر رہا تھا۔ اس کے لبوں پر، ماتھے پر، آنکھوں پر، رخساروں پر اور اس کی گردن اس کے جلتے ہوئے ہونٹوں کی حرارت محسوس کر رہی تھی!”تمھیں میرا انتظار تھا۔ میں جانتا ہوں تمھیں میرا انتظار تھا۔“

”نہ ـــ نہ ـــ جاؤ ـــ جاؤ ـــ“ اُس نے کہا۔

”میں تمھیں دیکھ رہا تھا ـــ میری جان ـــ تم مجھے یاد کر رہی تھیں نا ـــ“

”نہیں ـــ“ اس کے حلق میں آواز پھنس رہی تھی۔

”تم جھوٹ کہتی ہو ـــ تم میری راہ تک رہی تھیں۔“ اُس کی آواز بھاری ہو رہی تھی اور ہاتھ بہک رہے تھے۔ ”مجھے تم سے پیار ہے ـــ تم نہیں جانتی زندگی کیا ہے ـــ میں تمھیں بتاؤں گا زندگی کسے کہتے ہیں۔ تم مجھے پیار کرتی ہو۔“

وہ محض نہیں نہیں کہتی رُک گئی ـــ نہیں جیسے اس کے حلق میں دم توڑ کر رہ گیا۔ عمران کے جسم کی آگ نے اس کے بدن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور کراہتے ہوئے وہ اس کے بھاری بوجھ تلے پسنے لگی۔ پھر جیسے وقت کا گھوڑا ہوا کے دوش پر سرپٹ دوڑا۔ تیز اور تیز اور اس قدر تیز کہ اس کے دماغ میں پھلجھڑیاں چھوٹیں، اناروں کے رنگ بکھرے اور رنگ برنگے چکر فضا میں گھومنے لگے، گھومنے لگے اور فضا

میں تحلیل ہونے لگے۔

اس کے بدن کا ہر عضو دُکھ رہا تھا اور ہونٹوں پر خاموشی کا تالا پڑا ہوا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بند دروازے کی دراڑ میں سے کوئی انھیں دیکھ رہا ہے۔ اس اندھیرے میں وہ اسی طرح کسی کو نظر آ رہی ہے جیسے بجلی کی روشنی میں عمران نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ دُکھ اور خوف سے کانپتی ہوئی اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی اُٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کر کے عمران سے کہنا چاہا "کوئی ہے۔ کوئی دیکھ رہا ہے۔" پر اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور آواز حلق میں دم توڑ چکی تھی۔ صرف اس کے سانس کے تیز تیز چلنے کی آواز عمران کی گندی باتوں کے بیچ کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی ــــ اُسے اپنی اٹھی ہوئی اُنگلی ــــ دروازے کی جانب اشارہ کرتی ہوئی اُنگلی اپنی محسوس نہ ہوئی اور کراہتے ہوئے اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

عمران اس کے پہلو میں لیٹا ہوا ہانپ رہا تھا ــــ وہ شخص جو اس سارے عرصے میں اس سے گندی گندی باتیں کر رہا تھا اب خاموش تھا۔ اُس کی آواز ان گندے قصوں کے بوجھ تلے سسک کر محض سانس کی ہلکی ہلکی آواز بن کر رہ گئی تھی ــــ وہ قصے جو رضو کے کانوں میں نشتر بن کر چبھتے رہے تھے اب جیسے فضا میں اپنی بو چھوڑے تاریکی میں تحلیل ہو چکے تھے۔ عمران کے جسم کی وہ بُو جو کچھ عرصہ قبل اُسے خوشبو محسوس ہونے لگی تھی اب ایک ایسی بدبو کا روپ دھار چکی تھی کہ اُسے متلی ہونے لگی۔

اُس نے پہلو بدل کر عمران سے دور ہونا چاہا۔ عمران چونکا اور اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا ــــ ایک جانی پہچانی تھرتھری اس کے سارے جسم میں دوڑی اور نہ چاہنے کے باوجود وہ اس سے لپٹ گئی۔

رات کافی جا چکی تھی جب اندھیرے میں اُس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ باہر نکلتے ہوئے عمران نے اُس کے کانوں میں ہلکے سے کہا "کل رات پھر آؤں گا ــ اچھا!"

"اچھا" اس نے شرما کر کہا اور دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔

چٹخنی لگا کر اس نے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے اپنی چارپائی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ چارپائی کی پٹی پر ہاتھ رکھے اس نے چادر کی سلوٹوں کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ چادر کے بھیگے ہوئے کونے سے چھُو گئے۔ ایک سرد رَو نے اس کے سارے جسم کو جکڑ دیا۔ ہاتھ کھینچ کر اس نے دانت پیستے ہوئے اپنے بازوؤں کو جھٹکا۔ اس کا بس چلتا تو ایک ایک کر کے اپنے دونوں بازو کھینچ کر بازار کی نالی میں پھینک دیتی!

اس ایک لمحہ میں اس کے ذہن میں بہت سے خیال بلونگڑوں کی طرح ایک دوسرے کو پنجے مارنے لگے، نوچنے اور چیخنے لگے۔ جلدی سے لحاف اٹھا کر وہ جسم کو اکڑائے ہوئے لیٹ گئی اور خیالوں کے لڑتے ہوئے بلونگڑوں کو ذہن میں سے نوچ نوچ کر باہر کرنے کی کوشش میں نڈھال ہو کر ہانپنے لگی۔

اکڑے ہوئے جسم کو اس نے آرام دینے کی خاطر ذرا سا پھیلایا تو پاؤں چادر کے اسی سرد کونے سے جا ٹکرایا اور وہ یوں اُچک کر چارپائی سے اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے اس کا پیر کسی سانپ پر جا پڑا ہے۔

کیا یہی زندگی ہے؟ یہی زندگی ہے ــــ اُس نے گھن سے سوچا ــــ اُسے اپنی رانوں میں ٹیسیں اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں اور تکلیف سے اُس نے اپنے ہونٹوں کو سختی سے دانتوں تلے دبایا۔ کمرے کی فضا میں عجیب بو پھیل رہی تھی۔ وہ بو جو کبھی خوشبو کا روپ

دھار رہتی تھی اور کبھی ایک ایسی بدبو بن جاتی جو کسی سڑے ہوئے زخم سے آتی ہے۔

ابکائی روکتے ہوئے وہ اٹھی اور بتی جلا دی۔ روشنی کے سیلاب نے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے عمران نے بھورے پیٹ والی بھوری بلّی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اس قدر زور سے دبایا تھا کہ اس کی ساری انتڑیاں باہر نکل آئی تھیں اور سفید چادر کو داغ لگ گئے تھے۔

دکھ اور تکلیف سے بوجھل آواز حلق میں پھڑپھڑائی اور بُری طرح روتے ہوئے سسکیوں کے ایک شور میں اس کے منہ سے نکلا "اللہ کرے عمران مرجائے — اس سے پہلے کہ رات آئے — اللہ کرے وہ مرجائے!"

چارپائی کی پٹی سے سر ٹکراتے ہوئے، عمران کے مرجانے کی دعا مانگتے مانگتے اس کے ماتھے سے خون رسنے لگا!

مورکے پاؤں

نوید انجم

وہی آغوش جو کبھی نرگس کے لیے راحت اور سکون کا سرچشمہ تھی، جو ایک ایسا سرو تھی جس کی چھاؤں میں بیٹھے بٹھائے وہ مدہوشی کے عالم میں ڈوب جاتی اور کانوں میں بہتے ہوئے چشمے کی مدھم سی آواز اُسے لوریاں سُنانے لگتی، اب ایک ویرانے سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اب تو اس پُرسکون چمن میں کسی آتش فشاں کا منہ پھٹ گیا تھا اور ہر طرف جُھلسے ہوئے گوشت کی سی بساند اور پیپ کی بدبو اس کے نتھنوں کے راستے دماغ میں سڑ سڑ سرکتی جا رہی تھی —— اُسے ابکائی آگئی اور اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے وہ اُٹھی جلتا ہوا بدن اور شعلے کی طرح سُرخ آنکھیں لیے وہاں سے برآمدے میں چلی گئی۔

برآمدے میں سے دیکھتے ہوئے اس نے پھاٹک کے قریب مالی کو دیکھا وہ ہاتھ میں کھرپی لیے کھڑا تھا۔ نرگس نے اس کے کھردرے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے دانتوں تلے اپنا نچلا لب دبایا اور پھر ڈرائنگ روم کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں بیٹھا ہُوا تھا! اُسے دیکھ نرگس نے کانپ کر ستون کا سہارا لیا —— وہ دیوار پہ لگی ہوئی نرگس کی ایک بڑی ساری تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا اور ایسے میں اُسے جیسے کچھ ہوش نہ رہی تھی، نرگس نے اس کا چہرہ دیکھا، گندمی رنگ میں تھوڑا سا دودھ ملا دو تو اس کا رنگ بن جائے اور سیاہ آنکھوں کی لمبی لمبی پلکیں —— اتنی لمبی پلکیں کہ نرگس کو حیرت ہوئی کہ کیا ایک مرد کی بھی اتنی لمبی پلکیں ہو سکتی ہیں اور پلکیں بھی ایسی خمدار کہ دیکھ کر خواہ مخواہ جی چاہنے لگتا کہ کاش ایسی پلکیں اپنی ہو سکتیں —— ! پھر ستواں ناک اور بھرے بھرے گداز لب —— نرگس کو وہ لب انجانے میں اپنے لبوں پہ مس ہوتے محسوس ہوئے اور پھر اس کے وہی ہونٹ پھیل پھیل گئے —— اور اُس نے خوفزدہ ہو کر، نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کیے اُس نے اباجی کے سامنے ہاں کہہ دی تھی جب اماں جی کے پاس اس روز وہ خوش خوش آئے ——

"لو بھئی تم بھی کیا یاد کرو گے —— ہم نے اپنی نرگس کے لیے کیسا اچھا بر ڈھونڈا ہے —— !"

اماں جی نے پاندان بند کیا، چھالیہ منہ میں ڈالی اور کڑ کڑ کرتے ہوئے کہا "کبھی نری کچھ بتہ تو چلے!" اور دانت نکال کر ہنسیں۔

اباّ میاں کو پاندان سے چڑ تھی، جب کبھی نظر آتا تو اماں سے ضرور نوک جھونک ہوتی۔ مگر اس سمے وہ جیسے سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے، اماں کے پان کی پیک سے لتھڑے ہوئے دانتوں کو بھی پسِ پشت ڈالتے ہوئے انھوں نے قریب بیٹھ کر کہا۔

"لڑکا اچھا کماتا کھاتا ہے، فوج میں کپتان ہے، عزت ہے دولت ہے، سبھی کچھ ہے، اب تم ہاں کردو ———"

امّاں جنھوں نے بہت سے رشتے محض اس لیے نامنظور کر دیئے تھے کہ وہ خاندان کے تھے، جلدی سے بولیں "ہیں کون؟
انھیں اپنے خاندان والوں سے اللہ جانے کیا بیر تھا ——— ان کے خیال میں ساروں کی نظریں ان کے بنائے ہوئے جہیز پر ہی تھیں
بلکہ وہ تو یہ بھی سمجھتے تھے کہ جیسے لڑکی ملی، جدی پشتی جائداد بھی مل گئی ——— اور پھر بہت سے ایسے رشتے بھی ان کی نظر میں تھے
جو خانہ بربادی کی مثال بن کر رہ گئے تھے۔

ابّا میاں کو خود بیاہ کر بیٹھنے والے بالکل پسند نہ تھے، چہک کر بولے "جو بھی ہیں۔ اچھے لوگ ہیں۔ نہ تمھارے کچھ
لگتے ہیں نہ میرے بھائی بند ہیں ——— لوگ شریف ہیں اتنا مجھے پتہ ہے اور آج عزت شرافت اور دولت جہاں ہو تو سمجھو کہ
سونے پہ سہاگہ . . . ."

اماں نے بات کاٹی "پر بنا دیکھے تم نے کیسے جانا کہ اچھے لوگ ہیں؟"

ابّا میاں نے کہا "واہ خوب بات کہی۔ ان لوگوں سے میرے کب کے مراسم ہیں ——— وہ اپنے شیخ صاحب ہیں نا ان
کے دوست کا لڑکا ہے ——— میں تو کئی بار ان کے ہاں گیا ہوں اور سچ جانو جی میں کئی بار سلیم کو دیکھتے ہی میرے جی میں خیال آیا کہ اپنا
داماد ایسا ہو تو کیا ہی کہنا ———"

اماں جی کی آنکھیں خوشی کے مارے قدرے پھیل گئیں اور پھر ابّا میاں اور وہ دونوں سر جوڑے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے،
نرگس عمر کے ایسے دور میں سے گزر رہی تھی جب ایسی باتیں ماں باپ کر رہے ہوں تو سُنے بغیر چین نہیں آتا ——— اور
دل آپ ہی آپ بار بار مجبور کرنے لگتا ہے کہ چل سن سکے تو کیوں نہ سُنے ——— اور جب بات ایسی سُنی جائے کہ لڑکے والے آرہے ہیں لڑکی
کو دیکھنے تو جانو کیا جی کا حال ہوتا ہے؟

بس جی کا بُرا حال تھا جب سلیم کی امّاں لڑکی کو دیکھنے آئیں، وہ مارے گھبراہٹ اور شرماہٹ کے ان کے سامنے نہ آئے، امّاں
بار بار بلائیں "اے بیٹی ذری برف تو لا ہو ———"

وہ کانپتے ہاتھوں میں برف سے بھری ہوئی پلیٹ لے کر آئی، ان کے سامنے رکھنے لگی تو وہ بی بی بولیں "ماشاءاللہ کیسے پیارے
نقش ہیں ———"

اپنی تعریف سن، اس کے چہرے پہ سُرخی کی ایک گہری لکیر کان کی لَو سے لے کر رخسار پر سے گزرتی نچلے ہونٹ کے پاس
جا پہنچی اور ہاتھ ایسے کانپے کہ پلیٹ میں جھٹکا لگا اور برف کا ایک ٹکڑا اچھل کر بی بی کے۔ جو اُسے بغور دیکھ رہی تھیں، ہاتھ پہ
جا لگا۔

سٹپٹا کر نرگس نے ہلکی سی چیخ ماری "ہائے میں مر گئی ——— آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟" اور اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں
اُٹھائے ندامت بھرے انداز سے انھیں دیکھنے لگی۔

اُن بی بی کو نرگس کا یہ انداز اتنا پسند آیا کہ اُسی جگہ اور اُسی وقت اماں جی کا منہ میٹھا کرا ڈالا۔

پھر بارات آئی سلیم میاں دولہا بن کر آئے ——— پر یہ کیسے دولہا تھے کہ نہ سر پر سہرا لگا نہ باجا بجا ——— بھئی وہ

نئے نئے زمانے کے لوگ موٹر پہ آئے ، گلے میں بس اک موتیے سے مہکتا ہار ڈالے نئے کپڑے نئے بوٹ پہنے —— کچھ مہمانوں کے ساتھ ، دو چار قریبی رشتہ کے لوگ اور بس —— !

نرگس کی سہیلیوں کو ایسی بارات پہ بڑی مایوسی ہوئی —— اک نے تو دلہن سے اسی وقت کہا "اے بی —— یہ لوگ تو بڑے نئے زمانے کے معلوم ہوتے ہیں —— "

دوسری نے ناک چڑھائی —— "بھلا یہ کوئی برات تھوڑا ہی لگتی ہے —— نہ دولہا سہرا باندھے نہ باجا بجے اور نہ ہی انار چھوٹیں —— !"

پر ایک سعیدہ جو کالج کی ہوا کھا چکی تھی —— بولی "یونہی فضولیات میں روپیہ پیسہ اور وقت ضائع کرنا اچھا نہیں —— سمجھدار لوگ ہیں —— سمجھ سے کام لیا —— اچھا ہی کیا —— "

مگر اس میں کوئی شک نہیں نرگس کا اپنا دل بُرا ہوا ، جی کا ارمان نہ پورا ہوا —— کیا کیا خواب دیکھے تھے ، بارات یوں آئیگی یوں دلہن بن کر جاؤں گی —— سب دھرے کے دھرے رہ گئے —— !

اور ایسے میں اماں جی کا دل بھی بُرا ہوا - وہ بھی تو کیا کچھ نہ چاہتی تھیں —— مگر ابا میاں کے سمجھانے پر چپکی ہو رہیں زمانہ بدلا تو اب وہ کیا کریں —— کب تک بدلنے سے روکیں ؟

تو نرگس دلہن بن میاں کے گھر آئی —— ادھر نیا رنگ نئے ڈھنگ دیکھے - نئی روشنی کے دلدادہ نئی تہذیب میں پڑے چڑھے ہوئے لوگ ! اور ایسے میں نئی نویلی دلہن کا جی بار بار پنجرے میں بند فاختہ کی مانند پھڑ پھڑاتا —— میکے میں کیسا سخت پردہ تھا ! اماں جی کبھی آنگن تک اکیلے نہ جانے دیتی تھیں اور ادھر یہ حال کہ پہلی ہی رات کو سلیم میاں نے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا "تم کتنی حسین ہو ! میرے دوست تمہیں دیکھیں گے تو مارے رشک کے جلنے لگیں گے" !

اوئی اللہ تو کیا یہ اب دوستوں کے سامنے بے پردہ کرائیں گے —— وہ سہم گئی !

دبے دبے لہجے میں بتایا —— "اماں جی تو سخت پردہ کراتی ہیں —— غیر کے سامنے ہونے کا سنیں گی تو خفا ہونگی" !

سلیم نے ایک قہقہہ لگایا "اب اماں کا ڈر کیا ہے —— بھئی اب تو تمہیں ہمارا کہنا ماننا پڑے گا" !

جی میں کیسی کھد بد ہونے لگی ! ساری عمر پردہ کیا مگر ایسے کہ دل ہی دل میں سو سو گالیاں سناتے ہوئے —— اماں جی کی تو مت ماری گئی کہ سوائے پردے کے انھیں اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا —— ایک ابا میاں تھے جو کبھی کبھار انھیں ٹوک دیتے کہ جوان بیٹی کو ہر وقت ڈانٹنا ڈپٹنا اچھا نہیں —— پر اماں کاہے کو چپ ہونے لگیں —— منہ پھاڑ کر چیختیں "کیسی بات کرتے ہو جی —— یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ نگاہ نہ رکھو تو قدم ڈول جاتے ہیں" —— اور ابا میاں چپکے ہو رہتے —— !

ذرا سوچو تو اس پرندے کی کیا حالت ہو گی جسے تمام عمر پنجرے میں بند رکھا گیا ہو اور آزادی کی اسے خوشخبری ملی ہو —— نرگس اسی پرندے کی طرح دل میں چھپی ہوئی ہلچل کو سینے پہ ہاتھ رکھے روکنے کی کوشش کرتی سلیم کو دیکھتی رہی اور پھر بے اختیار اس کے بازو ناگ کی طرح لہرائے اور سلیم نے جلدی سے اپنی گردن آگے کر دی !

وہ کنوارپنے میں سوتے وقت سرہانہ اپنی باہوں میں لیکر بھینچ بھینچ لیا کرتی تھی اب جیسے سب کچھ بھول بھال گئی اور

جب سسرال سے کچھ دنوں کے لیے میکے جانا اور وہاں دو چار روز سلیم سے علیحدہ رہنا پڑا تو اُسے تکیئے کا پھر بار بار خیال آتا —— پر کہاں وہ بے جان روئی سے بھرا ہوا تھیلا اور کدھر وہ مضبوط سڈول بدن والا ہنستا بولتا چھیڑتا چھڑاتا سلیم —— اُسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے وہ کسی خوب صورت باغ میں چلتے چلتے ٹہلتے ٹہلتے اچانک کسی ریگستان میں آ گئی ہو اور مضبوط ہاتھوں کا لمس اُسے بے اختیار یاد آنے لگتا اور اُسے ایک جھرجھری سی آ جاتی ——!

اس روز وہ سلیم کی یاد میں کھوئی ہوئی آنگن میں نیم کے پیڑ تلے کھڑی تھی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ اماں جی نے بے ساختہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر کہا "اے بیٹی کچھ خیال تو کرو —— کسی غیر کی نگاہ پڑ گئی تو ——؟"

اس کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ دل میں آیا کہ ماں سے کہدے "وہ تو مجھ سے پردہ نہیں کراتے ——" مگر چپکی ہی رہی۔ اُسے یہ انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں اماں داماد سے لڑ نہ پڑیں اور جیسے وہ ابا میاں کو اپنی بات کا قائل کر لیا کرتی تھیں کہیں داماد کو بھی اپنی بات پہ رضامند نہ کرا لیں اور وہ بیچاری ابھی آزادی کا ایک ٹھنڈا سانس بھی نہ بھرنے پائے اور دوبارہ پردے کے پنجرے میں قید ہو بیٹھے ——!

چپ چاپ زیر لب مسکراتے ہوئے وہ کمرے میں چلی آئی —— اور اسی شام جب سلیم اُسے لینے آیا اور اماں جی نے چاہا کہ داماد سے کہہ سن کر ایک دو روز کے لیے اور اُسے ٹھہرا لیں تو نرگس نے منہ بناتے ہوئے ماں سے دبے دبے لہجے میں کہا "اوئی اماں آپ بھی کیا حد کرتی ہیں ادھر ان کی اماں جی اداس ہو گئی ہوں گی ——" اور پھر بڑے دلفریب انداز سے مسکراتے ہوئے ہولے سے بولی "ان کا تو بغیر میرے اک پل جی نہیں لگتا —— ایسی اچھی ساس خدا نے دی ہے کہ شکر ادا نہیں ہو سکتا!"

شادی کے دوسرے مہینے ہی سلیم کی ترقی ہو گئی اور اس سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہوئی کہ میجر سلیم کی تبدیلی لاہور ہو گئی اور وہ بیوی کو ساتھ لے آیا ——

سپنے ایک دم حقیقت کا روپ دھارنے لگے —— نیا گھر —— چھوٹا سا خوبصورت جدید طرز کا مکان، نئے فرنیچر سے آراستہ، نرم اور گدیلی خواب گاہ جس کے چاروں اور پردے لگے ہوئے، دروازوں پر ہلکے ہلکے پیازی رنگ کے پردے کھڑکیوں میں بھی ویسے ہی خوب صورت پردے، مسہری کے قریب چھوٹی سی میز اور میز پہ ٹیبل لیمپ، میز کے نیچے دو بک شیلف اور ان میں خوب صورت اور مضبوط جلد والی کتابیں جن میں سے دو ایک انگریزی کی بھی تھیں، اور وہ اکیلے میں میجر سلیم سے انگریزی پڑھنے کی کوشش کرنے لگی —— اور پھر لہنے میں بھی بلا تکلف اس زبان کے لفظ استعمال کرنے میں اُسے کوئی دقت نہ ہونے لگی ——

خواب گاہ کے ساتھ ایک غسلخانہ جدید فلش سسٹم سے آراستہ، اوپر سے ایسے نل لگے ہوئے کہ بٹن دباؤ، تو یوں پانی کے قطرے ٹپکنے لگیں جیسے بارش ہو رہی ہو —— رم جھم رم جھم ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگتی اور وہ نہاتے وقت آنکھیں موند موند لیتی۔ نرم جلد پر قطرے ٹپکتے تو جھرجھری سی آ جاتی اور اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں کھول کر خوشی اور مسرت سے چاروں طرف دیکھتی اور کھل کھلا کر ہنسنے لگتی —— اور ہنسنے کی اس آواز میں سکون اور خوشی کی ایسی دلفریب گنگناہٹ چھپی ہوتی کہ سلیم اپنے کمرے میں بیٹھے بٹھائے چونک اُٹھتا اور غسلخانے کے بند دروازے کے باہر آ کھڑا ہوتا —— کیا بات ہے ڈارلنگ ——؟" وہ پیار سے پوچھتا اور وہ اندر پانی کے قطروں کی زد میں کھڑی، بارش کا سا لطف لیتی ہوئی اپنی مترنم آواز میں جواب دیتی "کچھ نہیں ڈیئر —— یونہی یہ سوچ کر

ہنسی آگئی تھی کہ جب میں پہلی بار آپ کے ساتھ ڈانس کرنے جاؤں گی تو ہائے —— کیا ہوگا ؟

سلیم مسکراتا اور پھر واپس ہوتا ہوا پیار سے کہتا "ہوگا کیا —— تم ڈانس میں جب تک پرفیکٹ نہ ہو جاؤ گی میں تمہیں اپنے دوستوں سے نہ ملاؤں گا ——!"

نہانے کے بعد وہ ایک لمبا سا پیازی تولیہ اپنے ارد گرد لپیٹ کر ننگے پاؤں ہولے ہولے قالین پر رکھتے اپنی وارڈ روب کے پاس آنے لگی اور پھر الماری کے دونوں پٹ کھول کر وہ محویت کے سے عالم میں اپنے نئے ڈیزائن کے کپڑوں کو دیکھتی، ہونٹوں پر نزاکت سے انگلی رکھ کر خود سے کہتی "ہائے آج کون سے کپڑے پہنوں —— ؟"

سلیم ہاتھ میں کوئی کتاب لیے پیچھے آ کھڑا ہوتا اور وہ جان کر تولیے پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتی —— وہ اس کی پشت پر جھک کر اس کے ننگے شانوں پر ہلکے ہلکے بوسے ثبت کرتا اور پانی کے ننھے ننھے قطرے اس کے ہونٹوں کو نم کر دیتے اور وہ کسمسا کر کہتی۔

"ارے اب جاؤ بھی نا —— مجھے کپڑے پہننے ہیں"

وہ اس کی کمر کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے اسے مشورہ دیتا۔ "آج یہ نیلی ساڑھی اور بلاؤز پہن لو ——"

"ساڑھی ؟" وہ قدرے کانپ کر کہتی "مجھے ساڑھی ٹھیک طرح سے باندھنی نہیں آتی۔"

"تو سیکھ لو نا —— پہننے سے پتہ چلے گا ——"

اور مشق کرتے ہوئے اسے ساڑھی ایسے باندھنی آتی جیسے بچے کو ابا کا لفظ کہنا آجائے اور نیلے رنگ کے بلاؤز میں اس کا سڈول بدن مغالطے کی حد تک خوب صورت نظر آنے لگتا —— اور جسم کا نیم عریاں حصہ اپنی تمام تر جاذبیت اور کشش سے اسے بے حد پرکشش بنا دیتا، اور تب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ جاتی اور عمدہ سے عمدہ لپ سٹک، پوڈر، روج اور کریم کی شیشیوں کے ڈھکنے کھل جاتے۔

جب پہلی بار سلیم نے اسے اپنی بھنوؤں کے فالتو بال اکھیڑنے کو کہا تو وہ گھبرا گئی تھی اور کتنے ہی دن وہ ایسا کرنے سے کتراتی رہی تھی مگر اب وہ موچنا تو جیسے خود بخود اس کے ہاتھ میں آجاتا اور وہ غور سے آئینہ دیکھ کر اپنی بھنویں بناتی جہاں سے آنکھ شروع ہوتی وہ قوس کی شکل دیتی اور جدھر آنکھ کا کونا آتا وہ قوس کو قدرے کنپٹیوں کی طرف موڑ دیتی اور ایسا کرنے میں آئی برو پنسل اس کی بڑی مدد کرتی،

پھر وہ اٹھ کر خواب گاہ سے ملحقہ ڈرائنگ روم میں آتی، نرم صوفوں پر ایک انداز کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس دن کا سوچتی جب سلیم اپنے تمام دوستوں کو ایک پر تکلف دعوت دے گا اور بہت سے اجنبی مرد اور عورتیں ہلکے ہلکے ہنستے ہوئے، کھلکھلاتے ہوئے شاداب چہروں اور رنگ برنگے ملبوسات میں ڈھکے چھپے اسے پر شوق نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس کی تعریف کریں گے اور سلیم خوشی کے مارے پھولا نہ سمائے گا —— اور وہ خود بڑی متانت کے ساتھ رعونت اور تکبر کے ساتھ سب کے ساتھ ہاتھ ملائے گی، تعارف ہوگا، ان کی باتوں پر بس ذرا سی مسکراہٹ اور دو ایک لفظوں سے مسکرا کر آنکھوں میں شوخی اور چمک پیدا کرتے ہوئے جواب دے گی —— اور وہ سب لوگ اس کے حسن و اخلاق کے گرویدہ ہو جائیں گے

اور اس دن کا سوچتے سوچتے وہ بے اختیار ہو کر سلیم سے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے، تھوڑا سا منہ بگاڑ کر مصنوعی

خفگی سے پوچھتی "آخر آپ دعوت کب دیں گے؟"

سلیم کھلکھلا کر ہنستا، اس کی طرف پر شوق نظروں سے گھور کر مسکراتے ہوئے کہتا "بس عنقریب ہی میری جان ——! اب تم تو گفتگو میں اچھے اچھے لفظ بخوبی استعمال کر لیتی ہو اور ڈانس میں بھی تم ایکسپرٹ ہو گئی ہو!"

مگر یہ دعوت ہمیں التوا ہوتا ہی رہا —— اس سے بڑا صدمہ نرگس کے لیے کیا ہو سکتا تھا کہ اماں جی معمولی سی بیماری کی تاب نہ لا سکیں اور ابھی انہیں جنت سدھارے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ابا میاں نے بھی وہی راستہ اختیار کر لیا، نرگس کی دنیا اندھیر ہو گئی اور جب حواس باختہ وہ میجر سلیم کے ہمراہ لاہور واپس میکے سے ہو کر آئی تو خود کو بڑی تنہا تنہا محسوس کر رہی تھی!

سلیم نے بہت سی تسلیاں دیں تو اس کی طبیعت بہلی اور بہلی ہوئی طبیعت کے ساتھ اس نے اپنا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ اب وہ اپنی پچھلی زندگی سے بالکل ناطہ توڑ چکی تھی اور اب ایک نئی زندگی کی ابتدا تھی —— وہ خوف جو ماں باپ کی زندگی میں اسے خواہ مخواہ آزادی کی زندگی بسر کرتے ہوئے محسوس ہوتا تھا اب خواب کو بھی نہ رہا تھا —— اب وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کر سکتی تھی —— پہلے یونہی ڈر سا رہتا تھا کہ اگر اماں ابا کو خبر ہوئی کہ بیٹی نے پردہ اتار پارٹیوں میں رقص اور غیر لوگوں سے آنکھیں چار کیے باتیں کرنی شروع کر دی ہیں تو میکے میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی —— اور اب —— اب تو جانو بلی کے بھاگوں ......!

ابھی اسی سوچ میں تھی دعوت کس روز ہو کہ میجر سلیم اپنے ایک دوست کے ہمراہ آن پہنچے —— پہلا پہلا موقع تھا کہ کسی سے کھل کر سامنا ہوا —— وہ گھبرائی گھبرائی نظروں سے سلیم کو دیکھنے لگی اور اس نو وارد کو ٹھیک طرح سے دیکھ تک نہ سکی۔

"ان سے ملو ڈارلنگ —— یہ میرے گہرے دوست یوسف ہیں!" سلیم نے اس کی مخروطی لانبی انگلیوں والا ہاتھ پکڑ کر یوسف کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!" یوسف نے اپنی بھاری آواز میں کہا

"جی —— جی مجھے بھی ——" وہ اٹک اٹک کر رہ گئی، اس شخص کا ہاتھ کس قدر سخت اور کھردرا تھا ——!

"بائی گاڈ تم بڑے خوش قسمت ہو ——" یوسف نے بڑی بے تکلفی سے اپنا دوسرا ہاتھ سلیم کے کندھے پہ مارتے ہوئے کہا "تمہاری وائف بڑی بیوٹی فل ہے —— بھئی مبارک ہو"

سلیم نے خوشی سے نرگس کی طرف دیکھا اور کہا "ٹھیک کہتے ہو —— ابھی انہیں اپنے پیرنٹس PARENTS کی ڈیتھ کا صدمہ ہے۔ اس لیے قدرے چپ چاپ اور افسردہ ہیں۔ ورنہ تم انہیں پہلے دیکھتے تو خبر ہوتی کہ بیوٹی کسے کہتے ہیں؟"

وہ شرما کر اپنے دانتوں سے اپنا ناخن کاٹ بیٹھی،

"بھئی ہم تو اب بھی جان گئے کہ بیوٹی کیا ہوتی ہے" یوسف نے نرگس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہ کانپ گئی ۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ لیے یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے اس کے استقبال کو بچھے جا رہے ہیں، وہ مسکراہٹ ایک بھرپور دعوت کا سا انداز اپنائے ہوئے اس کے وجود کو گھائل کئے جا رہی تھی، نرگس کو اپنے ان عجیب احساسات پر بڑی کوفت ہوئی اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے وہ وہاں سے اٹھ کر خواب گاہ میں چلی آئی —— آتے ہی وہ اپنے پلنگ پر جا گری اور حیرت زدہ سی اپنے ان انجانے جذبات اور خیالات پر غور کرنے لگی —— اسے یوں محسوس نہ کرنا چاہیے تھا لیکن وہ ایسا کر کیوں رہی تھی —— ؟

وہ وہ نہ جانے کب تک وہاں بیٹھے رہے، اسے خبر نہ ہوئی، پر جب سلیم خواب گاہ میں داخل ہو کر پلنگ کے قریب آ کھڑا ہوا اور اپنی نکٹائی اتار کر بستر پر اس کے سامنے پھینکی تو چونک کر اس نے اپنی آنکھیں اٹھائیں ——

" کیا ہوا تھا ڈارلنگ ؟" وہ قمیض کے گلے کا اوپر والا بٹن کھولتے ہوئے بولا

" پتہ نہیں یونہی جی متلا سا گیا تھا —— "

" اچھا جی !" سلیم کی آنکھیں خوشی اور حیرت سے چمکیں " تو تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں —— کب سے، کیوں ؟"

" نہیں —— " اس نے سر ہلایا " ایسی کوئی بات نہیں ہے —— "

سلیم سنجیدہ ہو گیا " تو پھر کیا ہوا تھا —— ؟"

" پتہ نہیں " اس نے کہا " اب ٹھیک ہوں —— "

سلیم نے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے سر کے لانبے ریشمیں بالوں پر پیار سے اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے یوسف کا ذکر کیا، کہ وہ اس کا بہت گہرا دوست تھا، عرصہ سے نرگس کو دیکھنے کی خواہش کر رہا تھا اس لیے وہ اسے لے آیا تھا —— اور ہنستے ہوئے سلیم نے بڑے فخریہ انداز میں بیوی کو بتایا " وہ تمہیں دیکھ کر بڑا متاثر ہوا ہے —— تمہارے حسن کی بڑی تعریف کر رہا ہے !"

نرگس کے دل میں اطمینان کی ایک لہر دوڑی اور جھینپتے ہوئے بولی " اچھا آدمی ہے پر میں تو اسے ٹھیک طرح سے دیکھ ہی نہ سکی —— ہائے اتنی شرم آئی —— کہ الہٰی —— " اس نے کانوں پر ہاتھ دھر لیے ——

" ارے —— تو تم شرما گئیں ؟ بھئی یوں شرمانے لگیں تو پھر دعوت والے روز تم لوگوں سے کیسے ملو گی ؟"

وہ اٹھی، انگڑائی کے سے انداز میں اس نے اپنے دونوں بازو اٹھائے، ہلکے سے ایک لمبا سانس لیا اور آہستہ سے بولی " پہلی بار کسی اجنبی سے واسطہ پڑا تھا —— " پھر مسکرا کر بولی " لوگوں سے ملنے جلنے کی ہوتے ہوتے عادت ہو جائیگی "۔

" وہ میرا بڑا گہرا دوست ہے " سلیم بولا " اسے اجنبی مت سمجھنا !"

اور تیسرے دن شام کے وقت نرگس ہلکے جامنی رنگ کی ساڑھی پہنے برآمدے میں کھڑی مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی، اس کے سر پر بڑا سارا جوڑا تھا جس کے گرد موتیے کے پھول لپٹے ہوئے تھے، کلائیوں میں مہکتے ہوئے گجرے، آنکھوں میں کاجل ہونٹوں پر گہرے سرخ شیڈ کی لپ سٹک، گلے میں ہلکا سا سنہری چم چم چمکتا ہار اور پاؤں میں سنہری سینڈل تھے جن کی ایڑی زمین سے تین تین انچ اوپر اٹھی ہوئی تھی،

اس کے بلاؤز پر ستارے کا ہلکا ہلکا کام کیا ہوا تھا اور ساڑھی پر کہیں کہیں اکا دکا تارا بنا چمک رہا تھا اور سرخ

رخساروں پر بھی صحت مندی کے تانبے سے جھلملا رہے تھے۔

مہمانوں سے ہاتھ ملانے وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لا بٹھاتی اور پھر برآمدے میں جا کر کسی دوسرے آنے والے کی مزاج پُرسی کرتی اور ایسے میں وہی جانا پہچانا ہاتھ ——— وہی کھردرا اور مضبوط ہاتھ اس کے نازک ہاتھ میں آیا ——— "ہیلو مسز سلیم ——— کیا حال ہے ؟"

وہ اس کی بے تکلفی پر گھبرا گئی ——— "جی ——— جی" اٹک کر رہ گئی،

"آئیے آپ چل کر اندر بیٹھئے ——— اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "مہمان آ ہی جائیں گے لیکن اگر آپ یونہی استقبال کرتی رہیں تو تھک کر چور ہو جائیں گی ———"

وہ انکار نہ کر سکی، چپکی اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی،

وہاں ہر ایک اتنی بے تکلفی سے مل رہا تھا، باتیں کر رہا تھا کہ نرگس کو اپنے گھر ہی میں اجنبیت کا احساس ہونے لگا اور ان لوگوں میں یوسف کے قریب بیٹھے ہوئے وہ گھبراہٹ، اکتاہٹ اور بے قراری محسوس کرنے لگی، اس کا دل چاہا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے مگر بھاگ کر جائے تو کہاں ؟ اور انہی لوگوں میں اُسے اپنا شوہر اجنبا نہ محسوس ہُوا ——— وہ اجنبی اور حیرت بھری نظروں سے سلیم کو دیکھنے لگی جو عورتوں اور مردوں کے ساتھ کیسی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔

ہر طرف قہقہے بکھرے ہوئے تھے، تنفس کی تیزی، آنچلوں کی سرسراہٹ، نگاہوں میں تیرتے ہوئے ڈورے اور گلاسوں کے ٹکرانے کی آواز گھلی ملی ہوئی تھی، قدم لڑکھڑانے لگے اور جام فضا میں جھومنے لگے، اور پھر دعوت کا وہ دَور شروع ہُوا جس کے لیے وہ خود کو ابھی تک تیار نہ کر سکی تھی ——— وسکی کی بوتلوں کے کاگ اُڑنے لگے اور سوڈے کی بوتلوں کا اُبال گلاسوں میں انڈیلا جانے لگا ——— وہ گھبرا گھبرا کر سلیم کی طرف دیکھنے لگی

یوسف کے کہنے پر سلیم نے بیوی کی طرف ایک جام بڑھایا "لو ڈارلنگ !"

"جی نہیں ———" اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ———

"پی لو ڈیئر ———"

"ہاں ——— ہاں ——— مسز سلیم پی لیجئے نا ———" یوسف نے سلیم کی طرفداری کی ——— "صرف ایک جام ——— صرف ایک !"

جام اس کی آنکھوں کے آگے کانپنے لگا اور گھبرا کر اس نے سلیم کے ہاتھ سے گلاس تھاما اور ہونٹوں سے لگا لیا ———

کڑواہٹ اس کے گلے میں سے سرکتی ہوئی سینے میں آگ لگانے لگی ——— گرم گرم آگ اور تلخی نے اس کے سارے وجود کو جیسے اپنے شکنجے میں لے لیا اور پھر بہکی بہکی نظروں سے اس نے اپنے شوہر کو دیکھا ——— مہمانوں کو دیکھا اور یوسف کو دیکھا

سب لوگ مخمور آنکھوں سے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے ——— اور اُسے ان تمام کی حالت پر ہنسی آ گئی اور کھلکھلاتے ہوئے وہ قہقہے لگانے لگی،

مہمان چلے گئے ——— سب چلے گئے تو وہ نڈھال سی اپنے بستر پر لیٹی اور دل ہی دل میں توبہ توبہ کرتے ہوئے اس نے

سلیم سے خفگی کا اظہار کیا ——— "توبہ ہے ——— مجھے تو یہ سب لوگ بالکل پسند نہیں آئے ——— میں تو اب کسی دعوت میں شریک نہ ہوں گی!"

سلیم نے منہ پھیرا ——— "دیکھا جائے گا ——— اب سونے دو ——— ہاں پرسوں یوسف نے بال روم میں دعوت دی ہے ——— وہاں ضرور چلنا ہوگا!" اس نے کروٹ بدلی اور سو گیا۔

"دعوت ہے؟ ——— یوسف نے دی ہے؟" وہ بڑبڑانے لگی اور پھر خیالات کا ایک ہجوم اس کے ذہن میں آدھمکا۔ اور یہ خیالات ایسے تھے کہ وہ انھیں سوچ سوچ کر کانپنے لگی ——— وہ تھر تھر کانپنے لگی اور اس رات کئی بار وہ بھیانک سپنوں سے ڈر کر جاگی اور پھر بے قراری سے پہلو بدل بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی!

صبح سویرے اس نے اٹھتے ہی سلیم سے صاف صاف کہہ دیا "میں اب کسی دعوت میں شریک نہیں ہوں گی!"

وہ ہنسا "یوسف کی دعوت میں تمھیں جانا پڑے گا!"

اس کے حلق کی کڑواہٹ اور زیادہ ہو گئی ——— "نہیں ——— نہیں!" وہ جو ایسی دعوتوں کے خواب دیکھتی رہی تھی اب انھی سے خائف تھی!

"میری نہ مانو ——— مگر کیا یوسف کو بھی انکار کر دو گی؟"

اس نے کہنا چاہا ——— کیا وہ یوسف کو اپنے شوہر سے زیادہ اہمیت دیتی ہے ——— اگر شوہر کو انکار کیا جا سکتا ہے تو یوسف کیا چیز ہے ——— اس کی جوتی کو بھی یوسف کی پروا نہیں ——— تنک کر بولی "اونہہ! میں اُسے صاف منہ پر کہہ دوں گی ——— مجھے نہیں پسند تمھاری یہ دعوتیں!"

سلیم ہنسنے لگا۔ وہ منہ بسور کر غسلخانے میں چلی گئی اور نل کے نیچے بارش کے سے قطروں میں بھیگتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں!

دوسرے دن وہ دوپہر کے وقت سو کر اٹھی تو سلیم اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا، کہنے لگا ——— "یوسف آیا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے دعوت میں تمھیں ضرور جانا ہے!"

"نہیں ——— نہیں ———" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے ——— تم اس سے بات تو کرو ——— میں منہ دھو کر ابھی آیا" سلیم نے آہستہ سے ہنس کر کہا۔

نرگس بددلی سے اُٹھی، اس کا چہرہ سُست سا ہو گیا تھا اور دھیمے دھیمے قدم اُٹھاتی برآمدے کی طرف چلی گئی۔ برآمدے میں سے دیکھتے ہوئے اس نے پھاٹک کے قریب مالی کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں کھرپی لیے کھڑا تھا۔ نرگس نے اس کے کھردرے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے دانتوں سے اپنا نچلا لب دبایا اور پھر ڈرائنگ روم کی طرف دیکھا ——— وہ وہاں بیٹھا ہوا تھا! اُسے دیکھ کر نرگس نے کانپ کر ستون کا سہارا لیا ——— وہ دیوار پر لگی ہوئی نرگس کی ایک بڑی ساری تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا اور ایسے میں اُسے جیسے کچھ ہوش نہ تھا۔ نرگس نے اس کا چہرہ دیکھا، گندمی رنگ میں تھوڑا سا دودھ ملا دو تو اس کا رنگ بن جائے۔

اور سیاہ آنکھوں کی لمبی لمبی پلکیں ——— اتنی لمبی پلکیں کہ نرگس کو حیرت ہوئی کہ کیا ایک مرد کی بھی اتنی لمبی پلکیں ہو سکتی ہیں اور پلکیں بھی ایسی خمدار کہ دیکھ کر خواہ مخواہ جی چاہنے لگتا کہ کاش ایسی پلکیں اپنی ہو سکتیں ——— ! پھر ستواں ناک اور بھرے بھرے گداز لب ——— نرگس کو وہ لب انجانے میں اپنے لبوں پر مس ہوتے محسوس ہوئے اور پھر اس کے وہی ہونٹ پھیل پھیل گئے ——— اور اس نے خوف زدہ ہو کر نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

"مسٹر سلیم ———" اس کی جانی پہچانی آواز آئی اور نرگس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

وہ اُسے برآمدے میں کھڑا دیکھ کر اُٹھا اور دروازہ کھول کر اس کے پاس چلا آیا، اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے بڑی شوخی سے اس نے کہا "یہ سلیم کہہ رہا تھا کہ آپ میری دعوت پر نہیں آئیں گی ——— مگر میں نے سوچا کہ آپ نہ آئیں؟ یہ کیسے ممکن ہے ——— کیوں ہے نا یہ بات ناممکن؟ ——— تو چلئے جلدی سے تیار ہو جایئے ———"

نرگس نے بے بسی سے اُسے دیکھا، ہاتھ چھڑانا چاہا، کچھ کہنا چاہا مگر کچھ کہہ سکی نہ کہہ سکی، بس اس کے پیچھے بوجھل بوجھل قدم اُٹھاتی ڈرائنگ روم میں آگئی اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔

سلیم مُنہ دھو کر آیا ——— "کیوں بھئی مان گئی ہیں یا نہیں ———؟" ہنس کر اس نے پوچھا

"مانی کب نہیں تھیں ———" یوسف نے زندہ دلی سے کہا اور پھر اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔

اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور آہستہ آہستہ سانس لیتے ہوئے خود کو قابو میں کرتے ہوئے اس نے کہا "دراصل میری طبیعت ٹھیک نہیں!"

یوسف نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور سلیم کو کہنے لگا ——— "معلوم ہوتا ہے کہ آپ دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا ہے!"

وہ جھینپ گئی "ارے نہیں ——— ایسی کوئی بات نہیں!" پھر تھکے تھکے انداز سے وہ اُٹھی اور دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے بولی "میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں!"

اور جاتے جاتے نرگس کے کانوں میں سلیم کی آواز آئی ——— "سچ کہتا ہوں یوسف یہ ڈانس میں بڑی پرفیکٹ ہے!"

جب وہ بال روم میں سلیم کے بازوؤں کا سہارا لیے داخل ہوئی تو یوسف کی آنکھوں کی چمک اس کے وجود میں تیزی سے سرایت کرتی جا رہی تھی اور بھی تو لوگ تھے ——— سب اس کے حسین چہرے سڈول جسم اور خوبصورت جدید ڈیزائن کے بلاؤز اور ساڑھی کو گھور رہے تھے مگر ——— نرگس کو ان تمام لوگوں کی بے باک نظروں سے اتنی کوفت نہ ہوئی تھی جتنی اس کی ایک نظر دیکھنے کے انداز سے اور اُسے محسوس ہوا جیسے تمام لوگوں کی موجودگی میں بھی وہ تنہا ہے ——— بالکل اکیلی ہے اور اگر کوئی ہے تو وہ یوسف کی نظریں ہیں جو اس کے جسم کے رونگٹے رونگٹے کو کانٹوں کی طرح چبھ رہی ہیں ——— نرگس کو اپنا بدن ایک جلتا ہوا پھوڑا محسوس ہوا جسے ہوا بھی چھوئے تو دکھ کے مارے چیخیں نکل جائیں اور یہ تکلیف اور دُکھن ایسی کہ ہر لمحہ بڑھتی چلی جا رہی تھی!

یوسف ٹھنڈی اور تازہ بیئر کی ایک بوتل اس کے سامنے لے آیا ——— اس نے خوفزدہ نظروں سے سلیم کی طرف دیکھا ——— اس کی مسکراتی ہوئی نظریں اُسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں "پی لو ڈارلنگ ——— پی لو ——— پی لو!"

اُس نے گھٹے گھٹے لہجے میں سلیم کے قریب ہو کر کہا "میں نہیں پیوں گی ———"

"یہ ایٹیکیٹ کے خلاف ہے ڈارلنگ۔" سلیم نے آہستہ سے کہا۔

نرگس نے نفرت سے سلیم کو دیکھا، پھر وہ پلٹی اور یوسف کے کھردرے ہاتھوں کو چھو کر اس نے بیئر کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا لیا ——— ! بیئر کی بوتل پی چکی تو اسے ایک ایسی مسرت محسوس ہوئی جو پہلے کبھی ملی ہی نہ تھی، ہر طرف آس پاس کی ہر چیز نے جیسے خوبصورتی خوشی اور مدہوشی کا چولا پہن لیا ——— یوسف کے سگرٹ کا دھواں مرغولوں کی صورت میں بڑا خوشنما اور بھلا نظر آنے لگا، اس کا جی چاہا کہ وہ جو اب اسی طرح ہلکی پھلکی ہو گئی ہے کیوں نہ اب دھوئیں کی طرح ہوا میں اُٹھے اور فضا میں تحلیل ہو جائے!

پھر یکلخت ماحول کے سمندر میں نغمے کی ایک لہر اُٹھی۔ مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے بازوؤں کا سہارا لیے ہنستے کھلکھلاتے اُٹھے اور پھر سنگیت کے مدہوش سروں میں کھوئے ہوئے ہواؤں میں گویا تیرنے لگے۔ یوسف نے بڑھ کر اُسے رقص کی دعوت دی، وہ اپنے مخصوص دلفریب انداز میں مسکرائی۔ اُٹھی اُس کی طرف ایک قدم بڑھی، ٹھٹکی اور پلٹ کر اس نے سلیم کی طرف دیکھا ——— مگر سلیم وہاں نہیں تھا وہ تو پہلے ہی کسی حسینہ کی دعوت منظور کر چکا تھا ——

نرگس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی ——— ایسی چمک جس میں خوف، غصہ، پیار اور خوشی و مدہوشی گھلی ملی ہوئی تھی اور یوسف کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سمٹ کر اس نے یوسف کے مضبوط شانے سے اپنا سر ٹکا دیا۔

وہ مدہوش ہو گئی، اُسے کچھ پتہ نہ چلا کہ ساز کتنی دیر تک بجتا رہا ——— وہ تو جیسے پل بھر میں بند ہو گیا ——— اور وہ اس کے چوڑے چکلے سینے کی حدت میں ڈوبی ہوئی ——— ابھی تو اس عجیب جذبے کے سمندر میں پوری طرح ڈوبی اور اُبھری بھی نہ تھی!

ساز تھم گیا ——— وہ اپنے ریشمیں رومال سے اپنے نچلے لب کا کونا صاف کرتی ہوئی یوسف کا سہارا لیے ہوئے تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ بیٹھی۔

"آپ تو بہت اچھا ڈانس کرتی ہیں۔" وہ مدہوش لہجے میں اس پر جھک کر بولا۔

اس نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ وہ کتنا خوب صورت اور کتنا وجیہہ مرد ہے ——— اُسے دل میں ساز بجانے والوں پر غصہ آیا کہ انھوں نے اتنی جلد ساز کیوں بند کر دیا ——— اور ابھی انہی خیالات میں تھی کہ اس کی نظر سلیم پر جا کر ٹھہر گئی، جو ایک خوب صورت عورت کا نرم و نازک ہاتھ چوم رہا تھا ——— اور وہ عورت ——— اور بہت سے ترن و مرد ہنس ہنس کر تالیاں بجا رہے تھے!

دفعتہً ساز ایک چیخ کی طرح بج اُٹھا اور اُس نے اُچھل کر یوسف کی بانہوں کا سہارا لے لیا جیسے اگر وہ ایسا نہ کرتی تو سب کے سامنے چیخیں مار مار کر رونے لگ جاتی!

اور پھر اس کے مضبوط سینے کے ساتھ لگ کر اُسے لمحہ بھر کے بعد سکون ——— کھویا ہوا سکون پھر سے مل گیا۔ یوسف کا چہرہ اس کے بالوں کو چھو رہا تھا اور پھر وہ چہرہ سرکتے سرکتے اس کے بالوں سے کان کی لو تک آیا پھر اس کی کنپٹیوں سے اس کا گرم گرم سانس چھونے لگا اور اس کے ہونٹ اُسے اپنی گردن پر مس ہوتے محسوس ہوئے اور یوسف کی بھاری آواز ———

جذبات سے معمور آواز ایک سرگوشی میں ڈھل گئی "میں تمہیں چاہتا ہوں ڈارلنگ" بے اختیار نرگس نے اپنا سر اس کے سینے پہ ٹکا دیا!

صبح سویرے وہ مارے تھکن کے نہ اٹھی اور جب جاگی تو سلیم ناشتہ کر رہا تھا، اسے جاگتا دیکھ اس نے وہیں سے ہانک لگائی "ڈارلنگ آج تو بڑی گہری نیند سوئیں؟ بھئی اب اٹھو —— میں تو جا رہا ہوں دیر ہو رہی ہے ——"

اس نے پہلو بدل لیا اور آنکھیں موندلیں، مگر کوئی جواب نہ دیا۔

چھری کانٹے کے پلیٹ سے ٹکرانے کی آواز اس کے کانوں میں آتی رہی اور وہ منہ پرے کئے، بند آنکھوں کے ساتھ یہ سوچتی رہی کہ رات جو کچھ دیکھا کیا وہ خواب تھا کہ حقیقت اور پھر توبہ کا ورد دل ہی دل میں کرتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لیے —— اِس زندگی کا تصوّر کتنا دلکش ہے لیکن حقیقتاً یہ کتنے تلخ لمحات سے اٹی ہوئی زندگی ہے! اسے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا۔

سلیم ناشتہ سے فارغ ہو کر اس کے سامنے آیا "اب اٹھو نا ڈارلنگ!" پھر آہستہ سے ہنس کر کہا "کل کتنا لطف آیا! یہ یوسف بھی کتنا اچھا ہے —— کیسی ونڈرفل پارٹی دی تھی!"

اپنی ڈھوری آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے شوہر کو دیکھا —— "سنئیے سلیم —— میں —— میں ——" وہ ہکلائی۔

"کہو —— کہو ——" وہ پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے بولا

"مجھے نفرت ہے —— سلیم! مجھے یوسف سے نفرت ہے ——"

"نفرت؟" اس نے حیرت سے پوچھا "کیوں —— پاگل ہوئی ہو —— وہ بہت اچھا ہے —— میرا بڑا اچھا دوست ہے!"

وہ چیخی "میں سمجھتی ہوں اگر میں اُسے یونہی دیکھتی رہی —— ملتی رہی —— تو ضرور کوئی بات ایسی ہو جائے گی جو ہم دونوں ہم سب کے لیے نقصان دہ ہو گی"

"پاگل ہو تم تو ——" وہ بے پروائی سے بولا اور ماچس کی ایک تیلی جلا کر تمباکو سلگانے لگا۔

"نہیں سلیم!" اس نے چاہا کہ شوہر کو کہہ دے —— کل یوسف نے اس کے کانوں میں کیا کہا تھا —— وہ سرگوشی —— وہی سرگوشی جواب اُسے بے حد اذیت پہنچا رہی تھی —— یہ وہی سرگوشی تھی جسے سُنتے ہی وہ بے خود ہو گئی تھی ——

سلیم ہنسا —— "بھئی میں سمجھتا ہوں بعض عورتیں یونہی ......"

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو ——" وہ بھڑک کر بولی "تو سنو —— کل وہ ڈانس کے دوران مجھے کہنے لگا کہ میں تمہیں بہت ......"

"بھئی وہ تو مجھے بھی کہتا تھا کہ وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے ——" سلیم نے بات کاٹی "اور اس میں حرج کی بات ہی کیا ہے؟"

"نہیں وہ مجھ سے محبت کرتا ہے" اس نے روہانسی ہو کر کہا

"تو کیا بُرائی ہے ڈارلنگ —— میں نے خود کل مدہوشی کے عالم میں مسز عزیز سے اظہارِ محبت کر دیا تھا ——"

وہ ہنسا ——— مگر یہ کوئی اتنی سیریس SERIOUS بات تو ہے نہیں کہ رونے لگو ——— اور ڈارلنگ وہ بھی شادی شدہ ہے اور میں بھی شادی شدہ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" شادی شدہ ہے ———" وہ چونکی

" ہاں ——— اور وہ اپنی ماں سے ملنے گئی ہوئی ہیں ——— اس کی وائیف ——— ہوسکتا ہے اس نے تمھیں غلطی سے اس لمحے ستارہ سمجھ لیا ہو ——— میں نے بھی تو مسز عزیز کو اپنی نرگس سمجھ لیا تھا ———" وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا ۔

اُس نے اذیت سے آنکھیں بند کرلیں اور کروٹ بدل لی ۔

پھر وہ جب آیا تو بڑی بے باکی سے اس کے سامنے ہنستے ہوئے تنہائی میں نرگس نے پوچھا " آپ کی وائیف کب آئیں گی ؟"

" آجائیں گی جب دل چاہے گا " اس نے بے پروائی سے کہا ۔

نرگس نے سوچا یہ کیسا عجیب مرد ہے کہ بیوی کی ذرا بھی پروا نہیں ——— پھر اس نے سوچا کہ یہ اب پوچھے گا کہ سلیم کہاں گیا ہے ——— لیکن نہیں ——— اس نے سلیم کے متعلق کچھ نہ پوچھا ۔ وہ خود ہی بولی " سلیم کہیں باہر ملنے گئے ہیں "

" اچھا " وہ بولا " میں تو آپ کو ملنے آیا ہوں "

وہ کانپ گئی ——— " جی ———"

یوسف نے ایک قہقہہ لگایا ——— " آپ بہت اچھی لگتی ہیں مجھے ——— دراصل آپ بہت بیوٹی فل ہیں ——— اور ہاں بھئی دیکھئے اگر میں باتیں کرتے کرتے تم تم کہنے لگوں تو برا مت ماننا ———"

اس نے موضوع بدلنے کو کہا " پتہ نہیں وہ کب آئیں گے ؟"

یوسف نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا " آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ———"

اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا " ہاں بالکل ———"

یوسف کھڑا ہو گیا ——— دیوار پر لگی ہوئی اس کی تصویر کے قریب جاکر اُسے غور سے دیکھنے لگا ——— پھر مڑ کر اُسے دیکھا اور اس کے قریب آکر وہ جھکا اور اس کے کان میں سرگوشی سی کہ گیا " تم اس تصویر سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو !"

نرگس کی آنکھوں کے سامنے بال روم کا وہ منظر گھوم گیا جب یوسف نے اُسے کہا تھا کہ وہ اسے چاہتا ہے اور گھبرا کر اس نے جھکے ہوئے یوسف کے چہرے کی طرف دیکھا اور کانپ کر پلکیں جھپکالیں ———

اس کی یہ ادا جیسے یوسف کے دل میں تیر کی طرح اُتر گئی ——— مضبوط ہاتھ ایک دم بڑھے اور نرگس کو کندھوں پر سے نہایت آرام سے تھامتے ہوئے اس نے اسے اُٹھایا اور پھر مسکراتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولا " میں تمھیں چاہتا ہوں !"

نرگس کا دل چاہا اُسے تھپڑ مار دے مگر اس کے دونوں ہاتھ شل ہو کر رہ گئے اور سر جھکا کر وہ سسکیاں بھرنے لگی ۔

یوسف نے اس کے کندھے پر سے ہاتھ اُٹھا لیے اور یوں بولا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو ——— " ارے ہاں میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں ——— میری وائیف جب آئے گی تو سب سے پہلے آپ کو اس سے ملاؤں گا !"

جب سلیم گھر آیا تو نرگس لیٹی ہوئی تھی اور اُسے بڑے غصے سے بولی " وہ آیا تھا ——— آپ کا لاڈلا دوست !"

"کون؟ یوسف؟"

"ہاں —— اور کان کھول کر سن لیجئے —— میں اُسے بالکل پسند نہیں کرتی اور آپ اُسے منع کر دیجئے —— وہ یہاں مت ......"

گمری میں باہر سے آتے ہی یہ جھگڑا ہوتا دیکھ کر سلیم کو غصہ آ گیا۔ زور سے بولا "اور تم بھی سن لو —— تمھیں میرا حکم ماننا ہوگا —— یوسف میرا دوست ہے اور تمھیں اس کی عزت کرنی ہوگی ——"

وہ کمرے میں سے باہر چلا گیا ——!

دو تین روز گذر گئے اور وہ ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہے، وہ اسے بلاتی نہ وہ اسے بلاتا، اور یونہی ایک دوسرے سے خفا خفا وہ ایک ہی گھر میں منہ لبسورے پڑے رہتے اور اس روز وہ جب بڑی اداس تنہائی سے بیزار ڈرائنگ روم میں بیٹھی بڑی دیوار پر لگی ہوئی اپنی تصویر کو دیکھ رہی تھی —— یوسف آیا ——!

"میں بتانے آیا تھا کہ کل میری وائف آپ کو ڈھونڈ رہی ہے" وہ بیٹھتے ہی بولا

"ارے —— آپ نے تو بتایا ہی نہیں وہ آئیں کب؟" اس نے حیرت سے پوچھا، اس شخص کو وہاں دیکھ کر اسے اطمینان سا کیوں محسوس ہونے لگا تھا ——؟

"وہ کل ہی آ جائیں گی —— وہ ہنسا۔

اُسے ہنسی تو نہ آئی البتہ مسکراہٹ آپ ہی آپ ہونٹوں پر بکھرتی چلی گئی "سلیم کسی سے ملنے گئے ہیں" اس نے مسکراہٹ روکنے کے لیے جلدی سے کہا۔

"تو انھیں بتا دیجئے گا —— وہ اُٹھ کر بولا "مجھے بھی ایک جگہ جانا ہے اس لیے اجازت چاہتا ہوں ——"

اس کا دل چاہا —— اسے روکے مگر خاموش رہی! اور جب سلیم گھر آیا تو اس نے اسے خود ہی بلانے میں پہل کی اور دعوت کا یہ کہہ کر ذکر کیا کہ وہ وہاں ضرور چلیں گے!

ستارہ سے وہ ملی، اچھی خاصی خوب صورت سی عورت تھی اور وہ دونوں بہت جلد ایک دوسری کی بڑی گہری دوست بن گئیں، نرگس نے ستارہ سے کہا "یوسف صاحب نے تو مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ ہیں"

"بڑے بے پروا سے ہیں —— ستارہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا اور پھر ہولے سے بڑے فخر سے بولی "مجھے بے انتہا چاہتے ہیں!"

"اچھا؟"

"ہاں —— اس نے کہا "دیکھو تو مجھے کس بری طرح مارا تھا جب ..." وہ ہنس کر چپ ہو گئی۔

"مارا تھا؟" اس نے حیرت سے پوچھا "مارا تھا؟"

"ہاں —— مرد ہوتے ہی بڑے شکی ہیں —— یونہی ذرا سی بات پر مارنے لگتے ہیں اور پھر سچ پوچھو تو جو محبت کرتا ہے وہ ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتا —— مارنا پیٹنا ہی تو مرد کی محبت کی نشانی ہے —— وہ بڑے فخر سے بولی

"اب دیکھو نا بات اتنی ہوئی کہ ایک پارٹی میں ان کے ایک دوست سے میں نے ہم رقص بننے کو خود جو کہا تو انھیں بُرا لگا، پہلے تو وہیں پارٹی میں مجھے گھور گھور کر دیکھتے رہے ——— مگر مجھے بھی انھیں چھیڑنے میں بڑا مزا ملا سو میں رقص میں لگی رہی ——— مگر گھر آتے ہی انھوں نے مجھے دھنک کر رکھ دیا ——— اور میں روٹھ کر اماں کے پاس چلی گئی ——— آخر کب تک رہتی ——— انھوں نے بُلا ہی لیا نا ———"

اور نرگس گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی ——— گھر آئی تو بھی اس سوچ نے پیچھا نہ چھوڑا ——— اور اس رات وہ بار بار سسکیاں لیتی رہی

اور سلیم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بات کیا ہوئی تھی!

پھر یوسف آیا تو وہ اُسے چھُپ چھُپ کر دوسرے کمرے میں سے دیکھتی رہی ——— اس کے سامنے نہ آئی ——— سلیم نے آ کر کہا "وہ بُلا رہا ہے" تو بولی "کہہ دو میری طبیعت ٹھیک نہیں" مگر وہ تو یہ سنتے ہی خواب گاہ میں آ گیا اور وہ جلدی سے لحاف لے کر بیٹھ گئی۔

پھر جب وہ چلا گیا تو اس نے بُرا سا مُنہ بنا کر خاوند سے کہا "یہاں کیوں لے آئے ———"

"پھر کیا ہُوا؟" اس نے بے پروائی سے کہا تو اسے رونا آ گیا۔

"پتہ ہے یہ بڑا شکی ہے ——— بیوی کو مارتا بھی ہے!"

"تو تمھارا مطلب ہے میں بھی شکی بن جاؤں؟" سلیم کی وہی ہنسی اور بے پروائی جس سے اُسے چڑ سی ہونے لگی تھی!

"ہائے اللہ" اس نے لحاف پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور دل ہی دل میں اتنے سارے خیالات امڈے چلے آئے کہ پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ سلیم کو دیکھنے لگی جو بے پروائی سے پائپ مُنہ میں ڈالے مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا!

"پاگل" وہ بولا

"ہاں ———" اس نے سر ہلایا ——— "ہم میں سے کوئی ایک ضرور پاگل ہے!"

اور یوسف کہ کہاں وہ اُسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی اب اتنا بے تکلف ہوا کہ وہ سوئی ہوئی ہوتی اور وہ آ کر اُسے گدگدی کرتے ہوئے جگا دیتا اور قریب کھڑا ہوا سلیم اُسے مسکراتا ہوا دیکھتا رہتا ——— وہ مُنہ بسور کر سلیم کی طرف دیکھتی اور پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگتیں تو جلدی سے غسل خانے میں چلی جاتی اور نل کھول کر وہ ہولے ہولے روتے ہوئے اِدھر گیرہ بارش کے سے گرتے ہوئے قطروں کو دیکھتی اور یہ سوچتی کہ یہ نل بھی میرے حال پر آنسو بہا رہا ہے ———

پھر وقت گزرنے لگا دھیمے دھیمے ہولے ہولے اور وہ دونوں پر جاتی، بیئر کی بوتلیں خالی کر دیتی، رقص کرتی، نیم عریاں لباس میں سے اپنے جسم کا نیم عریاں حصہ زیادہ نمایاں کرتی، لوگوں کی پُر شوق نظروں کے سامنے اور زیادہ کھل کر ہنستی اور چہکتی ——— اور یونہی وقت کئی دیوانوں کئی پاگلوں کو جنم دیتا ہوا گزرنے لگا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یوسف کا سامنا ہوتے ہوئے وہ گھبراتی اور رقص کے دوران اس کی ہم رقص بنتے ہوئے جس حد تک ممکن ہوتا گریز کرتی اور ادھر گریز اور کھنچاوٹ تھی اور ادھر اتنا ہی شوق اور جنون بڑھتا جا رہا تھا ——— وہ

اُسے دیکھتا تو نظروں میں محبت پیار اور عشق کے تمام تر جذبے بیدار ہو جاتے اور وہ اس دعوت کا احساس کرتے ہی ڈر جاتی ——

اور اس شام وہ نہا کر اپنے اردگرد تولیہ لپیٹے قالین پر دھیرے دھیرے ننگے پیر رکھتی وارڈ روب تک آئی اور دونوں پٹ کھول کر اپنے کپڑوں کو دیکھ کر سوچنے لگی کہ کون سے کپڑے پہنے تو وہ اس کی پشت پر آ کھڑا ہوا، جھک کر اس کے ننگے شانوں پر ہلکے ہلکے بوسے ثبت کرنے لگا تو اس نے حیرت سے سوچا۔ سلیم تو کسی سے ملنے گیا تھا۔ اتنی جلدی کیسے آ گیا —— اور پھر پیار بھرے لہجے میں بولی "سلیم تم آ گئے!" اور پلٹ کر دیکھا ——

اُسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں —— اور گھبرا کر وہ پیچھے ہٹنے لگی،

یوسف نے اپنے دونوں بازو جو کہنیوں تک ننگے تھے آگے بڑھا دیئے —— اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور سیاہ لمبے لمبے بال قمیص میں سے جھانک کر اُسے دیکھ رہے تھے —— نرگس کو محسوس ہوا کہ یوسف کے سینے پر لا تعداد باریک باریک زہریلے سانپ کنڈلی مارے بیٹھے اُسے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اور یہ ناگ ابھی اپنی کنڈلی توڑ کر اُٹھیں گے اور اسے ڈس لیں گے

وہ چیخنے لگی مگر یوسف نے اس کے منہ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھ دیا —— اس نے اُسے کاٹنا چاہا مگر یوں محسوس ہوا جیسے اس نے انگیٹھی سے بھرا ہوا کوئلہ منہ میں ڈال کر کھا لی ہو —— یوسف نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا، نرگس نے اپنے ہاتھوں کے مکّے بنا کر اس کے سینے پر زور زور سے مارنے شروع کر دیئے مگر بازو شل ہو کر نیچے لٹک گئے اور پھر سسکیوں ہچکیوں کے شور میں نرگس کی باہیں ناگ کی طرح لہرا کر فضا میں اُٹھیں اور پھر وارفتگی کے جذبے کے ساتھ یوسف کے گلے میں حمائل ہو کر رہ گئیں۔

سلیم جب آیا تو نرگس خواب گاہ میں نہ تھی —— اس نے ادھر اُدھر دیکھا تو غسل خانے کا دروازہ بند پایا اور اندر سے گھٹی گھٹی سسکیاں اور ہچکیوں کی آوازیں سنائی دیں —— اس نے ہولے سے دروازے پر ہاتھ مارا "کیا بات ہے ڈارلنگ؟" سسکیاں مدھم ہو گئیں —— اور جب دروازہ کھلا تو نرگس آہستہ آہستہ سسکیاں لیتی ہوئی اندر سے نکلی، اس کے گیلے بال اس کے بھیگے شانوں پر بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے اور آنکھیں قدرے سُرخ ہو رہی تھیں۔

"کیا ہوا ڈارلنگ" سلیم کے پوچھنے پر اس نے قہر آلود نظروں سے اُسے دیکھا اور پھر زور سے سسکیاں لیتے ہوئے بولی "کچھ نہیں!"

اس شام انھیں ایک جگہ جانا تھا مگر وہ دونوں کہیں نہ گئے —— سلیم کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ یکدم نرگس میں ایک بہت بڑی تبدیلی کیسے آ گئی —— وہ بڑے روکھے انداز میں اس سے بات کرتی —— ہولے ہولے آہیں بھرتی اور رونے لگتی ——

اس رات سلیم نے اُسے اپنی گود میں آنے کو کہا تو روتے ہوئے وہ اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی اور سلیم نے دیوانوں کی طرح اس کے ہونٹوں کو چومنا شروع کر دیا،

نرگس کے ذہن میں ایک دم یوسف کے ہونٹ اُبھرے —— اُس کے وہ بھرے بھرے گداز لب! اور وہ لب پھر یکدم پھیل پھیل گئے اور اُس نے خوفزدہ ہو کر سلیم کے ہونٹوں پر زور سے اپنا ہاتھ دے مارا —— سلیم نے حیرت سے اُسے دیکھا —— وہ

بُری طرح رو رہی تھی، سلیم نے اُسے دوبارہ اپنی آغوش میں لے لیا اور نرگس کے ہاتھ اس کے سینے پر اُن ناگوں کو ڈھونڈنے لگے جنھوں نے اسے ڈس لیا تھا اور پھر بے تاب اور بے کل ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سانس روک لیا۔

وہ رات اُس نے بڑی بے چینی سے کاٹی، مگر وہ کاٹے نہ کٹتی ——— رات کے دو بج گئے، اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر کے وقت دیکھا اور پھر سلیم کی طرف جو نیند کی گہری وادیوں میں ڈوب چکا تھا، اس کے بازو کھلے ہوئے تھے اور نرگس کو بے اختیار رونا آ گیا ———

وہی آغوش جو کبھی نرگس کے لیے راحت اور سکون کا سرچشمہ تھی، جو ایک سرو تھی جس کی چھاؤں میں بیٹھے بٹھائے وہ مدہوشی کے عالم میں ڈوب جاتی اور کانوں میں بہتے ہوئے چشمے کی مدھم سی آواز اُسے لوریاں سُنانے لگتی، اب ایک دیولنے سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اب تو اس پُرسکون چمن میں کسی آتش فشاں کا مُنہ پھٹ گیا تھا اور ہر طرف جھُلسے ہوئے گوشت کی سی بساند اور پیپ کی بدبو اس کے نتھنوں کے راستے دماغ میں سڑ سڑ سرکتی جا رہی تھی ——— اُسے ابکائی آ گئی اور اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے وہ اُٹھی، جلتا ہوا بدن اور شعلے کی طرح سُرخ سُرخ آنکھیں لیے وہاں سے برآمدے میں چلی گئی۔

رات اندھیری تھی اور اس اندھیری رات میں وہ تنہا برآمدے میں کھڑی تاریکی میں گھور رہی تھی، اُسے وہ اندھیرا جو اس کے دل کی دُنیا پر مسلّط تھا کہیں زیادہ بھیانک محسوس ہو رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر سلیم پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ کیسا مرد تھا کہ ذرا بھی شک نہ کرتا تھا اُس کی باتوں کو ہنسی میں اُڑا دینے والا احمق مرد ——— وہ شخص اگر اس کی بات مان لیتا تو پھر اس کی یہ حالت نہ ہوتی ——— وہ خود کو یوں لٹی لُٹی اور عصمت باختہ عورت تصوّر نہ کرتی ——— مگر اب تو زندگی بھی جیسے بدل گئی تھی ———

اس لمحے اس کے ذہن میں یوسف کا سراپا گھومنے لگا ——— دُودھ ملا گندمی رنگ، لمبی خمدار پلکوں والی سیاہ آنکھیں، ستواں ناک اور وہ لب جو بے حد گدازتھے اور جن کا خیال آتے ہی اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پھیل پھیل گئے ہوں اور پھر وہ ان دو بڑے بڑے ہونٹوں کی قید میں یوں جکڑی جاتی کہ اس کے بدن کے ہر انگ پر ان کی تپش اور حدّت محسوس ہونے لگتی!

اور پھر دل ہی دل میں سلیم کو کوستی ہوئی وہ واپس خواب گاہ میں آئی اور علیحدہ پلنگ پر گرتے ہوئے اس نے تکیے میں مُنہ چھپا لیا!

دوسرے روز یوسف آیا تو سلیم کے کہنے پر بھی وہ ڈرائنگ روم میں نہ آئی اور سختی سے بولی کہ اس کا جی خراب ہو رہا تھا، پھر وہ جلدی سے لحاف لے کر آنکھیں بند کئے لیٹ گئی، اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ آ نہ جائے ——— مگر خلافِ توقع یوسف خواب گاہ میں نہ آیا تو وہ اُٹھی اور دبے پاؤں دروازے کے پیچھے جا کر لگی ڈرائنگ روم میں جھانکنے ———

یوسف بڑی بے تکلفی کے ساتھ سلیم کے ساتھ صوفے پر بیٹھا تھا، اس کا دایاں ہاتھ سلیم کی ران پر دھرا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے بالوں کو سنوار رہا تھا، اس حالت میں وہ سلیم کو مذاق کر رہا تھا "یار معلوم ہوتا ہے تو نے رات ضرور کوئی گڑبڑ کی ہے ———"

اس نے غصے میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹ کاٹ لیا۔

سلیم بڑی انکساری کے سے انداز میں ہولے ہولے ہنس کر کہہ رہا تھا "چھوڑو ــــ یار کیسا مذاق کرتے ہو!"
آنسو نرگس کی آنکھوں میں خود ہی امڈے چلے آئے ــــ اور اس لمحے اُسے یہ احساس شدت سے ہوا کہ وہ سلیم سے سخت نفرت کرتی تھی!

اور اس روز یوسف ایسے وقت آیا جب سلیم گھر پر موجود نہ تھا، وہ بڑی بے پروائی سے اُس کا استقبال کرنے اُٹھی اور ڈرائنگ روم کی بجائے وہ دونوں خواب گاہ میں چلے آئے ــــ وہاں اس کے ہونٹوں کو دیکھتے ہوئے اسے یہ خیال آیا کہ اگر سلیم کے ہونٹ بھی اس کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے پھیل پھیل جاتے تو؟ اور یوسف نے جب ہاتھ بڑھایا تو اس نے کوئی مزاحمت نہ کی، لمحہ بھر کے لیے اُسے دیکھا اور پھر ہولے سے کہا "سنو یوسف ــــ تمہیں میرا خیال نہیں ــــ تو اپنے دوست سلیم کا تو خیال کرو ــــ"

یوسف اپنی مخصوص ہنسی میں بولا "میں تمہیں سلیم سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں ــــ!"
"کیا تم مجھے چاہتے ہو؟" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اضطراب بھرے لہجے میں پوچھا۔
اپنی آغوش کو اس سے بھرتے ہوئے وہ بولا "اس سے زیادہ کیا یقین دلاؤں ــــ"
وہ تڑپ کر علیحدہ ہو گئی ــــ "کیا تم ــــ کیا تم مجھ سے شادی کر لو گے؟"
اس نے کوئی جواب نہ دیا ــــ وہ خاموش رہی اور وہ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔
پھر دن گزرنے لگے، یوسف سلیم کی عدم موجودگی میں آتا اور وہ اُسے خواب گاہ میں خود ہی لے آتی۔ اس کے بالوں بھرے سینے پر سر رکھے آنسو بہاتی اور بے چینی سے اظہارِ محبت کرتی اور پھر یونہی روتے روتے کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔
پھر وہ جیسے بدلنے لگی، سلیم کی موجودگی میں بھی وہ یوسف کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے ملتی، سلیم کو رقص کے دوران خود سے علیحدہ کر کے یوسف کی مضبوط باہوں میں خود کو محبوس کر لیتی اور سلیم کو کئی بار طنز بھرے لہجے میں یوسف کی تعریف کرتے ہوئے کہتی "میں کہتی ہوں آپ میں یوسف کی سی کوئی بات ہی نہیں ہے ــــ دیکھئے تو وہ کیسا اچھا رقص کرتا ہے، کس طرح ملتا ہے، کتنے اچھے مذاق کرتا ہے اور پھر وہ لطیفے جو وہ سناتا ہے ــــ کس قدر دلچسپ ہوتے ہیں؟"
اس کی ان حرکتوں سے سب سے پہلے ستارہ ناراض ہوئی، وہ دعوت کے دوران اپنے خاوند کو اس کے ساتھ دیکھتی تو گھور گھور کر سلیم کو دیکھنے لگتی اور گھور گھور کر دیکھنے کا یہ سلسلہ دبی دبی شکایتوں میں ڈھل گیا!
ایک رات وہ دعوت سے واپس آئے تو سلیم کھویا کھویا سا تھا اور صبح جب وہ دیر سے اُٹھی تو اس نے دیکھا کہ سلیم بڑی دیر سے ناشتہ کرنے کے بعد تیار بیٹھا ہوا بجائے اپنے دفتر جانے کے اس کے اُٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔
نرگس نے ایک انگڑائی لی اور اُسے دیکھ کر اپنے تصور میں یوسف کو دیکھنے لگی ــــ وہ یوں اس کا انتظار کر رہا ہو تو کیسا لگے گا؟
سلیم اُٹھ کے اس کے قریب آیا اور دبی ہوئی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پہ لاتا ہوا دھیمے سے بولا "کیا تم چاہتی کہ میں شک کروں؟" ــــ

"شک؟" اس نے اُسے گھور کر دیکھا "کیسا شک؟"

"تم چاہتی ہو ——— ہاں میں جانتا ہوں کہ تم یہی چاہتی ہو ———"

"کیا؟" وہ تیزی سے بولی۔

"یہی کہ میں تم پہ شک کروں ——— یہی شک کہ تم یوسف کے ساتھ ———" وہ رُک گیا۔

"اونہہ!" اس نے غصّے سے کہا، پھر اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹتے ہوئے اس نے غرور سے کہا "تم مجھ پر کیا شک کرو گے؟ شک تو وہ کرے جو محبت بھی کرتا ہو ——— تمھیں مجھ سے کوئی محبت نہیں ———"

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے، پھر غصّے سے پوچھا "کیا مجھے تم سے محبت نہیں؟"

"محبت؟" وہ زور سے چیخی "کیا یہ محبت ہے؟ تم تو صرف اپنا فرض پورا کرتے ہو ——— تم جانتے ہو کہ میں تمھاری بیوی ہوں اور جو فرض تم پہ عائد ہوتا ہے اُسے تم پورا کرنے کی کوشش کرتے ہو ——— صرف کوشش!"

سلیم نے ہاتھ اُٹھایا جیسے وہ اس کے مُنہ پہ ایک زور کا تھپڑ مارنے لگا ہو مگر اُٹھا ہوا ہاتھ یوں جھکا جیسے منوں بوجھ اس پہ کسی نے لاد ڈالا ہو ——— وہ صرف اتنا کہہ سکا "جی چاہتا ہے تمھارے منہ پہ زور سے ایک تھپڑ لگا دوں" اور دانت پیسنے لگا۔

وہ چلائی ——— "تم مجھے تھپڑ نہیں مار سکتے ——— تم میں اتنی ہمت کہاں" ——— پھر زہر آلود ہنسی کے ساتھ بولی "تم یوسف نہیں بن سکتے!"

سلیم نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا "میں ——— میں یوسف سے تمھارا میل جول بالکل بند کر دوں گا ——— سنو ——— میرا حکم ہے کہ تم اس سے نہیں مل سکتیں ——— اور اب میں دیکھوں گا وہ میرے گھر میں کس طرح آئے ......"

وہ حلق پھاڑ کر چلائی "وہ یہاں آئے گا، میں اس سے ملوں گی ——— تم کون ہوتے ہو حکم دینے والے!"

غصّے سے سلیم تھر تھر کانپ گیا اور پھر ہکلاتے ہوئے بولا "نرگس ——— نرگس ——— میرے گھر سے نکل جاؤ ———"

وہ بستر پہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی، دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر بولی "احمق! کیا تم یہ نہیں جانتے کہ میں یوسف سے محبت کرتی ہوں ——— اور وہ مجھے چاہتا ہے ——— دیوانوں کی طرح ———" وہ رُک گئی اس نے دیکھا سلیم کے ہونٹ کانپ رہے تھے اُسے وہ ہونٹ پھیلتے محسوس ہوئے اور پھر وہ اس کی قبر بن گئے ———

"نرگس" وہ ایکدم پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں! ہاں! اور میں تو خود تمھارے گھر میں رہنا نہیں چاہتی!" وہ پلنگ سے اُتر کر نیچے اس کے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو گئی ——— "میں یوسف کے ساتھ رہوں گی ——— مجھے اس سے محبت ہے اور تم سے مجھے نفرت ہے نفرت!"

"کیا تم سمجھتی ہو ——— میں تمھیں یوں طلاق دے دوں گا ———؟" وہ بولا "اور وہ تم سے شادی کرے گا؟"

"شادی؟" وہ لمحہ بھر کے لیے رُکی ——— "کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ مجھ سے شادی نہ کرے ———؟ پھر زیر لب وہ جیسے خود سے بولی "وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گا ——— میں جانتی ہوں ——— مگر وہ مجھے ٹھکرائے گا بھی نہیں اور ——— اب

فرق بھی کیا پڑتا ہے ——"

سلیم کھڑا ہو گیا "تم چلی جاؤ —— میرے سامنے سے چلی جاؤ ——"

"ارے میں تو تمہارا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں" —— اس نے زہر خند ہنسی کے ساتھ کہا۔ پھر اُسے وہیں کھڑا چھوڑ وہ ڈرائنگ روم میں آئی، لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بار بار جھپکتے ہوئے اس نے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پی لیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ برآمدے تک پہنچی، برآمدے میں کھڑے ہو کر اس نے ڈرائنگ روم کی طرف دیکھا —— ذہن میں ایک دم بہت سے دریچے کھل گئے اور ماضی کے بہت سے واقعات تصویریں بن کر اس کے سامنے ناچنے لگے —— اس نے دیکھا وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس کی دیوار پر لگی ہوئی بڑی ساری تصویر کو غور سے دیکھ رہا ہے پھر اس کی نظریں اس مجسمے کو تصویر کی صورت ناچتے دیکھنے لگیں جب وہ ڈرائنگ روم میں اس کے قریب بیٹھی تھی —— وہ تصویر دیکھنے کے بعد مڑ کر اُسے دیکھنے لگا اور اس کے قریب ہو کر وہ جھکا، کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کہا "تم اس تصویر سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو ——!"

پھر مضبوط ہاتھ ایکدم بڑھے اور نرگس کو کندھوں پر سے نہایت آرام سے اس نے اٹھایا اور مسکراتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولا "میں تمہیں چاہتا ہوں!"

نرگس نے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف دیکھتے ہوئے وہ مسکرا دی، پھر پلٹی اور سامنے پھاٹک کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے قدم تیزی کے ساتھ بڑھا لیے۔ دفعتاً اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی کی سیاہی پر کوئی گندمی رنگ میں دودھیائی رنگ ملا کر سیاہی کو پھیلانے کی کوشش کر رہا ہو ——!

---

۲ نایاب تحفے
NECTOL
NATURAL BLACK
HAIR COLOURING
SOLUTION
GUARANTEED
نیکٹول رجسٹرڈ
تیل نما خضاب
۱
ایک منٹ میں سفید بالوں کو
قدرتی سیاہ اور چمکدار بناتا ہے!
MOOR BRAND
BLACK HAIR
LOTION
مور مارکہ
تیل نما، خضاب لوشن رجسٹرڈ
جو فوری طور پر لگاتے ہی بالوں کو قدرتی جیسا
سیاہ چمکدار کرتا ہے
ہر جنرل مرچنٹ سے خریدیں!
تیار کردہ: ایچ ڈی کاسمیٹک کیمیکل لیبارٹری لمیٹڈ پوسٹ بکس ۶۹۲ لاہور
سول ڈسٹری بیوٹرز میسرز پاک لینڈ ٹریڈرز ۱۰-بی، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

اردو کے کلاسیکی ادب کو گھر گھر پہنچانے کے لیے
مجلس ترقی ادب ، لاہور کا

نیا اقدام

پاکستان میں اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر مجلس ترقی ادب لاہور قدیم اردو اساتذہ کے نثری اور منظوم شاہکار جدید اصولوں کے مطابق مرتب کرا کے شایان شان نفاست کے ساتھ شائع کر رہی ہے اور اب تک اس سلسلے کی پندرہ کتابیں چھاپ چکی ہے ۔ ان کتابوں میں متن کی صحت ، علامات وقف اور پیرا گراف بنانے کا خاص خیال رکھا گیا ہے ، نیز کتاب کی ادبی اہمیت ، مصنف کے حالات زندگی اور طرز نگارش پر جامع مقدمے لکھوا کر شامل کتاب کئے گئے ہیں ۔ تمام کتابیں دیدہ زیب ٹائپ میں چھاپی گئی ہیں ۔ قیمتیں انتہائی کم رکھی گئی ہیں ، تا کہ ہر شخص آسانی سے خرید سکے ، نیز

کلاسیکی ادب لائبریری کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی رکنیت کی کوئی فیس نہیں ۔ ہر وہ شخص جو مجلس کی مطبوعہ ہر کلاسیکی کتاب خریدنے کا اقرار کرے ، اس سلسلے کا رکن بن سکتا ہے ۔ ارکان کو کلاسیکی مطبوعات مزید ۲۰ فیصد کمیشن پر ملیں گی اور ڈاک خرچ بھی مجلس کے ذمے ہوگا ۔

اس سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابیں چھپ چکی ہیں ۔

۱ ۔ مسافران لندن ، (سرسید کا سفر نامۂ لندن)
مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۳/۰۰
۲ ۔ 'قصص ہند' ، از شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد ۲/۰۰
۳ ۔ 'ابن الوقت' ، از شمس العلماء ڈاکٹر حافظ نذیر احمد دہلوی ۳/۵۰
۴ ۔ 'وکرم اروسی' ، از مہاکوی کالی داس'
ترجمہ محمد عزیز مرزا لکھنوی ، مرتبہ عشرت رحمانی ۱/۷۵

FACE POWDER
LOVELY
GULFAM'S

فراق کے خطوط، مدیر نقوش کے نام